

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا
خواتین ڈائجسٹ
مئی 2024

خواتین ڈائجسٹ

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

واٹس ایپ 03172266944

آپ سے کیا پردہ

خاتون کی ڈائری

مجھ سے ملئے

سروے

بانی —— محمود ریاض
مدیر اعلیٰ —— آذر ریاض
مدیرہ —— نادرہ خاتون
نائب مدیرہ —— رضیہ جمیل
مدیرہ خصوصی —— امت الصبور
بلقیس بھٹی
لطیفیات —— علینان
قانونی مشیر —— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

انٹرویو

ناول

مکمل ناول



خط و کتابت کا پتہ
خواتین ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی

مئی 2024
جلد 52 شمارہ 01
قیمت 150 روپے

افسانے

نظمیں غزلیں

میری بیاض سے

پکوان

نفسیات

رنگا رنگ پھول

بیوٹی بکس

کہی سنی

خواتین ڈائجسٹ مئی کا شمارہ لیے حاضر ہیں
مئی کا مہینہ آیا ہے تو یادوں کے کئی در وا ہو گئے ہیں
یہی مہینہ تھا جب محمود ریاض صاحب دنیا کو الوداع کہہ کر اس جہان فانی سے رخصت ہوئے تھے۔

وہ دن یاد آتے ہیں جو ان کے ساتھ گزرے، ان کی محبتیں، ان کی شفقتیں، ان کی باتیں یاد آتی ہیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا تھا۔ ہلکی پھلکی شگفتہ باتیں کرتے، اب احساس ہوتا ہے کہ ان باتوں کے پیچھے کتنی حکمت چھپی ہوتی تھی۔ وہ ان کی زندگی کے کتنے تجربات کا نچوڑ تھیں۔

والدین سے بڑھ کر اولاد کو کوئی نہیں چاہ سکتا۔ یہ والدین ہی ہوتے ہیں جو اپنی اولاد کی کامیابی کو اپنی کامیابی سمجھتے ہیں، اولاد کی ذرا ذرا سی پریشانی انہیں بے چین کر دیتی ہے۔ آج جب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں تو احساس ہوتا ہے۔

محمود ریاض صاحب نے بڑی بھرپور زندگی گزاری۔ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور برتا، کامیابیاں بھی پائیں اور جاں گسل صدموں سے بھی گزرے۔

لیکن انہوں نے بڑے ظرف اور حوصلے کے ساتھ ایک باوقار زندگی گزاری، سخت نامساعد حالات میں بھی ہمت نہیں ہاری۔ پبلشنگ سے کاروبار کا آغاز کیا۔ بہت اچھی کتابیں شائع کیں۔ خواتین ڈائجسٹ کا اجرا کیا جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہنوں کا پہلا پرچا تھا۔ اس کے بعد ادارے سے کرن اور شعاع بھی اسی سلسلے کی کڑی تھے۔

اللہ تعالیٰ محمود ریاض صاحب کی مغفرت فرمائے۔ جانے والے چلے جاتے ہیں۔ اور اپنے پیچھے اپنی یادیں اور محبتیں چھوڑ جاتے ہیں۔ دنیا آباد رہتی ہے لیکن جانے والوں کی یادیں ایک درد اور کسک بن کر دل میں رہتی ہیں۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

عید نمبر......عید سروے

جون کے مہینے میں عید الاضحیٰ ہے۔ اس لیے جون کا شمارہ عید نمبر ہوگا۔ اس میں قارئین کی شمولیت کے لیے حسب روایات سروے بھی شامل ہوگا۔

سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1۔ قربانی کے گوشت کی وہ کون سی خاص ڈش ہے جو آپ بڑے اہتمام سے بناتی ہیں اور اس کو بنانے کے لیے پورا سال انتظار کرتی ہیں۔ اس ڈش کی ترکیب بھی لکھیں۔

2۔ گھر میں افراد زیادہ ہوں تو سب کی پسند مختلف ہوتی ہے۔ کوئی بریانی کی فرمائش کرتا ہے، کسی کو تکے کباب کھانا ہوتے ہیں تو کوئی کڑاہی گوشت کھانا چاہتا ہے۔ آپ اس صورت حال کو کیسے سنبھالتی ہیں۔

3۔ عید الاضحیٰ کا دن مصروف ترین دن ہوتا ہے۔ کیا آپ گوشت صاف کرنے اور گوشت تقسیم کرنے کے کام میں حصہ لیتی ہیں۔ اس سب کے ساتھ ساتھ پکانا بھی ہوتا ہے۔ آپ عید والے دن کون سی ڈش بناتی ہیں؟

ان سوالات کے جواب اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 25 مئی تک موصول ہو جائیں آپ اپنے جواب، واٹس ایپ نمبر 0317-2266944 پر واٹس ایپ بھی کر سکتی ہیں۔ اور بذریعہ ای میل بھی بھجوا سکتی ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

وصیت سے متعلق احکام ومسائل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ:

حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''ایک آدمی نے کہا۔ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو نہیں بخشے گا۔''

تو اللہ عزوجل نے فرمایا:

''کون ہے جو مجھ پر اس بات کی قسم کھاتا ہے کہ میں فلاں شخص کو نہیں بخشوں گا۔ بے شک میں نے اس کو بخش دیا اور تیرے عمل میں نے برباد کر دیے۔''

(مسلم)

فوائد ومسائل: بعض لوگوں کو اپنی عبادت اور زہد وتقویٰ پر گھمنڈ ہو جاتا ہے۔ جو انہیں دوسروں کی بابت بدگمانی میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ بڑے یقین سے اس بات کا اظہار کر دیتے ہیں کہ فلاں شخص کو تو اللہ نے بھی معاف نہیں کرنا، حالانکہ یہ اللہ کی شان میں بے ادبی کا مظاہرہ اور اپنی بابت حد سے زیادہ خوش گمانی کا نتیجہ ہے۔ یہ رویہ اللہ کو پسند نہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو اس عابد وزاہد ومتقی کے سارے عمل برباد کر کے اسے جہنم میں پھینک دے اور اس گناہ گار کو معاف کر کے جنت میں بھیج دے جس کی بابت یہ قسم کھا کر کہتا تھا کہ اسے اللہ معاف نہیں کرے گا۔ اس لیے انسان کو اپنی عبادت پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے اور دوسروں کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔

مسلمان کی تکلیف پر خوشی کا اظہار کرنے کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''مومن تو بھائی بھائی ہیں۔''

الحجرات۔ 10

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''بے شک وہ لوگ جو اہل ایمان کے اندر بے حیائی کے پھیلانے کو پسند کرتے ہیں، ان کے لیے دنیا وآخرت میں درد ناک عذاب ہے۔''

(سورۃ النور۔ 19)

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اپنے (مسلمان) بھائی کی تکلیف پر خوشی کا اظہار نہ کرو(کہیں ایسا نہ ہو) کہ اللہ تعالیٰ اس پر تو رحم فرمادے اور تمہیں آزمائش میں ڈال دے۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

شرعی طور پر ثابت نسب میں طعن کرنا حرام ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بغیر قصور کے تکلیف دیتے ہیں۔ یقیناً انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔" (سورۃ الاحزاب-58)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دو چیزیں لوگوں میں ایسی ہیں جو ان کے کفر کا باعث ہیں: نسب میں طعن کرنا اور فوت شدہ پر بین کرنا۔"

(مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ یہ دونوں گناہ ایسے ہیں کہ اگر انسان انہیں حلال سمجھ کر ان کا ارتکاب کرے گا تو وہ کافر ہو جائے گا، تاہم بشری کمزوری کی وجہ سے ان کا صدور سخت کبیرہ گناہ ہے۔

2۔ نسب میں طعنہ زنی کا مطلب ہے کہ کسی شخص کو اس کی تحقیر و توہین کی نیت سے کہا جائے کہ تیرا باپ تو فلاں کام کرتا ہے، تیری ماں تو ایسی ویسی ہے، یا تو جولاہا، لوہار، دھوبی اور موچی وغیرہ ہے۔ پیشوں کی وجہ سے بھی کسی خاندان یا شخص کو حقیر سمجھنا طعن فی النسب ہی کی ایک صورت ہے۔

3۔ نوحہ و ماتم (بین کرنے) کا مطلب مردے کے اوصاف بیان کر کے رونا پیٹنا اور زور زور سے چیخنا اور واویلا کرنا ہے۔

جعل سازی اور دھوکا دہی کی ممانعت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اور وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بغیر قصور تکلیف دیتے ہیں، انہوں نے یقیناً بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔"

(سورۃ الاحزاب-58)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے۔ وہ ہم (مسلمانوں) میں سے نہیں۔ اور جو ہمیں دھوکا و فریب دے، وہ ہم میں سے نہیں۔" (مسلم)

اور مسلم کی ایک اور روایت میں ہے: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلے کے ایک ڈھیر پر سے گزر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اپنا ہاتھ داخل کیا تو آپ کی انگلیوں نے تری محسوس کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا:

"اے غلے والے! یہ کیا ہے؟" اس نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسول! اسے بارش پہنچی ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تو تو نے اس (بھیگے ہوئے حصے) کو غلے کے اوپر کیوں نہ کر دیا تاکہ لوگ اسے دیکھ لیں۔ (یاد رکھ) جس نے ہم سے دھوکا کیا، وہ ہم میں سے نہیں۔)"

فوائد و مسائل:

1۔ ہتھیار اٹھانے سے مراد مسلمانوں کی جماعت کے خلاف خروج و بغاوت کرنا، یا بغیر کسی وجہ کے کسی مسلمان پر تلوار، بندوق، موزر اور کلاشنکوف وغیرہ اٹھانا اور اسے مار دینا ہے، جیسے آج کل بد قسمتی سے یہ دہشت گردی عام ہے۔

2۔ جعل سازی اور دھوکا دہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک معنوی ہے، جیسے باطن پر حق کا غلاف چڑھا دینا اور دوسری مادی اور ظاہری ہیں، جیسے

سودے میں کوئی عیب ہو تو اسے ظاہر نہ کرنا، اچھے مال میں ردی اور گھٹیا مال کی آمیزش کر دینا۔ سودے میں کسی اور چیز کی ملاوٹ کر دینا تا کہ اس کا وزن زیادہ ہو جائے، اس طرح کی متعدد صورتیں۔

3۔ ہم میں سے نہیں کا مطلب ہے، مسلمانوں کے طریقے پر نہیں۔ اس کا یہ کردار مومنانہ نہیں، غیر مومنانہ ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کو ہر قسم کی دھوکا دہی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خریداری کی نیت کے بغیر بولی میں اضافہ مت کرو۔'' (بخاری و مسلم)

فائدہ:

انسان کی نیت خریدنے کی نہ ہو، پھر بھی قیمت بڑھا کر بولی لگائے تو ظاہر بات ہے کہ اس سے دوسرا خریدار دھوکا کھا جائے گا اور اسے اصل قیمت سے کہیں زیادہ قیمت پر وہ چیز خریدنی پڑے گی۔ گویا یہ بھی دھوکا دہی کی ایک صورت ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دھوکا دینے کی نیت سے قیمت بڑھانے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ:

اس میں بھی نرخ پر نرخ بڑھانے سے منع فرمایا گیا ہے، جب کہ مقصد خریدنا نہ ہو، بلکہ صرف دوسرے کو دھوکے میں مبتلا کرنا ہو۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ ہی سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا کہ وہ خرید و فروخت میں دھوکا کھا جاتا ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس سے تو سودا کرے تو یہ کہہ دیا کر کہ دھوکا نہیں ہونا چاہیے۔'' (بخاری و مسلم)

فائدہ:

مذکورہ الفاظ کہنے سے مقصد ثبوت خیار کا تحقق ہے، یعنی اگر سودے میں کوئی دھوکا اور فریب ہوا تو خریدار کو سودا واپس کرنے کا حق ہوگا۔ بیچنے والوں کو بھی اس حق کا احترام کرنا پڑے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص کسی کی بیوی یا اس کے غلام کو دھوکا دے تو وہ ہم میں سے نہیں۔'' (ابوداؤد)

فائدہ:

کسی کی بیوی یا غلام کو ورغلا کر خاوند اور مالک کے خلاف کر دینا اور ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر کے انہیں ایک دوسرے سے متنفر کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ مومن کی شان تو اصلاح بین الناس ہے نہ کہ فساد بین الناس (لوگوں کے درمیان فساد ڈالنا)

بدعہدی کے حرام ہونے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو۔''

(سورۃ المائدہ-1)

نیز فرمایا: ''عہد کو پورا کرو، اس لیے کہ عہد کی بابت پوچھا جائے گا۔'' (الاسراء-34)

فائدہ آیات:

ایک عہد تو وہ ہے، جو انسان آپس میں کرتے ہیں۔ اور ایک عہد وہ ہے جو اللہ نے انسانوں سے لیا ہے کہ وہ اس کی توحید و ربوبیت کا اقرار کریں اور اس کے احکام و ہدایات کے مطابق زندگی گزاریں۔ ان دونوں قسم کے عہدوں کی پاسداری ضروری ہے اور ان میں کوتاہی پر قیامت والے دن باز پرس ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''چار خصلتیں ہیں، جن میں وہ ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی

یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے: جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب کوئی عہد کرے تو بے وفائی کرے اور جب کسی سے جھگڑے تو بدزبانی کرے۔"
(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:
1۔ یہ منافقانہ خصلتیں ہیں، ایک مومن کو ان تمام خصلتوں سے پاک ہونا چاہیے۔
2۔ اخلاق فاضلہ کا ایمان سے گہرا تعلق ہے، جہاں ایمان ہوگا، وہاں حسن اخلاق کی بھی جلوہ گری ہو گی اور جہاں ایمان نہیں ہوگا، اخلاق کا بھی فقدان ہوگا۔

حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت والے دن ہر عہد توڑنے والے کے لیے ایک جھنڈا ہوگا، کہا جائے گا کہ یہ فلاں کی بدعہدی (کا نشان) ہے۔"
(بخاری و مسلم)

فائدہ:
غدر سے مراد عہد توڑ دینا اور اس کی پروانہ کرنا ہے، قیامت والے دن تمام لوگوں کے سامنے ایسے عہد شکن کو ایک جھنڈا دیا جائے گا جو اس کی بدعہدی کا ایک نشان ہوگا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
ہر عہد شکن کے لیے قیامت والے دن، اس کی سرین کے پاس ایک جھنڈا ہوگا۔ اسے اس کی بدعہدی کے تناسب سے بلند کیا جائے گا۔ سنو! عام لوگوں کے امیر و حاکم کے عہد کو توڑنے والے سے بڑا عہد شکن کوئی نہیں۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:
1۔ عامۃ المسلمین کے امیر سے مراد حاکم وقت (خلیفہ، بادشاہ اور حکمران) یا اس کا نائب ہے۔ اس کے عہد کو توڑنے سے مراد اس کے عہد اطاعت اور بیعت کا توڑنا اور اس کے خلاف خروج و بغاوت ہے۔ اسلام نے حکمرانوں پر تنقید کرنے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کی اصلاح کرنے کی تو تاکید کی ہے اور اس کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے، لیکن ان کے فسق و فجور یا ان کے ظلم کی وجہ سے ان کے عہد اطاعت کو توڑ دینے اور ان کے خلاف خروج بغاوت کی اجازت نہیں دی کیونکہ اس طرح ملک میں فساد اور بدامنی پیدا ہوتی ہے، جس سے حالات مزید خراب ہی ہوتے ہیں، اصلاح پذیر نہیں ہوتے۔

تاریخ میں خروج و بغاوت کے جتنے بھی واقعات ہیں ان میں سے کسی سے بھی امت مسلمہ یا اسلام کو فائدہ نہیں ہوا بلکہ نقصان ہی ہوا ہے۔ اسی طرح آج کل کی جمہوریت میں بھی، جس میں حکومت وقت کے خلاف مظاہرے جمہوریت کا ایک حصہ بلکہ اس کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ایک بے ثمر عمل ہے۔ جس سے نہ حکمرانوں کی اصلاح ہوتی ہے۔ نہ ملک و قوم کو کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ البتہ توڑ پھوڑ سے لوگوں کی املاک اور قومی املاک کو نقصان پہنچتا ہے اور بعض دفعہ انسانی جانوں کا ضیاع بھی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ سیاسی مظاہرے بھی شرعاً محل نظر ہیں۔

اس حدیث میں حکمرانوں کے خلاف اس قسم کے اقدامات پر سخت وعید بیان کی گئی ہے، اس لیے ہمیں حکومت وقت اور حکمرانوں کی اصلاح کے لیے کوئی اور مناسب طریق کار وضع اور اختیار کرنا چاہیے جس میں محض تنقید برائے تنقید نہ ہو بلکہ صحیح معنوں میں خیر خواہی اور ملک و قوم کے مفادات کا جذبہ کارفرما ہو۔
2۔ عربوں میں رواج تھا کہ وہ بدعہدی کرنے والوں کے لیے بازار میں جھنڈے گاڑ دیا کرتے تھے تاکہ وہ بدنام اور ذلیل ہوں۔ اسی رواج کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان کی اخروی سزا کا تذکرہ فرمایا، تاکہ اس جرم اور اس کی سزا کی نوعیت لوگ سمجھ سکیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تین آدمی ہیں جن

سے قیامت والے دن میں خود جھگڑوں گا۔ ایک وہ آدمی جس نے میرے نام سے عہد کیا، پھر اسے توڑ دیا، دوسرا وہ آدمی جس نے کسی آدمی کو بیچ کر اس کی قیمت کھالی اور تیسرا وہ آدمی جس نے اجرت پر ایک مزدور حاصل کیا، چنانچہ اس سے اپنا کام تو پورا لیا لیکن اسے اس کی اجرت نہیں دی۔" (بخاری)

فائدہ:

اس میں عہدوں کو پورا کرنے، آزاد شخص کو فروخت نہ کرنے اور مزدور کو اس کی مزدوری دینے کی ترغیب ہے۔

عطیہ وغیرہ دینے کے بعد احسان جتلانے کی ممانعت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے ایمان والو! احسان جتا کر اور تکلیف دے کر اپنے صدقے ضائع مت کرو۔" (سورۃ البقرہ۔ ۲۶۴)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وہ لوگ جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتے ہیں اور نہ تکلیف پہنچاتے ہیں۔ (ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، ان پر نہ تو کچھ خوف ہے اور نہ وہ اداس ہوں گے۔" (سورۃ البقرہ۔ ۲۶۲)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تین آدمیوں سے قیامت والے دن اللہ تعالیٰ نہ کلام کرے گا نہ (رحمت کی نظر سے) انہیں دیکھے گا اور نہ پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔"

راوی بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات تین مرتبہ ارشاد فرمائے۔ حضرت ابوذر نے عرض کیا۔

"وہ نامراد ہوئے اور گھاٹے میں رہے اے اللہ کے رسول! یہ کون لوگ ہیں؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے والا، احسان کر کے احسان جتلانے والا اور اپنا سامان جھوٹی قسم کے ذریعے سے بیچنے والا۔" (مسلم)

اور مسلم کی ایک اور روایت میں ہے: "اپنی ازار کو نیچے لٹکانے والا۔" یعنی اپنی شلوار، پاجامے اور کپڑے کو تکبر کی وجہ سے ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والا۔

فوائد و مسائل:

1۔ اس سے واضح ہے کہ شلوار، پاجامہ، پتلون اور تہ بند وغیرہ ٹخنوں سے نیچے لٹکانا حرام ہے۔ یہ حکم مردوں کے لیے ہے۔ عورتوں کے لیے اس کے برعکس ہے۔

2۔ مثل مشہور ہے۔ "نیکی کر دریا میں ڈال" یعنی کسی پر احسان کرکے پھر اسے ہرگز نہیں جتلانا چاہیے کیونکہ اس سے نہ صرف وہ نیکی برباد ہوتی ہے بلکہ انسان عذاب شدید کا بھی مستحق ٹھہرتا ہے۔ اس لیے کسی پر احسان کرنے سے زیادہ مشکل اس نیکی کی حفاظت کرنا ہے۔

3۔ جھوٹی قسم کھانا مطلقاً حرام ہے لیکن سودا بیچنے کے لیے گاہک کو دھوکا دینے کی نیت سے جھوٹی سے جھوٹی قسم کھانا تو اور زیادہ بڑا جرم ہے کہ اس میں دو جرم اکٹھے ہوجاتے ہیں۔ جھوٹی قسم اور دھوکا دہی۔

قربانیوں کا گوشت رکھ چھوڑنا

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کا گوشت سنبھال رکھنے سے لوگوں کے فقر و فاقہ کی وجہ سے منع فرمایا تھا، پھر اجازت دے دی۔ (بخاری)

حضرت نبیشہ (بن عبداللہ ہذلی) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں نے تم کو قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ رکھنے سے منع کیا تھا۔ اب کھاؤ اور ذخیرہ کرو۔"
(ابوداؤد)

☆☆

سب مایا ہے

انشا جی



سب مایا ہے، سب ڈھلتی پھرتی چھایا ہے
اس عشق میں ہم نے جو کھویا جو پایا ہے
جو تم نے کہا ہے، فیض نے جو فرمایا ہے
سب مایا ہے

ہاں گاہے گاہے دید کی دولت ہاتھ آئی
یا ایک وہ لذت نام ہے جس کا رسوائی
بس اس کے سوا تو جو بھی ثواب کمایا ہے
سب مایا ہے

اک نام تو باقی رہتا ہے، گر جان نہیں
جب دیکھ لیا اس سودے میں نقصان نہیں
تب شمع پہ دینے جان پتنگا آیا ہے
سب مایا ہے

معلوم ہمیں سب قیس میاں کا قصہ بھی
سب ایک سے ہیں، یہ رانجھا بھی، یہ انشا بھی
فرہاد بھی جو اک نہر سی کھود کے لایا ہے
سب مایا ہے

کیوں درد کے نامے لکھتے لکھتے رات کرو
جس سات سمندر پار کی نار کی بات کرو
اس نار سے کوئی ایک نے دھوکا کھایا ہے؟
سب مایا ہے

جس گوری پر ہم ایک غزل ہر شام لکھیں
تم جانتے ہو ہم کیونکر اس کا نام لکھیں
دل اس کی بھی چوکھٹ چوم کے واپس آیا ہے
سب مایا ہے

وہ لڑکی بھی جو چاند نگر کی رانی تھی
وہ جس کی الہڑ آنکھوں میں حیرانی تھی
آج اس نے بھی پیغام یہی بھجوایا ہے
سب مایا ہے

جو لوگ ابھی تک نام وفا کا لیتے ہیں
وہ جان کے دھوکے کھاتے، دھوکے دیتے ہیں
ہاں ٹھوک بجا کر ہم نے حکم لگایا ہے
سب مایا ہے

جب دیکھ لیا ہر شخص یہاں ہرجائی ہے
اس شہر سے دور، اک کٹیا ہم نے بنائی ہے
اور اس کٹیا کے ماتھے پر لکھوایا ہے
سب مایا ہے

☆☆

بیادِ محمود ریاض

کاش

فائزہ افتخار

شاید ہی کبھی مجھے اپنے لکھنے پر افسوس ہوا ہو۔ اور ہونا بھی نہیں چاہیے۔ لکھنے کے اس سفر میں میں نے بہت کچھ پایا ہے۔

کتھارسس...... پہچان...... محبت۔

لیکن اس کے باوجود بھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ کسی حوالے سے مجھے اپنے لکھنے پہ افسوس ہوتا ہے۔

اس بات کا افسوس نہیں کہ میں نے خواتین، شعاع اور کرن میں لکھنا کیوں شروع کیا۔ بلکہ افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ میں نے یہاں لکھنا اتنی دیر سے کیوں شروع کیا۔

اتنی دیر بعد......

محمود ریاض صاحب کے گزر جانے کے بعد......

کاش کہ میں نے کچھ عرصہ قبل لکھنے کا آغاز کیا ہوتا، تب جب خواتین، شعاع اور کرن کو محمود ریاض صاحب کی سرپرستی حاصل تھی۔ شاید اس بہانے میری ان سے شناسائی ہو جاتی۔ میں بھی علم، خلوص اور دیانت کے اس سرچشمے سے فیض یاب ہو جاتی۔ مگر یہ میرے نصیب میں نہ تھا۔

ان کی برسی کے موقع پہ ہر سال جب میں اپنی محترم اور سینئرز مصنفین کے وہ مضامین پڑھتی ہوں، جس میں انہوں نے محمود ریاض صاحب کے حوالے سے اپنی یادداشتیں لکھی ہوتی ہیں۔ تب مجھے ان پہ بے پناہ رشک آتا ہے اور ان سے براہ راست شناسائی کا شرف نہ ہونے کے باوجود، میں ان کی ہمہ جہت شخصیت کے بہت سے پہلوؤں سے آگاہ ہو جاتی ہوں۔

ایک بار فارحہ ارشد نے لکھا تھا کہ محمود ریاض صاحب نے کسی شمارے میں اپنی رائٹرز کے نام لے کے ان کے قلمی تعاون کا شکریہ ادا کیا۔ خواتین ایک بڑا اشاعتی ادارہ ہے۔ ہر ماہ بہت سی رائٹرز لکھتی ہیں۔ غیر ارادی طور پر چند نام شامل ہونے سے رہ گئے ہوں گے، جن میں فارحہ کا نام بھی تھا۔ فارحہ بتاتی ہیں کہ انہیں شاید افسوس ہوا اور برسبیل تذکرہ کہیں انہوں نے اس تاسف کا تذکرہ امحل سے کر دیا۔ امحل نے فارحہ کے جذبات محمود ریاض تک پہنچائے۔ انہوں نے انجانے میں فارحہ کو پہنچنے والے ملال کا ازالہ اس خوب صورتی سے کیا کہ اپنے ہی ادارے کے ایک اور ماہنامے میں فارحہ کی پہلے سے ہی شعاع یا خواتین میں شائع شدہ ایک تحریر منتخب تحریر کے نام سے نہ صرف شائع کی، بلکہ خود فارحہ سے معذرت بھی کی۔ حالانکہ یہ بہت معمولی سی بات تھی۔ قلم کار تو ہوتے ہی حساس ہیں۔ لیکن بڑی بات یہ ہے کہ کوئی ان کے احساسات کا خیال بھی رکھے۔ اتنی اپنائیت۔ اتنی انکساری، میں جب بھی ان کے بارے میں کچھ پڑھتی ہوں خصوصاً امحل کی کوئی تحریر کردہ وہ ایک طویل عرصہ ان کے ساتھ کام کر چکی ہیں۔ اپنی زندگی کی اس تشنگی پہ افسوس پہلے سے بڑھ کے ہوتا ہے۔

دنیا میں اچھے لوگ ہیں بھی کتنے کم۔

اور جو ہیں۔ ضروری تو نہیں، آپ ان سے واقف بھی ہوں۔ اگر میں کچھ عرصہ قبل اپنے قلمی سفر کا آغاز کر دیتی تو یہ شناسائی میرا نصیب بھی ہوتی۔

تب یہ سطور میں اتنے ملال سے نہ لکھتی۔ بلکہ بڑے فخر سے یہ لکھتے ہوئے آغاز کرتی کہ۔

"محمود ریاض صاحب، جو کہ ادب کی دنیا کے چند نفیس ترین لوگوں میں سے ایک تھے، مجھے ان کی خوبیاں قریب سے جاننے، ان سے کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔"

مقبول مصنفہ

افشاں آفریدی سے ملاقات

شاہین رشید

کچھ مصنفین ایسے ہوتے ہیں جو کم لکھیں یا زیادہ، قارئین ان کی تحریروں کو بھلا نہیں پاتے ہیں۔ افشاں آفریدی کا شمار ان ہی مصنفین میں ہوتا ہے۔

افشاں آفریدی نے 1992 سے لکھنے کا آغاز کیا، انہوں نے زیادہ تر طویل تحریریں لکھیں جو بہت پسند کی گئیں۔ ان کے لکھنے کا مخصوص انداز قارئین کو بہت بھایا۔

افشاں کی کہانیوں میں جدت اور روایت کا بڑا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔ ان کی کہانیوں کے کردار جدید دور کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں لیکن مذہبی اقدار اور معاشرتی روایات کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ وہ رومانٹک تحریر۔ ضرور لکھتی ہیں لیکن بہت سنبھل کر قلم کا استعمال کیا۔

شادی کے بعد انہوں نے لکھنا کم کر دیا تھا۔ اب دوبارہ لکھنے کا ارادہ ہے۔ اس ماہ ہم آپ کی ملاقات افشاں آفریدی سے کرا رہے ہیں۔

''کیا حال ہیں آپ کے؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''آپ جرمنی میں رہتی ہیں تو پہلے کچھ سوال پرسنل...... پھر فیلڈ سے متعلق کریں گے۔ تو یہ بتائیے کہ آج کل کیا مصروفیات ہیں......؟''

''جی ...... رمضان المبارک اور گھریلو مصروفیات چل رہی ہیں اور اگر لکھنے کے حوالے سے بات کی جائے تو دو ناولز لکھ رہی ہوں اور آج کل ان ہی کی طرف زیادہ دھیان ہے......

رمضان میں عموماً میں کم ہی لکھ پاتی ہوں۔ کیونکہ رمضان کی روٹین روزمرہ کی روٹین سے کافی مختلف ہوتی ہے، عبادت کی طرف زیادہ رجحان ہوتا ہے۔ عام روٹین تو یہی ہے کہ بچوں کے لیے مصروفیات، گھر کے کاموں کی طرف توجہ......

میرا اپنا ایک اسلامی اسکول ہے اور ہر ویک اینڈ میں میں اپنے اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ میں خود بھی قرآن کی تفسیر کی طالبہ ہوں۔ عربی گرامر کا کورس بھی کر چکی ہوں، کراچی پاکستان سے جب میں آئی تو میں حفظ کر رہی تھی جو کہ مکمل نہ ہوسکا۔ کیونکہ شروع ہی دیر سے کیا۔ جب گریجویشن سے فارغ ہوئی تو میں کرنے کا سوچا اور پہلا ''سپارہ'' ہی حفظ کیا تھا کہ میری شادی ہوگئی اور ایک ماہ کے بعد ہی میں جرمنی آ گئی۔ شادی کے گیارہ بارہ سال کے بعد مجھے ایک اسلامی اسکول میں پڑھانے کا موقع ملا...... جرمنی میں کینیڈا اور انگلینڈ کی طرح اسلامی اسکول کھولنے کی اجازت ابھی تک مسلمانوں کو نہیں ملی۔ تو جو پبلک اسکول ہوتے ہیں وہاں ہر ہفتے یا اتوار کے دن مختلف مساجد میں لوگ اسلامک اسکول لگاتے ہیں اور اسلامیات اور قرآن کی تعلیم دیتے ہیں بچوں کو۔ تو میں نے جو اسکول بنایا ہے، اس میں ہر ہفتے کو میں پڑھاتی ہوں قرآن تجوید اور تفسیر کے ساتھ......

ان میں خواتین اور بڑے بچے شامل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ فون پر ٹیوشن دیتی ہوں۔ تفسیر اور قرآن کی۔ اس کے علاوہ میرے اپنے کورسز بھی چلتے رہتے ہیں اور مجھے ''قرآن'' کی طالبہ بنے رہنا بہت پسند ہے۔ قرآن ایک گہرے سمندر کی طرح ہے۔ جتنا گہرائی میں اتریں گے، علم کے موتی ملتے رہیں گے اور آپ کو کبھی بھی نہیں لگے گا کہ میں نے مکمل کر لیا ہے قرآن۔ یہ ساری مصروفیات رمضان کے علاوہ ہیں یعنی عام روٹین ہے۔''

''شادی کب ہوئی اور جرمنی کب آنا ہوا؟''

''2001ء فروری میں میری شادی ہوئی اور

ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد میں جرمنی آ گئی تھی۔ پھر یہیں پر سکونت اختیار کی اور یہاں آ کر تو دل لگا ہی نہیں اور یہی سوچا کہ واپس چلے جائیں گے 2001ء میں 9/11 کا جو واقعہ ہوا اور پھر پاکستان کے جو حالات ہوئے تو سب نے کہا کہ یہاں پاکستان مت آنا۔ یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ بس وہی ٹائم تھا جب ہم نکل سکتے تھے مگر نہیں نکل سکے۔ پھر بچوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بچے اس دنیا میں آ گئے۔ تو بچوں کی ذمہ داریاں شروع ہو گئیں تو بس انسان جب ایک جگہ جکڑ جاتا ہے تو پھر وہاں سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

تاہم پاکستان آنے کا سلسلہ تو جاری رہا۔ جب بچے چھوٹے تھے تو لگاتار کچھ سال آتی رہی۔ مگر ہوتا یہ تھا کہ بچے شدید بیمار ہو جاتے تھے۔ ایک بار تو میرے دونوں بچے اتنے بیمار ہوئے کہ انہیں اسپتال داخل کرنا پڑا تب ہم بہت ڈر گئے اور پھر تقریباً چار سال ہم پاکستان نہیں گئے کہ بچے تھوڑے بڑے ہو جائیں۔

جب چار سال کے بعد گئے تو چھوٹی بیٹی بیمار ہو گئی۔ تو پھر کچھ سال نہ جا سکے۔ اور جب میری والدہ کا انتقال ہو گیا تو میرا پاکستان جانے کو دل ہی نہیں چاہا۔ 2010ء میں پاکستان گئی اور پھر چھ سال کے بعد یعنی 2016ء میں پاکستان گئی۔ 2016ء کے بعد بچوں نے بھی ہمت کی۔ کچھ ہم نے کہ پاکستان جاتے رہنا چاہیے۔ تو اب ہر سال یا دو سال کے بعد پاکستان چلے جاتے ہیں۔ بہت اچھا لگتا ہے پاکستان آنا اور جب آتی ہوں، کچھ انرجی لے کر جاتی ہوں کہ مزید کچھ سال جرمنی میں گزار سکوں۔“

”پاکستان آ کر کیسا لگتا ہے؟“

”یہ سوال اکثر لوگ کرتے ہیں تو میں کہتی ہوں کہ پاکستان آ کر سکون ملتا ہے۔ وہاں اپنا پن ہے۔ اپنا موسم ہے۔ اپنے لوگ، اپنے رشتے دار، بہن بھائی۔ بھائی پاکستان میں ہیں جبکہ بہنیں ملک سے باہر ہیں، ایک جرمنی میں ہے مگر دوسرے صوبے میں



اور چھوٹی بہن کینیڈا میں ہوتی ہے۔ ہم تینوں بہنیں پاکستان سے باہر ہیں اور دو بھائی پاکستان میں۔ پھر پاکستان میں ننھیال، ددھیال اور سسرال ہے۔ پاکستان آ کر کالج کی فرینڈز سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے تو بہت اچھا لگتا ہے ایک انجانی سی خوشی ہوتی ہے۔“

”جرمنی کی کیا بات بہت اچھی ہے اور پاکستان کی کون سی بات اچھی ہے؟ بری بھی بتائیے گا؟“

”جرمنی کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ انسانیت ہے۔ انصاف ہے۔ قانون ہے۔ پاکستان کی اچھی بات یہ کہ ”رشتے“ ہیں۔ اپنی زبان ہے۔ اپنی ثقافت ہے اور پاکستان میں جو چیز بری ہے وہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جرمنی کا موسم برا ہے۔ جب میں نئی نئی آئی تھی تو بہت برف باری ہوتی تھی اور اکثر برف کے طوفان آتے تھے اور مارچ میں جو آخری برف باری ہوتی تھی وہ مئی میں کلیئر ہوتی تھی۔ اب پہلے جیسی موسم کی سختی نہیں رہی ہے۔ لیکن جو بات بہت زیادہ بری ہے، وہ ”بے حیائی“ ہے ”فحاشی“ اور ”بے حسی“ ہے یہاں رشتے نہیں ہیں، خلوص و محبت نہیں ہے۔ اگر آپ انفرادی بات کریں تو......

اجتماعی طور پر تو بہت خیال کرنے والے لوگ ہیں۔ انسانیت ہے۔ علاج ہے۔ تعلیم بہت اعلا ہے۔ جاب نہیں ہے تو گورنمنٹ الاؤنسز دیتی ہے۔ لیکن انفرادی طور پر مجھ جیسا انسان جذب نہیں ہوتا، مجھ جیسی نیچر کی انسان کو ان کی زمین میں جذب کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔"

"ہمارے بارے میں ان لوگوں کے کیا خیالات ہیں؟"

"میں جس ایریا میں رہتی ہوں اور جو میرا پڑوس ہے، وہ سب جرمن ہیں۔ فیملیز ہیں۔ تو ہمارے رویے کے حساب سے الحمدللہ سب بہت اچھے ہیں۔ حدیث نبوی ہے کہ اچھا پڑوس ملنا بھی بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔ ہم اچھے ہیں تو وہ بھی اچھے ہیں اور وہ اچھے ہیں تو ہم بھی اچھے ہیں۔ لیکن اگر اوور آل بات کی جائے تو کچھ بہت اچھا بھی سمجھتے ہیں اور کچھ اچھا نہیں بھی سمجھتے۔ جرمن لوگوں کے بارے میں یہ محاورہ فٹ آتا ہے کہ ان کے ہونٹوں میں شہد اور دل میں زہر ہوتا ہے۔ ناپسندیدگی کا اظہار زیادہ نہیں کرتے اگر ان کے دل میں کوئی بات ہوتی بھی ہے تو......

سیکنڈ ورلڈ وار کے بعد انہوں نے لوگوں کو بلایا پاکستان سے بھی لوگ مانگے تھے تو پاکستان نے تو اپنی لیبر نہیں دی جبکہ ترکی نے بہت لیبر دی اپنی۔ تو اس لحاظ سے دیکھیں تو ترکوں کی طرف کی بھی اب تیسری یا چوتھی نسل یہاں پر جوان ہو رہی ہے......اور اب تو بہت زیادہ انڈین اور پاکستانی یہاں پر ہیں اور اب گلف کے جو حالات ہیں، اس کی وجہ سے بہت سے عرب مسلمان بھی یہاں آتے ہیں۔

ہیمبرگ کراچی کی طرح کا ایک شہر ہے۔ جہاں مختلف کلچر اور زبانوں کے بولنے والے قیام پذیر ہیں یہ ایک کمرشل سٹی ہے تو مسلمانوں کے لیے یہاں برداشت بھی بہت ہے اور یہ بھی منحصر ہے کہ آپ کون سے شہر میں رہ رہے ہیں اور آپ کے اردگرد کس طرح کے لوگ اور کس طرح کی آبادی زیادہ ہے اور ویسے بھی جرمن بائے نیچر اپنے آپ کو بلو بلڈ سمجھنے والی نسل ہے۔"

"آپ کے لکھنے کا عمل جاری رہا؟ اور یہ کہ باہر کی لائف پاکستان کی زندگی سے کتنی مختلف ہے؟"

"میرے بچے جب تک تھوڑے بڑے نہیں ہو گئے، میں نے لکھنا تقریباً ختم ہی کر دیا تھا۔ 2001ء میں شادی ہوئی اور 2012ء یا 2013ء میں میں نے دوبارہ سے لکھنا شروع کر دیا اور جب میرا ناول مکمل ہوا تو میں 2016ء میں ناول کے ساتھ پاکستان گئی۔

یہاں کی زندگی اور پاکستان کی زندگی میں بہت فرق ہے۔ باہر کی زندگی میں سب کچھ آپ کو خود کرنا ہوتا ہے۔

اگر آپ کسی کلینک میں بھی جائیں گے اور ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوں گے تو آپ کو پکارنے کے لیے کوئی پیون ٹائپ کا بندہ نہیں ہوگا بلکہ ڈاکٹر خود آتا ہے اور ویٹنگ روم کا دروازہ کھول کر آپ کا نام پکار کر آپ کو خود اندر لے کر جاتا ہے اور جب آپ کمرے کے اندر چلے جاتے ہیں تو ڈاکٹر خود اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتا ہے۔

یہاں تقریباً سب کچھ خود ہی کرنا ہوتا ہے اگر آپ کسی جگہ جاب کر رہے ہیں تو آپ کو کافی کی طلب ہوئی ہے تو آپ اپنی کافی خود بنائیں گے اور کپ دھوئیں گے بھی خود یا ڈش واشر میں لگائیں گے۔ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا عہدے والا بھی اپنے سب کام خود کرتا ہے۔ ہمارے ملک کی طرح "ماتحت" کا جو ایک ماحول ہے وہ یہاں نہیں ملے گا یہاں ہر بندہ اپنے گھر کے کام بھی خود کرتا ہے۔ خواہ وہ ڈاکٹر ہو۔ انجینئر ہوں یا کسی بھی عہدے پر فائز ہو۔ اس نے اپنے گھر میں بجلی کا کام بھی خود کرنا ہے اور دیگر کام بھی۔ میں جس ایریا میں رہتی ہوں وہاں زیادہ تر لوگ وہ ہیں جو ایئرپورٹ پر کام کرتے ہیں، ان میں "ایروناٹیکل انجینئر" بھی ہیں۔ "سول ایوی ایشن" میں کام کرنے والے لوگ بھی ہیں۔ مگر گھر کی گارڈننگ سے لے کر صفائی ستھرائی تک سب کام وہ خود کرتے ہیں۔



پاکستان میں آپ کو یہ ماحول نہیں ملے گا۔
پاکستان میں تو آپ گروسری کریں تو کاؤنٹر پہ ایک شخص صرف اس لیے کھڑا ہوگا کہ وہ آپ کی چیزوں کو شاپنگ بیگ میں ڈال کردے۔

ایک لحاظ سے یہ بات اچھی ہے کہ اس طرح کے مختلف کاموں کے لیے لوگوں کو جابز مل جاتی ہیں پاکستان میں طبقاتی فرق بہت زیادہ ہے جبکہ یہاں جرمنی میں ایسا نہیں ہے۔ یہاں ایلیٹ کلاس کم ہے اور مڈل کلاس زیادہ ہے۔

صحت مند معاشرے کی نشانی ہی یہ ہے کہ وہاں درمیانہ طبقہ زیادہ ہو۔ غربت والے بھی کم ہوں اور امارات والے بھی کم ہوں۔ اسی لیے مجھے پاکستان آ کر اس طرح کا فرق بہت زیادہ محسوس ہوتا ہے مگر آسانیاں بھی بہت ہیں ہر کام کے لیے بندہ مل جاتا ہے۔

جرمنی میں فیملی کا ماحول بالکل بھی نہیں ہے۔ رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں، اولڈ ہاؤسز بھرے ہوئے ہیں۔ ادھر بچے اٹھارہ سال کے ہوئے والدین ان کو "کک آؤٹ" کردیتے ہیں کہ جاؤ، ہمارے سر کا بوجھ ہو، لہٰذا خود کماؤ خود کھاؤ۔ تو جب والدین بوڑھے ہوجاتے ہیں تو اولاد کہتی ہے کہ آپ نے تو ہمیں اٹھارہ سال ہی پالا تھا تو ہم کیوں تمہیں بیس، پچیس سال اپنے سر پر بٹھا کر رکھیں۔ تو بوڑھے والدین اولاد کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اگرچہ اب پاکستان کا ماحول بھی بہت بدل چکا ہے مگر پھر بھی کسی نہ کسی حد تک فیملی ماحول ہے، خاندانی نظام قائم ہے۔

جرمنی کے ہر دوسرے گھر میں طلاق ہوئی ہوئی ہوتی ہے یا پھر سوتیلے ماں باپ ہوتے ہیں۔ میرے بچوں نے جب اسکول میں داخلہ لیا تو ہمیں اندازہ ہوا کہ تقریباً ہر بچے کے والدین کی طلاق ہوچکی ہے تقریباً اسی فیصد لوگ طلاق یافتہ ہیں تو بچے سوتیلوں میں ہی پل رہے ہیں۔ باقاعدہ شادی پر تو یقین ہی نہیں رکھتے۔ ماں کسی دوست کے ساتھ رہ رہی ہوتی ہے تو باپ کسی کی بیوی کے ساتھ رہ رہا ہوتا ہے یا نئی بیوی یا نئی دوست کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں اللہ نہ کرے کہ کبھی ایسا ماحول ہو، رشتوں کا تقدس ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں ہم لوگ۔

میرا یہاں سارا فوکس اپنے گھر پر ہی ہوتا ہے کوکنگ کرنا، دیگر کام کرنا، گھر کو مینٹین رکھنا سب میری ذمہ داری ہے۔ اور پھر کورسز کرنا...... یہ سب کام میں کرتی ہوں۔"

"آپ کے توسط سے بہت سی دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں دیار غیر کے بارے میں...... اب آجائیں فیلڈ کی جانب...... تو پہلے اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیے؟"

"میں کراچی میں ہی پیدا ہوئی۔ یہیں سے پروان چڑھی اور شادی کے بعد جرمنی آگئی۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ دو بھائی کراچی میں رہتے ہیں۔ ایک بہن جرمنی میں ہی رہتی ہے اور دوسری کینیڈا میں۔ بہنوں میں میرا نمبر دوسرا ہے۔ والدین کا ادب لٹریچر سے بڑا گہرا تعلق رہا...... میری والدہ مطالعہ کی بہت

زیادہ شوقین تھیں۔ ننھیال میں میری نانی کے گھر ان کی اپنی لائبریری تھی۔ ایک ماموں کی اپنی ایک الگ لائبریری تھی۔ تو بچپن سے ہی اپنے اردگرد نہ صرف کتابیں دیکھیں بلکہ سب کو مطالعہ کا شوقین بھی پایا تو پڑھنے والا ماحول ملا تو میرا رجحان بھی پڑھنے کی طرف ہوا، اور جب میں نے صحیح معنوں میں پڑھنا شروع کیا تو سب سے پہلے میں نے اپنی والدہ کے کلیکشن پر ہاتھ صاف کیا، ان کے پاس نسیم حجازی کی کتابوں کی پوری سیریز تھی اور دیگر کتابیں بھی تھیں تو پڑھنے کی اجازت والدہ کی طرف سے مل گئی تھی۔ والد صاحب بھی کالج میں ڈرامیٹک سوسائٹی کے ممبر رہے اور بزم طلبہ کے لیے بھی کام کرتے رہے۔

میری فیملی میں ایسا نہیں ہے کہ سب ہی لکھنے لکھانے والے لوگ تھے لیکن میرے والد کے چچا بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ والدہ کی فیملی میں کسی کو لکھنے کا شوق نہیں تھا۔ میری نانی اور نانا فارسی شاعری کو بہت پسند کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے کو فارسی میں ہی شعر سنایا کرتے تھے تو گھر کا ماحول بہت پڑھا لکھا تھا۔ میں نے بہت چھوٹی عمر سے لکھنا شروع کیا۔"

"بچپن میں مجھے تصاویر بنانے کا بہت شوق تھا جب میں گریڈ 4 میں تھی تو تصاویر بناتی تھی۔ میری ڈرائنگ بہت اچھی تھی۔ تصویریں بنانے کے شوق میں کہانیاں لکھیں، کہانیاں لکھتی تو ایک صفحے پر تصویر بھی بناتی تھی۔ جب گریڈ 6 میں آئی تو میں نے ناول لکھنا شروع کیا اور وہ ناول میں نے کبھی شائع نہیں کروایا وہ میرا پہلا ناول تھا کیونکہ مجھے خود ایسا احساس ہوتا تھا کہ تھوڑا بچکانہ ہے۔ گریڈ 8 میں پھر ایک ناول لکھا......اور پھر باقاعدہ لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ مجھے لکھنے کے لیے اپنے والدین کی طرف سے بہت آزادی ملی۔ وہ بہت حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے اور قدر بھی کرتے تھے......اور کبھی لکھنے کے معاملے میں منع نہیں کیا کہ یہ کیوں لکھ رہی ہو رومینٹک ناول لکھنے کے لیے تو لڑکیوں کو خاص منع کیا جاتا ہے مگر مجھ پر ایسی کوئی پابندی نہیں تھی......اور یہی وجہ ہے کہ مجھے "قلمی" نام سے لکھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

میں نے پی ای سی ایچ ایس کالج سے گریجویشن کیا۔ میرا گریجویشن اکنامکس میں تھا۔ گریجویشن کے بعد شادی ہو گئی، ماشاء اللہ سے میرے تین بچے ہیں۔ بڑی بیٹی ہے "اریج" نام ہے وہ "شاپنگ بزنس" پڑھ رہی ہے۔ پھر ایک بیٹا ہے "نوفل" نام ہے اور بی بی اے کا پہلا سمسٹر چل رہا ہے، الحمد للہ سب سے چھوٹی بیٹی ہے "انشرح" اور وہ فرسٹ ایئر میں ہے۔"

"بچپن کیسا گزرا؟"

"بچپن میں میں بہت ہی شریر تھی، بہت ایکٹو تھی اور اس طرح کی بچی تھی جو بچپن میں اپنے والدین کو بہت ٹف ٹائم دیتے ہیں۔ میں "نچلا" نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ بہت فرینڈلی تھی ہر بچے سے میری دوستی ہو جاتی تھی اور دوستی ان سے ہوتی تھی جو میری طرح ایکٹو ہوتے تھے، آؤٹ ڈور گیمز سے ہمیشہ لگاؤ رہا، ان ڈور گیمز سے نہ دلچسپی تھی اور نہ ہی کبھی کھیلنے کی کوشش کی، گریڈ 5th تک میں ایک ایوریج اسٹوڈنٹ تھی لیکن گریڈ 6th سے میں نے پڑھائی کو بہت سیریس لیا اور گریجویشن تک میں ہمیشہ الحمدللہ ٹاپرز میں ہی رہی اور زندگی میں جو کام میں نے سب سے اچھا کیا ہے وہ پڑھائی ہے۔ وہ بھائی جس کی عمر اور میری عمر میں تقریباً سال ڈیڑھ سال کا اس کے ساتھ میں لڑکوں والے گیمز کھیلتی تھی اور بہت انجوائے کرتی تھی۔

اور جب میں گریڈ 6th میں تھی اور میری ایک بہن مجھ سے چھوٹی تھی تو والدہ بیمار ہو گئیں اور اتنی بیمار ہوئیں کہ بیڈ پر آ گئیں تو پھر ہمیں کچن سنبھالنا پڑا۔ بہت چھوٹی عمر میں اور مجھے یاد ہے کہ میں اور میری چھوٹی بہن کوکنگ کرتی تھیں۔

میرے والد بہت خوددار اور سیلف میڈ انسان تھے۔ میری والدہ کی بیماری کے دوران کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میری خاطر، میری پھپھو جن کا گھر ہمارے گھر

کے قریب ہی تھا ان کے گھر سے کھانا پک کر آیا ہو، کبھی ...... والدہ بیمار ہوئیں تو والد صاحب نے والدہ کو بھی سنبھالا اور ہم بچوں کو بھی سنبھالا، کوکنگ بھی سکھائی تو ہم اسکول جانے سے پہلے کوکنگ کر لیا کرتی تھیں یا پھر شام کو پکا لیا کرتے تھے۔ تب میں بہت سنجیدہ بچی ہوگئی۔ لیکن مزاج میں شوخی پہلے بھی تھی اب بھی ہے یہ قدرتی طور پر ہے۔

بہن بھائیوں کے ساتھ الحمدللہ میرے بہت اچھے تعلقات رہے ہیں۔ خاص طور پر بڑی بہن کے ساتھ کیونکہ اس میں اور مجھ میں صرف تیرہ ماہ کا فرق ہے تو ہم سب بہت پیار محبت کے ساتھ رہے...... اور میری ایک عادت تھی کہ مجھے جو بات بری لگتی تھی، اسے میں سمجھا کر بتاتی تھی۔ اور اپنے بہن بھائیوں کو میں نے پڑھایا بھی ہے اور ان کے امتحانات میں ان سے زیادہ میں پریشان ہوتی تھی کہ ان کے امتحان ٹھیک ہو جائیں۔ بچپن میں میں جتنی کھلنڈری اور لاپرواہ تھی۔ ماما کی بیماری کے بعد اتنی ہی ذمہ دار ہوگئی اور بہن بھائیوں کی ذمہ داری بھی اپنے سر پر لے لی۔

بڑی بہن جن کا میرا فرق بہت ہی کم تھا، ابو کے کہنے پر انہیں باجی کہتی تھی تو اکثر ان کے ساتھ لڑائی بھی ہو جاتی تھی اور میں لڑ کر بھول بھی جایا کرتی تھی، ادھر لڑائی ہوئی ادھر کام میں مصروف ہوگئی یا سو گئی اور جب سو کر اٹھتی تو بھول چکی ہوتی تھی کہ لڑائی ہوئی ہے سارا اوور ڈیلیٹ ہو جاتا تھا جبکہ بہن لڑائی کو نبھانے والی شخصیت تھیں اور کم سے کم دو تین دن تو وہ ناراض رہتی ہی تھیں۔ مجھے نہیں یاد کہ مجھے زندگی میں کسی نے منایا ہوگا۔ کیونکہ کبھی ناراض ہوئی ہی نہیں ...... اسی طرح والدین سے بھی بہت اچھے تعلقات تھے اور والدین سے تعلقات خراب بھی کیسے ہو سکتے ہیں بھلا۔

میری والدہ بہت سے معاملات میں مجھ پر ہی انحصار کرتی تھیں۔ والدین نے بہت محنت کے ساتھ، بہت پیار کے ساتھ ہماری پرورش کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین "ماں" کا بیمار ہونا پوری فیملی کو مفلوج کر دیتا ہے۔ بہت ٹف ٹائم ہم نے گزارا اماں کی بیماری کے ساتھ۔

ہمارے گھر کا ماحول پڑھنے پڑھانے والا تھا...... اور ہمیں بھی پڑھنے کے لیے منع نہیں کیا۔ ہم چار بہن بھائیوں کو تو پڑھائی سے کافی شغف رہا جبکہ چھوٹے بھائی کا زیادہ رجحان نہیں رہا پڑھائی کی طرف، مجھے فکشن اور تاریخی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ سفرنامہ بھی بہت شوق سے پڑھتی تھی۔ بھائی کو مزاحیہ ادب سے لگاؤ تھا۔ ہم سب کو شاعری سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ ہمارے گھر میں "مذہبی کتب" کا ایک علیحدہ خانہ تھا، والد ہر طرح کی کتاب پڑھنے کی اجازت دیتے تھے۔

میری دونوں خالائیں اور میری والدہ ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھتی تھیں تو چونکہ دونوں کتابیں پڑھنے کے شوقین تھیں تو ہم پر کسی قسم کی کوئی پابندی یا سختی نہیں تھی۔ میری چھوٹی بہن والد کی لاڈلی اور چھوٹا بھائی والدہ کا لاڈلا تھا۔ اور چھوٹے تو ہوتے ہی لاڈلے ہیں۔"

"لکھ تو آپ بچپن سے رہی ہیں۔ باقاعدہ لکھنے کا آغاز کب کیا؟"

"گریڈ 8th میں میں نے ایک ناول لکھا جسے لے کر میں "کرن" کے آفس گئی اور انہیں میں نے اپنا ناول دیا اور وہ ناول چھپ گیا، اس کے بعد سے آج تک میری کوئی تحریر ریجیکٹ نہیں ہوئی۔ میرے گھر کا ماحول ایسا تھا کہ جب میں تے ناول لکھا اور شائع بھی ہو گیا تو سب تے ہی میری حوصلہ افزائی کی ...... میری بڑی بہن تے میری بہت حوصلہ افزائی کی اور بڑے شوق سے میرا ناول پڑھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

رمضان ٹرانسمیشن کی میزبان

باتیں فائزہ کامران سے

شاہین رشید

1۔ ''اصلی نام؟''

''فائزہ کامران ہی ہے۔ شادی سے پہلے فائزہ سلیم تھا میرا نام۔ اور مجھے ابھی بھی فائزہ سلیم کے نام سے لوگ زیادہ جانتے ہیں کیونکہ میں اسکول کے زمانے سے اس فیلڈ میں ہوں۔''

2۔ ''پیار کا نام؟''

''کوئی نہیں ہے۔''

3۔ ''تاریخ پیدائش/ سال؟''

''9 جون/ 1990ء ہے۔''

4۔ ''قد/ ستارہ؟''

''5 فٹ 2 انچ/ جیمنائی ہے۔''

5۔ ''مادری زبان؟''

''اردو۔''

6۔ ''اس فیلڈ میں آمد؟/ گھر والوں کا ردعمل؟''

''میرے والد اور والدہ دونوں نعت خواں ہیں ماشاءاللہ والد ''لالہ سلیم'' ٹی وی ایکٹر بھی تھے اور شہلا سلیم جیسا کہ بتایا نعت خواں ہیں۔ تو ان کے ہی توسط سے آئی۔ / گھر والوں نے کیا کہنا تھا ان ہی کی مرضی سے آئی۔''

7۔ ''تعلیم/ شادی؟''

''میں نے گریجویشن کی ہے/ اور ہاں شادی ہو چکی ہے اور ماشاء اللہ سے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔''

8۔ ''پہلا پروگرام/ شہرت کس نے دی؟''

''پہلا پروگرام تین سال کی عمر میں کیا تھا اور پی ٹی وی کے بچوں کے پروگرام سے شروعات کی تھی۔ اور شہرت تو پتا نہیں کب مل گئی۔''

9۔ ''بچپن میں کس بات سے یا کس سے ڈر لگتا تھا؟''

''والدین کی ناراضی سے ڈر لگتا تھا کہ کہیں ایسی کوئی غلطی نہ سرزد ہو جائے کہ وہ ناراض ہو جائیں۔''

10۔ ''پہلی کمائی کتنی تھی اور کس کے ہاتھ میں دی تھی؟''

''یہ تو یاد نہیں۔ اس وقت سے کما رہی ہوں جب بہت چھوٹی تھی اور پیسہ کیا ہوتا ہے، کچھ پتا نہیں تھا۔''

11۔ ''بچپن کی بری عادت؟''

''مجھے یاد نہیں ہے بلکہ سب یہی کہتے ہیں اور ممی پاپا بھی کہتے ہیں کہ بچپن سے ہی میں میچیور اور سمجھ دار تھی۔''

12۔ ''آپ کا سورج کب طلوع ہوتا ہے؟''

''بہت جلدی طلوع ہو جاتا ہے کیونکہ میں ایک اسکول کی مونٹیسوری ایڈمنسٹریٹر ہوں اور انچارج شپ بھی میرے پاس ہی ہے تو چھ بجے اٹھ جاتی ہوں۔''

13۔ ''صبح اٹھتے ہی کس چیز کی طلب ہوتی ہے؟''

''سب سے پہلے چائے کی طلب ہوتی ہے۔''

14۔ ''کیا برداشت نہیں بھوک یا غصہ؟''

''بھوک برداشت ہو جاتی ہے مگر غصہ برداشت نہیں ہوتا۔''

15۔ ''پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟''

''کہ کاش ہمیں قائداعظم جیسے رہنما دوبارہ مل جائیں جو صرف پاکستان کے لیے سوچیں۔ یہاں تو جو آتا ہے، اپنے لیے سوچتا ہے۔''



16۔ ''سیاست میں کون پسند ہے؟''
''کوئی بھی پسند نہیں ہے۔''

17۔ ''کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟''
''کسی بھی ملک کی نہیں۔ اپنا ملک ہی پسند ہے۔''

18۔ ''کس چیز پر پیسہ خرچ کر کے بہت پچھتاتی ہیں؟''
''بہت ہی سوچ سمجھ کر خرچ کرتی ہوں۔ البتہ آن لائن ایک دو بار چیزیں یا کپڑے خراب آئے تو پچھتائی پھر سنبھل بھی گئی۔''

19۔ ''شوبز میں کیا اچھا ہے کیا برا ہے؟''
''اچھا یہ ہے اگر آپ عزت دیں تو عزت ملتی ہے اور برا یہ ہے کہ زیادہ شہرت مل جائے تو دماغ بہت زیادہ اونچائیوں پر چلا جاتا ہے یہ چیز ہی بری ہے۔ انکساری کا دامن نہ چھوڑیں۔''

20۔ ''اسپورٹس سے آپ کا لگاؤ؟ کون سا کھیل پسند ہے؟''
''کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ بس کرکٹ پسند ہے اور جب ورلڈ کپ ہوتا ہے تو دیکھ لیتی ہوں۔''

21۔ ''کس بات پر آپ کی آواز اونچی ہو جاتی ہے؟''
''گھر میں کبھی بے ترتیبی آ جائے تو مجھے ٹینشن ہو جاتی ہے تو بچوں کو سمجھانے کے لیے تھوڑی آواز اونچی ہو جاتی ہے۔''

22۔ ''تین چیزیں جنہیں خریدنا آپ کا خواب ہے؟''
''الحمدللہ...... اللہ نے ہر چیز سے نوازا ہے۔ ایسی کوئی چیز نہیں ہے کہ جس کو خریدنا خواب ہو۔''

23۔ ''کس کی خاطر یہ فیلڈ چھوڑ سکتی ہیں؟''
''اگر میرے والدین کہیں گے کسی وجہ سے تو میں یہ فیلڈ چھوڑ سکتی ہوں۔''

24۔ ''کون سا کام ہے جو پہلے کبھی نہیں کیا تھا اب کرنے لگی ہیں؟''
''ایسا تو کوئی کام نہیں ہے۔''

25۔ ''خاندان میں کون سب سے جلدی ناراض ہو جاتا ہے؟''
''اللہ پاک کا شکر ہے کہ کوئی مجھ سے ناراض نہیں ہوتا۔''

26۔ ''کسی کی ایک اچھی عادت جو آپ چاہتی ہیں کہ آپ میں آجائے؟''
''امی کی اچھی عادت ہے کہ سب کو معاف کر دیتی ہیں اور الحمدللہ یہ عادت مجھ میں بھی ہے۔''

27۔ ''زندگی میں کچھ واپس ملنے کا چانس ملے تو کیا واپس لینا چاہیں گی؟''
''اللہ نے سب کچھ دیا ہوا ہے۔ میرا ایک بیٹا دو سال کی عمر میں وفات پا گیا تھا۔ بہت دکھ اور تکلیف میں تھی مگر پھر اللہ نے بیٹے سے نواز دیا۔ تو بس اب کچھ نہیں۔''

28۔ ''گھر میں آپ کے فیصلے میں مداخلت کون کرتا ہے؟''
''کوئی نہیں...... میں اور میرے شوہر باہمی مشاورت سے سارے فیصلے کرتے ہیں۔''

29۔ ''بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتی ہیں؟'' ''ہاں بالکل...... کیونکہ مجھ پر بہت سارے لوگوں کی ذمہ داری ہے تو میں چاہتی ہوں کہ میں بیمار

نہ ہوں، جلدی ٹھیک ہو جاؤں۔

30۔ ”اس فیلڈ میں کیا کیا کر چکی ہیں؟“

”نعت خوانی، میزبانی پروگراموں کی اور رمضان ٹرانسمیشن کی، سحری کی نشریات ”میٹرو ون نیوز“ سے ہوسٹ کیں اور کالج کے زمانے میں گلوکاری بھی کرتی تھی اور مقابلوں میں حصہ بھی لیا کرتی تھی۔“

31۔ ”کس طرح کے پروگرام کرنے کی خواہش ہے؟“

”میری خواہش ہے کہ ہمارے یہاں کچھ ایسے چینل بھی ہوں جو صرف دینی پروگرام کریں۔ مذہب سے آگاہی ہو۔ اور حکومتی سطح پر اسے رہنمائی حاصل ہو۔ صرف رمضان المبارک میں ہی دینی پروگرام نہ ہوں۔“

32۔ ”کبھی اداکاری کرنے کو دل چاہا؟“

”نہیں، اداکاری کرنے کا کبھی دل نہیں چاہا۔“

33۔ ”کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟“

”الحمدللہ ابھی تک ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کی عادی ہوں۔“

34۔ ”کچن سے لگاؤ...... کبھی شیف بننے کا خیال آیا؟“

”کچن سے لگاؤ ہے اپنے گھر والوں کے لیے اپنے بچوں کے لیے پکانا مجھے بہت پسند ہے۔ اور شیف بننے کی کبھی خواہش نہیں ہوئی۔“

35۔ ”گھر میں کس کی بات کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے؟“

”گھر میں میری بات کو اہمیت دی جاتی ہے کیونکہ میں گھر میں بڑی ہوں تو امی ابو بہت اہمیت دیتے ہیں اور میرے میاں صاحب بھی میری بات کو اہمیت دیتے ہیں۔“

36۔ ”کس شخصیت پر چاہتے ہوئے بھی غصہ نہیں کر سکتیں؟“

”اپنے بچوں پر...... کیونکہ مجھے اپنے بچوں سے بہت محبت ہے۔“

37۔ ”میٹھے اور نمکین کھانوں میں کیا پسند ہے؟“

”میٹھا مجھے ہمیشہ سے پسند ہے مگر کم مقدار میں اور کبھی کبھی۔“

38۔ ”کس تہوار کا انتظار رہتا ہے؟“

”عید کا انتظار ہوتا ہے اور ربیع الاول کا...... ربیع الاول میں ہر جگہ ایک خوشی کا تاثر ہوتا ہے۔ اس ماہ میں ہمارے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تھے۔“

39۔ ”ملک کی ترقی کی راہ میں کون رکاوٹ ہے عوام یا حکمران؟“

”ہم سب خود ہی ہیں۔ پورا معاشرہ خواہ وہ عوام ہوں یا حکمران۔ ہم سب ہی نہیں چاہتے شاید کہ ہمارا ملک ترقی کرے۔“

40۔ ”کبھی غربت میں وقت گزارا؟“

”نہیں...... الحمدللہ لیکن کووڈ کے وقت پریشانی ضرور آئی جو کہ سب کو ہی آئی ہوگی۔ بلکہ پوری دنیا پریشان ہو گئی تھی۔“

41۔ ”بریانی میں بوٹی نہ ملے تو؟“

”کوئی بات نہیں...... مجھے آلو بھی پسند ہے۔“

42۔ ”طالب علمی کے زمانے میں کون سا مضمون برا لگتا تھا؟“

”فزکس مشکل لگتا تھا مگر برا نہیں لگتا تھا۔“

43۔ ”ڈاکٹر، حکیم، ہومیو پیتھک کس پر یقین ہے؟“

”مجھے ہومیو پیتھک علاج پر زیادہ یقین ہے کوشش کرتی ہوں کہ اینٹی بائیوٹک کا استعمال کم کروں۔“

44۔ ”دنیا کا سب سے بورنگ کام؟“

”کسی کا انتظار کرنا بہت برا لگتا ہے۔“

45۔ ”کیا دل سے اترا ہوا شخص پہلے جیسا مقام حاصل کر سکتا ہے؟“

”نہیں بالکل نہیں، پہلے جیسا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔“

46۔ ”رینگنے والے کیڑوں مکوڑوں میں کس

سے ڈر لگتا ہے؟"

"لال بیگ اور چھپکلی سے ڈر لگتا ہے۔"

47۔ "ملک کے لیے کون سا نظام حکومت بہتر ہے؟"

"اسلامی نظام حکومت ہی بہتر رہے گا۔"

48۔ "گھر کا کون سا کام کرنا پسند نہیں ہے؟"

"ایسا کوئی کام نہیں ہے۔ میں اپنے گھر کا ہر کام بہت شوق سے کرتی ہوں۔"

49۔ "غصے میں منہ سے کیا نکلتا ہے؟"

"کچھ بھی نکل جاتا ہے۔ پتا نہیں چلتا۔ زیادہ تر بچوں کو ہی ڈانٹ پڑ رہی ہوتی ہے۔"

50۔ "ٹی وی ٹاک شو کے بہترین اینکر؟"

"معین اختر کے علاوہ مجھے کوئی اچھا لگا نہیں۔ ہاں خواتین میں مجھے شائستہ لودھی اچھی لگتی ہیں کیونکہ وہ بہت اچھے طریقے سے پروگرام کرتی ہیں۔"

51۔ "آپ کا راز دار کون ہے؟"

"کوئی ایسا راز ہے ہی نہیں کہ کسی کو راز دار بنانا پڑے۔ بس اللہ ہی میرا راز دار ہے۔"

52۔ "فیملی یا خاندان کے کسی فرد سے کوئی شکایت؟"

"نہیں، کسی سے کوئی شکایت نہیں، سب میرا بہت اچھے سے خیال رکھتے ہیں، مجھ سے محبت کرتے ہیں۔"

53۔ "کون سی تاریخیں یاد رکھتی ہیں؟"

"بہن بھائیوں اور اپنے بچوں کی سالگرہ، امی ابو کی اینورسری یاد رکھتی ہوں۔"

54۔ "ایک کھانا جو اینی ٹائم کھایا جا سکتا ہے؟"

"بریانی ...... اور اسے باآسانی ادھر سے ادھر بھی لے جا سکتے ہیں۔"

55۔ "کیا اپنا پروگرام بار بار دیکھتی ہیں؟"

"جی بالکل تا کہ اپنی غلطیاں پتا چل جائیں اور انہیں درست کیا جا سکے۔"

56۔ "گھر میں کون پڑھا کو تھا؟"

"میرے ننھیال میں ماشاء اللہ سب پڑھاکو ہیں۔ سب نے ماشاء اللہ دو، دو تین، تین ماسٹرز کیے ہوئے ہیں۔"

57۔ "ایک غلطی جس پر کبھی معافی نہیں مانگی؟"

"جانے دیں۔"

58۔ "مشکل میں کس کو کال کرتی ہیں۔"

"اپنے ممی پاپا کو کال کرتی ہوں کیونکہ وہ سنتے بھی ہیں اور مسئلہ کا حل بھی بتاتے ہیں۔"

59۔ "اگر آپ کے اختیار میں ہوتا تو کون سے کھانے پر پابندی لگا دیتیں؟"

"اگر اختیار ہوتا تو جنکس فوڈ پر پابندی لگا دیتی۔ کیونکہ اس کو کھانے کے بعد بچے گھر کا کھانا نہیں کھاتے۔"

60۔ "گھر میں کون بی بی سی ہے؟"

"نہیں کوئی نہیں ہے۔"

61۔ "کن چیزوں پر زیادہ خرچ کرتی ہیں؟"

"نہیں، میں فضول خرچ نہیں ہوں۔"

62۔ "کس اینکر کے ساتھ پروگرام کرنے کی خواہش ہے؟"

"ایسا کوئی نہیں ہے۔"

63۔ "کس سیاست دان کا انٹرویو کرنا چاہتی ہیں؟" "نہیں جی ...... کسی سیاست داں کا انٹرویو نہیں کرنا چاہتی۔"

64۔ "گھر میں بچت کی عادت کس کو ہے؟"

"امی کو تھی اور انہیں دیکھ کر اب مجھ میں بھی یہ عادت آ گئی ہے۔"

65۔ "علم نجوم پر یقین؟/کبھی ہاتھ دکھایا؟"

"یقین ہے ہی نہیں، اسی لیے کسی کو ہاتھ بھی نہیں دکھایا۔"

66۔ "کب جھوٹ کا سہارا لیتی ہیں؟"

"جھوٹ کا سہارا تب لیتی ہوں جب مجھے لگتا ہے کہ سچ بولنے سے کسی کا دل نہ دکھ جائے۔ یا لڑائی

نہ ہو جائے۔

67۔ "تقریب میں جانے کے لیے کس کی مرضی سے تیار ہوتی ہیں؟"

"اپنی ہی مرضی سے تیار ہوتی ہوں۔"

68۔ "ادھار کس سے بلا جھجک مانگ لیتی ہیں؟"

"کسی سے مانگنا اچھا نہیں لگتا۔ سوائے امی ابو کے ان سے ہی بلا جھجک مانگ لیتی ہوں۔"

69۔ "کس کے روٹھ جانے پر ناراض ہو جاتی ہیں؟"

"امی ابو جب تھوڑا ناراض ہوتے ہیں تو میں پریشان ہو جاتی ہوں۔ بتاتی نہیں ان کو کہ پھر وہ بھی پریشان ہو جائیں گے۔"

70۔ "پسندیدہ موسم؟"

"بہار۔"

71۔ "گھر میں کس کی زبان کو بریک لگانا مشکل ہے؟"

"گھر میں بچوں کی زبان کو بریک لگانا مشکل ہوتا ہے۔"

72۔ "خواتین رائٹرز میں آپ کی پسندیدہ رائٹر؟"

"اگرچہ زیادہ پڑھنے کا وقت نہیں ملتا۔ مگر پھر بھی مجھے عمیرہ احمد بہت پسند ہیں۔"

73۔ "آپ کے گھر میں کون حاتم طائی ہے؟"

"کوئی نہیں، سب سوچ سمجھ کر ہی خرچ کرتے ہیں۔ کیونکہ آج کل اتنی زیادہ مہنگائی ہے کہ سب دیکھ بھال کر خرچ کرتے ہیں۔"

74۔ "شاپنگ کے لیے نکلتے وقت سب سے پہلے کس کا خیال آتا ہے؟"

"سب سے پہلے بچوں کی شاپنگ کرتی ہوں۔"

75۔ "اپنی تعریف سن کر کیسا لگتا ہے؟"

"سب کو اچھا لگتا ہے۔ اور میں کوشش کرتی ہوں کہ مزید اچھا کروں۔ تنقید سے اپنے آپ کو سدھارنے کا موقع ملتا ہے۔"

76۔ "کبھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنیں؟"

"نہیں نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

77۔ "کبھی لائیو پروگرام میں بھنڈ ہوا؟"

"ہو جاتے ہیں مگر شکر ہے کہ مجھ سے کبھی نہیں ہوا۔"

78۔ "کس طرح کے کام کرنے مشکل لگتے ہیں؟"

"جو لوگ وقت کی پابندی نہیں کرتے ان کے ساتھ کام کرنا مجھے مشکل لگتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی محفل میں چھ بجے بلایا جاتا ہے میں تو پہنچ جاتی ہوں مگر مہمان آٹھ بجے آتے ہیں۔ تب بہت مشکل ہو جاتی ہے میرے لیے۔"

79۔ "یوٹیوب کا آپ کا پسندیدہ چینل؟"

"میں زیادہ یوٹیوب استعمال نہیں کرتی۔"

80۔ "کیا آپ کے اندر بھی ایک ولن ہے؟"

"نہیں جی...... کوئی ولن نہیں۔"

81۔ "آپ کے بچوں میں آپ کے جراثیم ہیں؟"

"جی ہاں بچے بھی نعت پڑھتے ہیں۔"

82۔ "بچت کس شکل میں کرتی ہیں؟"

"کیش کی شکل میں۔"

83۔ "شادی میں کن رسموں کے خلاف ہیں؟"

"شادی میں فضول خرچی کے خلاف ہوں۔"

84۔ "کونسا کھانا زہر مار کر کے کھاتی ہیں؟"

"سب کچھ کھا لیتی ہوں۔ اللہ پاک کا شکر ہے۔"

85۔ "آپ کے موبائل میں صبح سویرے پہلا میسج کس کا ہوتا ہے؟"

"امی کا ہوتا ہے۔"

86۔ "کس چینل پر ریموٹ رک جاتا ہے؟"

"زیادہ ٹی وی نہیں دیکھتی میں۔"

87۔ "فیملی میں کون مزاج کا گرم ہے؟"

"ابو۔"

88۔ "آپ کی کس بات پر آپ کے

گھر والے، والدین ناراض ہو جاتے ہیں؟"
"شکر الحمدللہ کبھی بھی ناراض نہیں ہوتے۔"

89۔ "بچپن کا کون سا خواب پورا نہیں ہوا؟"
"بچپن کا تو نہیں البتہ جوانی کا ایک خواب ہے کہ میں اپنے ابو، امی کے ساتھ عمرہ پر جانا چاہتی ہوں۔"

90۔ "پسندیدہ تہوار؟"
"عید اور ربیع الاول کا مہینہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

91 "جانوروں میں پسندیدہ جانور؟"
"کوئی نہیں۔"

92۔ "کن باتوں سے موڈ خراب ہو جاتا ہے؟"
"کوئی جان بوجھ کر جھوٹ بول رہا ہو یا کسی معاملے میں دھوکا دہی کر رہا ہو کسی سے اور مجھے پتا ہو تو پھر موڈ خراب ہونا لازمی ہے۔"

93۔ "کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟"
"نشے کی حد تک تو نہیں مگر کافی حد تک چائے اور کافی۔"

94۔ "مہینے میں کتنی بار گھر سے باہر کھانا کھاتی ہیں؟"
"ایک بار ہی مشکل سے کھاتے ہیں۔ گھر کا کھانا پسند ہے۔"

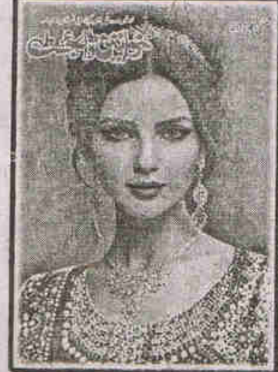
95۔ "کیا چیز لیے بغیر گھر سے نہیں نکلیں؟"
"موبائل اور پیسے لیے بغیر نہیں نکلتی۔"

96۔ "کھانا کہاں کھانا پسند ہے؟ چٹائی، ڈائننگ ٹیبل یا بیڈ؟"
"ڈائننگ ٹیبل پہ کھانا کھانا اچھا لگتا ہے۔"

97۔ "گھر میں کس کے لیے اپنا شیڈول بدل سکتی ہیں؟"
"بچوں کے لیے۔"

98۔ "آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟"
"تو کوئی بات نہیں، ہر عروج کو زوال ہے۔"

☆☆



نامہ خواتین

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37۔اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

ناہید اسماعیل...... کراچی

پہلے اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے کئی ماہ خط نہ لکھ سکے پھر اچانک امی کو فالج کا اٹیک ہوا اور ڈیڑھ ماہ کی علالت کے بعد ہماری پیاری ماں ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئیں، کوئی دوا کوئی دعا کارگر نہ ہو سکی اس عظیم نعمت سے ہم محروم ہو گئے۔ جینے کی امنگ ہی ختم ہو گئی ہے۔ 2007 میں ابو کا انتقال ہوا اس صدمے کو سہنا ہم بہن بھائیوں کے لیے جیسے ناممکن تھا۔ اس کٹھن وقت سے اب تک امی ایک مضبوط سائبان کی مانند ہم پر سایہ فگن رہیں مگر اب وہ سہارا بھی نہیں رہا، موت برحق ہے لیکن کریں، صبر نہیں آرہا۔ اللہ ہمیں صبر دے، ہماری امی کے لیے دعا کیجیے گا۔

اس بار ایک شکوے کے ساتھ حاضر ہوئے ہیں وہ یہ کہ پچھلے ماہ ہم نے اپنے خط میں اپنی امی کے انتقال کی اطلاع دی کی آپ سے دلجوئی کی امید تھی لیکن آپ نے دلجوئی کے بجائے ہمارا خط اور تبصرہ تک شامل نہیں کیا، یہ طبیعت خرابی کی وجہ سے ہم نے کئی ماہ بعد شرکت کی تھی۔ دل پہلے ہی بہت اداس تھا اپنا خط نہ دیکھ کر اور اداس ہو گیا۔ شکووں کے بعد اب کچھ تبصرہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کرن کرن روشنی بلاشبہ ایک منفرد سلسلہ جو ہر ماہ مفید و حقیقی معلومات کا خزانہ ہماری دسترس میں دے جاتا ہے۔ پیارے انشا جی آپ نے سو فیصد درست کہا ہم لوگ واقعی ظلمت میں جی رہے ہیں۔

"انگنا پھول کھلیں گے" مزید دلچسپ ہو گیا ہے نتاشا اور ثانیہ کا مقابلہ زوردار ہوتا نظر آرہا ہے ادھر فرخ اب کون سا گل کھلانے چلا ہے۔

"بالا" لگتا ہے انتقام کی جانب رواں دواں ہے کہ نگینہ سرکار تو اپنے انجام کو پہنچ گئی، اسے اپنے گناہوں کا احساس و پچھتاوا تو ہونا نہیں تھا لیکن کم از کم آخری وقت کی اذیت اور تکلیف تو لازمی دکھانی چاہیے تھی، اسے تو سسک سسک کر مرتے دکھانا تھا نا، پر وہ تو ایک دم سے مر گئی۔

صوفیہ بٹ نے ناول کو مزید کرداروں کے ساتھ ایک نیا موڑ دیا ہے، یقیناً ماضی اور حال کے سنگم پر جب یہ کردار ملیں گے تو کہانی کے بھید مزید کھلیں گے بلاشبہ صوفیہ نے کمال کر دکھایا ہے۔ "ایک خواب تھا"، فیضی اپنے والدین کی طرح خود غرض اور مطلبی انسان تھا بلی کے لیے تو حاشر ہی موزوں ترین تھا اسی کی طرح سادہ اور مخلص، دوسری طرف گزرے دور کے مخصوص رکھ رکھاؤ اور روایتی طور طریقے والے دادا دادی کے مزیدار کردار، اب یہ خالص پن کہاں؟ دل ڈھونڈتا ہے ایسے کرداروں کو۔

"اک محبت کی جستجو" خوب صورت تحریر تھی، بعض اوقات زندگی کی محرومیاں بھی انسان کو وہ سبق دیتی ہیں جو جگنو نے سیکھا۔ صائمہ نور تمام کرداروں کو بخوبی نبھانے میں کامیاب رہیں خصوصاً چاند کا کردار بہت پاورفل تھا۔

افسانوں کی فہرست میں اول آیا "عید پارلر" جی جناب! عارفہ فضل شاہ نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ اس مسئلے کا حل بتایا۔ "کا کی" میں خالہ ساجدہ اچھی خاصی قصوروار ہوتے ہوئے بھی خود کو مظلوم سمجھ رہی تھیں۔ "وریشہ کی عید" نے اپنے نصیب پر صبر وشکر اور قناعت کا سبق سکھلایا۔ فرزانہ کھرل کہاں غائب ہیں اور پلیز آپی سمیرا حمید کی خیریت ضرور بتادیں، بہت عرصہ ہوگیا کچھ پتا ہی نہیں چل رہا ان کا۔

سلمٰی یاسمین نجمی کا انٹرویو اچھا دلچسپ رہا۔ اور اس سے پہلے ہماری پیاری نگہت سیما کا انٹرویو بہترین تھا وہ اپنی تحریروں کی طرح بے مثال ہیں۔ سروے زبردست رہا فرخندہ سلیم کے جوابات نے چار چاند لگادیے۔ بہنوں کی محفل میں تمام بہنوں کے تبصرے لاجواب، فرخندہ سلیم اور صدف ناصر ٹاپ پر ہیں، عروج عباسی کی کمی محسوس ہوئی آپی اس بار تو آپ میرا پیغام صدف اور عروج عباس کو ضرور پہنچادیں کہ یہ دونوں میری پیاری دوستیں جب چاہیں میرا نمبر ڈائجسٹ کے دفتر سے لے کر مجھ سے رابطہ کرسکتی ہیں۔ عدنان بھیا کے مشورے مناسب ترین اور مخلصانہ۔

پیاری ناہید......! آپ کی والدہ کی وفات کا جان کر بہت افسوس ہوا۔

ماں باپ جیسی ہستیوں کا سایہ سر سے اٹھ جانا بہت بڑا صدمہ ہے نہ ماں باپ کا کوئی نعم البدل ہوسکتا ہے نہ اس غم کا کوئی مداوا ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر دے اور آپ کی مرحومہ والدہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ قارئین سے بھی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

پرچا عید سے پہلے آنا تھا اس لیے اس بار جلد پریس چلا گیا اور آپ کا خط شامل نہ ہوسکا۔

عزیز بہن ایسا کیسے ہوسکتا تھا کہ ہم آپ کی والدہ کی تعزیت نہ کرتے۔ ان کی مغفرت کی دعا نہ کرتے۔

آپ کا تبصرہ تو ہمیشہ ہی بہت اچھا ہوتا ہے، پچھلے ماہ اور اس ماہ کا تبصرہ دونوں ہی مفصل اور جامع ہے۔ فرزانہ کھرل کا ناول آئندہ ماہ سے شامل ہوگا۔

سمیرا حمید کی طرف سے تو ہمیں بھی تشویش ہے آپ ان کی صحت کے لیے دعا کریں۔

سعدیہ مصطفیٰ......مڑہ بھنگوال

عجیب کشمکش کا شکار تھی میں، کہ کیا ہوگا؟ پتا نہیں کیسے ہوگا؟ لیکن پھر یہ ہوا "سب" ہوگیا اور پتا بھی نہیں چلا۔ میں نے اعتکاف کیا، بہت اچھا لگا۔

حیرت ہوتی ہے، مجھے کہ لوگ "عیدیں" سوتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔ اتنی مشکل سے روزے رکھتے ہیں، نمازیں ادا کیں، عبادتیں کیں، تراویح پڑھی، دس چکر بازار کے لگا کر شاپنگ مکمل کی۔ اور بعد میں "عید" سو کر گزار دی۔ کوئی اچھی بات تو یہ نہیں ہے ناں۔

عید تو نام ہی خوش رہنے کا اور خوشیاں بانٹنے کا ہے۔ مزے کی بات بتاؤں، اس عید پر میرے بابا میرے لیے پھولوں کے گجرے لائے۔ واؤ۔

او کے او کے اب ہم "تبصروں" کی جانب آتے ہیں۔

"کہی ان کہی" میں بہت اچھی باتیں لکھی تھیں۔ "کرن کرن کی روشنی" کچھ دن پہلے اعتکاف کے ایام میں سوچا کہ "رمضان کی تو سمجھ میں آتی ہے کہ یہ مہینہ "عبادتوں" کا ہے۔ مطلب اس مہینے عبادتوں کا ثواب ستر گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔ رمضان المبارک کی فضیلت سمجھ میں آگئی غور کرنے پر کہ یہ مہینہ پرہیزگاری، تقویٰ اور نفسانی خواہشات پر قابو پانے کی، صبر اور حوصلہ، قوت برداشت جیسی صلاحیتیں جنم دیتا ہے۔ لیکن عید کے دن کو "عید" کا نام کیوں دیا۔ لیکن "کرن کرن روشنی" میں اس چیز کی وضاحت بہت اچھے سے کی گئی۔ نبیوں کی عیدوں کے بارے میں پڑھا تو اندازہ ہوا۔ مسلمانوں کی عید سب سے زیادہ افضل ہے۔

"روشنیوں کا سفر" میں۔ مجھے مکمل اندھیرا لگا۔

بھی میرا سروے ہی اس میں شامل نہیں تھا۔ ناراض نہیں ہوں آپ سے، لیکن یہ اچھی بات بھی تو نہیں ناں اتنی ٹف اور مصروف زندگی میں بہت تھوڑا مگر بہت قیمتی وقت نکال کر اتنا تفصیلی اور خوب صورت سروے کے جوابات بھیجے، خط بھیجا، افسانہ (آخری خط) بھیجا مگر ایک بھی چیز نہیں لگائی آپ نے، اچھی عیدی دی آپ نے مجھے ویسے۔ "باتیں عائشہ کامران" سے آخری دو سطور پڑھ کر مسکرا اٹھے۔

"سلمیٰ یاسمین جی" بہت اچھی باتیں تھیں ان کی، ان کا ماحول، رکھ رکھاؤ، اولاد پر قابو بلاشبہ قابل رشک تھا۔ آج کل کے جدید دور میں بھلا کہاں ملتے ہیں ایسے ماحول کے گھرانے۔ ما شاء اللہ۔ امی جان میری خود کہتی ہیں کہ "اولاد کو کھلاؤ سونے کا نوالہ لیکن دیکھو شیر کی نگاہ سے۔" بات صرف تربیت کی ہے۔ میری امی جان کی تربیت ہی ایسی ہے اب "ہمارے خط" کیا کیا لکھوں؟ جب میرا خط شائع ہی نہیں ہوا۔ لیکن نہیں سعدیہ "زندگی ہماری ذات تک تھوڑی محدود ہے" اس میں ہم سے ہٹ کر بھی کردار وابستہ ہوتے ہیں۔ "صدف ناصر" کا "مالا" کا سمجھ میں نہ آنے کے باوجود پڑھنا اچھا لگا۔ کیونکہ اچھا رائیٹر وہی ہوتا ہے جس کی کہانی اس کے قاری کو اس کے ساتھ جوڑے رکھے۔"

"نعیمہ ناز" نے بہت جگہوں پر مسکرانے پر مجبور کیا۔ جیسے "جو رات کو سالن نہیں کھائے گا وہی سالن اس کو صبح کے پراٹھوں میں ملے گا۔" اوئے ہوئے۔ موئے موئے۔ "عید پارلر" عارفہ تم نے ویسے کمال کا افسانہ لکھا ہے۔ فری نیس واہ جی، دیکھئے گا قارئین کہ اپریل کے شمارے میں بیسٹ افسانہ "عید پارلر" ہی تھا۔ "سفید موتیوں کی مالا" تھوڑا تھوڑا دکھی کر دیا۔ مشال تمہارا اپنا ہی انتخاب ہی تمہیں بار بار ہرٹ کرتا ہے۔ افففف ناول کی جان، "مالا" "نگینہ مر گئی، اور اتنے برے انجام کے ساتھ، توبہ توبہ چلیں مالا نے ماہر پر بھروسا تو کیا، اور اب بدر کا قصہ کیا ہے یار۔

عدنان بھائی کے مشورے آل ٹائم بہت کارآمد تھے۔

"وریشہ کی عید" میں زارا انجم انے اچھا سبق دیا کہ "جتنی چادر ہو پاؤں بھی اتنے ہی پھیلائیں۔" زارا کا تعلق کہاں سے ہے؟؟ کیا آپ بتا سکتی ہیں؟؟ "کا کی" مصنفہ کا نام کتنا اچھا ہے۔ جیسے 196 صفحہ پر غزل شاعر "اتباف ابرک" منفرد سا نام تھا۔ اسٹوری اچھی تھی "کا کی" مولانا جلال الدین رومی کہتے ہیں کہ "تمہاری اصل ہستی تمہاری سوچ ہے باقی تو فقط ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے۔"

الغرض خواتین ماہ اپریل ہر لحاظ سے مکمل تھا۔

پیاری سعدیہ! آپ کا افسانہ آخری خط ہم نے پڑھ لیا ہے۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ تحریر میں روانی ہے۔ الفاظ کا ذخیرہ بھی بہت اچھا ہے لیکن آپ کے افسانے میں "کہانی" نہیں ہے۔ یہ ایک اصلاحی نصیحت بھری تقریر ہے جبکہ فکشن میں مصنف نہیں کردار بولتے ہیں۔ آپ مزید کوشش کریں اور کہانی پر توجہ دیں۔ ہمارا پرچا فکشن کا پرچا ہے۔ اس میں جس طرح کی کہانیاں شائع ہوتی ہیں، اسی طرح کی کہانی لکھیں۔

طیبہ شوکت...... مرید کے

ٹائٹل گرل اس قدر زبردست کہ کیا تعریف کروں بس جی دل خوش ہو گیا دیکھ کر۔ حمد و نعت ہمیشہ کی طرح پرفیکٹ، "انگنا پھول" میں ثانیہ کا بدلا بدلا روپ اچھا لگا۔ (پہلی مرتبہ) دیکھنا تماشا کیسے ٹکتی کا ناچ نچاتی ہے سب کو "مالا" اس قدر اس قدر کس قدر بتاؤں میں کہ مجھے کہانی کیسی لگی ہے اس قدر کمال کی قسط تھی مجھے لگتا ہے کہ بدر مالا کا بیٹا ہے۔ جو بلال کو بچائے گا آئی لو ماہر۔

"احد" تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں سو پرسے اور پر صوفیہ جی نے ہماری مشکل حل کر دی اس لیے بہت شکریہ وضاحت کر کے اس ماہ کے ڈائجسٹ میں کسی قاری نے کہا تھا خط میں کہ عبدالہادی امر ہے اگر عبدالہادی امر ہے تو عبدالواحد کون ہے کیوں کہ کہانی میں تو وہ عبدالہادی کا بھائی

[illegible] ہے [illegible] نہیں اگر ایسا ہے
بھی تو وہ عبدالہادی (امر) کو کیوں کہتی کہ مجھے سچ بتاؤ۔ کبھی مجھے لگتا ہے کہ عبدالہادی اسود ہے۔ اور وہ جو کہتا کہ میں اسے پوری دنیا کے سامنے بدنام نہیں کرنا چاہتا وہ احمل ہے کیونکہ احمل اسود کے پاس ہی تو گئی تھی۔ ''ایک خواب تھا۔'' نعیمہ ناز کا اچھا لگا ''اک محبت کی جستجو'' مکمل کہانیوں میں ٹاپ آف دی لسٹ کیا کمال کا ناول ہے۔ سلمیٰ یاسمین سے ملاقات اچھی لگی، عائشہ کامران سے مل کے اچھا لگا غزلوں میں صبا اکبر آبادی کی غزل بہت بہت پسند آئی تھی۔ اور وہ جو آپ نے صفحہ نمبر 27 پر اعتزار کے نام سے باکس میں کچھ لکھا تھا وہ کسی قاری نے غلطیاں نکالی تھیں کہ آپ نے خود نکال کے بتایا تھا۔ افسانے سب ہی اچھے تھے۔ عدنان بھائی کے مشورے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔

ج:۔ پیاری طیبہ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کو سالگرہ نمبر پسند آیا۔ ہماری محنت وصول ہوگئی۔

''اعتذار'' میں جو تصحیح کی گئی ہے۔ وہ بہن سلمیٰ یاسمین نجمی نے کی ہے۔ جو پچھلے ماہ ان کے انٹرویو میں غلطیاں تھیں۔ سہواً ہم ان کا نام لکھنا بھول گئے۔ اس شمارے میں اس کی تصحیح کی جارہی ہے۔

احد کے بارے میں آپ نے جو سوالات کیے ہیں۔ ان کا جواب صوفیہ بٹ دیں گی۔ تھوڑا سا انتظار کریں۔

نصرت جبیں ملک......ای میل

ماہ اپریل کا خواتین گرمی اور سردی کے سنگم پر ملا بارشوں کی وجہ سے سردی نے پھر دستک دے دی سو موسم اچھا ہونے کی وجہ سے عید بھی اچھی گزری۔ ''کہنی سُنی'' سے ہوتے ہوئے'' کرن کرن روشنی'' سے فیض یاب ہوئے اس کے بعد روشنیوں کا سفر مزے لے کر پڑھا، ایسے سلسلے ہر شمارے میں ہونے چاہئیں۔

عائشہ کامران سے ملاقات سے فراغت پائی تو [illegible] ی یاسمین بجی کے پاس ٹھہراؤ گیا، وہ شاید موجودہ دور اور حالات سے مطمئن نہیں رہیں تب ہی وہ اپنے دور اور آج کے دور کا موازنہ کرتی نظر آئیں مگر ہر دور کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔

ہمارے بزرگ بھی کہتے ہیں کہ ان کے دور کے حالات ہمارے دور سے زیادہ اچھے تھے مگر سچ یہ ہے کہ ہر دور میں اپنی اقدار اور ثقافت کو برقرار رکھنے کے راستے خود متعین کرنے پڑتے ہیں۔ مزید آگے بڑھے تو ''ہمارے نام'' میں اپنا نام تلاش کرنے لگے، جلد ہی وہ مل گیا اور خوشی محسوس ہوئی، آپی آپ کو یہ نام اب ہر ماہ کے شمارے میں بمعہ تبصرہ برداشت کرنا ہوگا۔

''کاکی'' ہلکی پھلکی سی کہانی تھی مگر شکر ہے آخر میں کاکی کو اپنا مقام مل ہی گیا، عارفہ فضل عید پارلر میں ہمارا بھی ایک مسئلہ حل کر گئیں اور وہ یہ کہ گرمیوں میں میرے پاؤں بہت روکھے ہو جاتے تھے، واقعی بند جوتے میں پانی اور سرف کی شپ شپ کام کر گئی اور پاؤں بہت نرم و ملائم ہو گئے، صائمہ نور نے ناول ''ایک محبت کی جستجو میں'' شروع میں تو الجھایا مگر آگے جا کر کہانی کو بہت اچھے طریقے سے انجام تک پہنچایا۔

باقی شمارہ پڑھنے کے مراحل سے گزر رہا ہے بھئی ہر بندے کے کچھ پرنسل اصول بھی ہوتے ہیں اور ہمارا اصول یہ ہے کہ مٹھائی کا ڈبہ ملے اور آپ ایک دم سے تمام چٹ نہ کر جائیں بلکہ تھوڑا تھوڑا مسلسل منہ میٹھا کرتے رہنا چاہیے جب تک کہ اگلا (شمارہ) ہاتھ میں نہ آجائے۔

پیاری نصرت! آپ ہر ماہ شرکت کریں۔ ہمارے سر آنکھوں پر۔ ہمیں تو انتظار رہتا ہے کہ بہنیں ہمیں خط لکھیں یا ای میل کریں تاکہ ہم ان کی رائے جان سکیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

مصباح نذیر......غریب وال

اپریل کا شمارہ ہاتھ میں آیا تو کمرے میں رکھنے

تو اپنے نام پر نظر پڑتے ہی وہیں سے واپس مڑ گئے اور لگے سب کو پڑھانے۔ بس پھر کیا تھا واٹس ایپ پر اسٹیٹس بھی لگا دیا گیا۔ مجازی خدا اطہر صاحب نے مسکرا کر کہا" کتنی چھوٹی چھوٹی سی خوشیاں ہیں آپ کی۔" کتنے ہی لوگوں کے میسج آئے کہ آپ کا اسٹیٹس دیکھ کر ہمیں بھی پرانے سنہری زمانے یاد آ گئے۔ واقعی گزرا زمانہ کتنا یاد آتا ہے۔ ہماری خوشی کو دیکھ کر نوشین (کزن + دیورانی) نے مٹھائی کی فرمائش کر دی۔ سلمیٰ (بہن) نے فوراً طعنہ دے مارا کہ بہن کو فون کرنے کا وقت نہیں ملتا اور رسالے کو خط لکھنے کا مل جاتا ہے؟ اسپیشل نام نجمہ (کزن + بڑی نند) کا لکھنا ہے جو ہماری شادی سے پہلے پرچے منگوانے کی انچارج تھی اور ہم اس سے بڑا ڈرتے تھے۔ آج ہم انچارج ہیں اور وہ بے چاری پردیس میں ہماری منتظر کہ کب بھیجیں گے۔

اب کچھ پرچوں کی بات ہو جائے۔ کیا ہی بات ہے کہنی سنی سے لے کر احادیث اور قرآن۔ تاریخ سے لے کر ٹوٹکے اور ٹپس، نفسیاتی علاج اور ہر طرح کی تربیت سے معمور کہانیوں تک لاجواب۔ میں کہتی ہوں جو باتیں ماں باپ یا کوئی اور نہیں سکھا سکتا (کسی بھی وجہ سے) وہ باتیں یہ بڑے سادہ اور عام فہم پیرائے میں سمجھا دیتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک کہانی اور سبق آموز۔ بس آج کل "امت الاحد" کو پڑھ کر لگتا ہے جیسے کہانی بدل گئی ہے؟

یہ بتا دیں کہ مختلف سلسلے ایک ہی لفافے میں بھیجے جا سکتے ہیں؟

ج:۔ پیاری مصباح اپنا نام دیکھ کر آپ کو آپ کی بہن اور دیورانی کو جتنی خوشی ہوئی۔ آپ کا خط پا کر ہم بھی اتنے ہی خوش ہوتے ہیں۔

امت الاحد کی کہانی بدلی نہیں ہے یہ کردار آپ کے سامنے کہانی کے تیسرے حصے میں سامنے آئیں گے، تب آپ ان سے مل کر حیران رہ جائیں گے۔ دراصل قسط وار کہانیوں میں یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ قاری اس کے سامنے صورت حال پوری طرح واضح نہیں ہو پاتی۔ آپ تھوڑا انتظار کر لیں، اب اس ناول کی چند ہی اقساط باقی ہیں۔

گوشی جمال..... منڈی یزمان

واقعات اس بار کچھ یوں رونما ہوئے حیرت میں مبتلا کر گئے کچھ شمارے کے انتظار کی کوفت، بھئی کوفت کچھ یوں کہ پچھلے شمارے میں تذکرہ تھا شمارہ عید سے پہلے آئے گا۔ ادارہ نے اپنا وعدہ نبھایا لیکن ہمارے اخبار فروش کی لاپروائی کہ عید سے ایک دن پہلے چاند رات شروع ہونے سے چند گھنٹے پہلے، چند گھنٹے اس لیے بولا کہ مولوی حضرات اکثر رات 12 بجے بھی بادلوں میں تیراکی کر کے چاند ڈھونڈ ہی لاتے ہیں۔

دکانداری اس وقت اللہ کے فضل و کرم سے عروج پر اور شمارہ بھی عید کا چاند نے میرے ہاتھوں کی زینت بنا۔ ڈبل نمبر تو تھا لیکن تھا ویسے ہی اسمارٹ، کچھ کھائی کر گول گیا سا نہ تھا اس لیے تو "سروے" باقی آئندہ کے ساتھ ملا۔ اسپیشل ایڈیشن کے لیے ہم 50 روپے اور برداشت کر سکتے ہیں۔ عید سروے پورا اسی ایڈیشن پہ ہونا چاہیے تھا۔ ہمارے شہر منڈی یزمان میں میری کوششوں سے 9 اپریل کو آیا۔ اب تو عید کی گہما گہمی اور پر سے عید کی چھٹیاں، عید پہ اتنی مصروفیت میں کہانی تو کوئی بھی پڑھی نہیں گئی البتہ مستقل سلسلوں سے فیض یابی حاصل کی، جب شمارہ موصول ہوا، گاہکوں کا رش، کسٹرڈ، کھیر مکس ررس ملائی + سویاں، سبز الائچیاں، کون مہندی اور نہ جانے کیا کیا فروخت کرتے گوشی کے ہاتھ تیزی سے مشغول اور ایک ہاتھ میری جانب بڑھا۔ فوراً ایک کراسے جھپٹا بھئی وہ خواتین ڈائجسٹ تھکن میں کمی کا باعث بنا۔ فوراً ورق گردانی شروع کی۔

"ایبہ گوشی" یہ رسالے بعد میں پڑھ لینا پہلے ہمیں نپٹا دو۔"

پچھ گاہوں جن میں خواتین کے واویلے ہڑبونگ، چیخ وپکار، کچھ نے تو مجھے کندھے سے ہلایا۔ اور میں مگن۔

کچھ دنوں سے جمال ہاؤس میں افسردگی کا عالم تھا۔ میں بھی دکھی، بے زار، کچھ اپنوں کی خود غرضی، ماں باپ کے بعد بڑے بھائی ماں باپ کا رول ادا کرتے ہیں لیکن یہاں کچھ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ سوائے واپڈا والے بھائی کے۔ بس فارمیلٹی کے رشتے۔

بڑے بھیا اسلم اور ان کی بیگم رمضان کے آخری عشرہ میں عمرہ کی سعادت حاصل کرنے جارہے تھے ہمیں بس دو دن پہلے بتانے آئے کہ ہم عمرہ پہ جارہے ہیں۔ بہت خوشی ہوئی لیکن جاتے ہوئے کدورتیں تو کیا دور کرتے مزید دکھ دے گئے۔

بھابھی صاحبہ عرصہ دراز چھ سال تو ہو گئے بھانجی زوباریہ سے ناراض تھیں، وجہ بس بچوں کی غلط فہمیوں سے پڑی لڑائی۔ ہر سال جمال ہاؤس عید پہ آتیں سوائے زوباریہ کے سب سے ملتیں۔ حد تو دیکھیے بھائی جان سب خواتین کو عید کے جوڑے دیے صرف ایک بیٹی کو اگنور۔ اس کے دل پہ کیا بیتی یاوہ جانتی یا اللہ۔

بارہا کوشش کی لیکن بھابھی نے بڑی ہونے کا فرض ادا نہ کیا۔ اس بار مجھے پکا یقین تھا کہ عمرہ پہ جارہے ہیں۔ سب سے معافی تلافی، دلوں کی کدورتیں مٹا کر جائیں گے، چاہے اوپر اوپر سے ہی گلے لگا لیتیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوا اور زوباریہ کھڑی نم آنکھوں سے سب کے عید کے جوڑے دیکھتی ان کی بے حسی پہ صبر کے گھونٹ بھر کر رہ گئی۔

میں نے خوشی خوشی رات کو گھر میں انٹری دی اور حیرانی تب ہوئی جب سب نے اپنے اپنے جوڑے دکھائے تو زوبی کا کملایا زرد چہرہ میرا دل چیر گیا اور کھانا کھاتے حلق میں لقمہ پھنس گیا، ایسی بھی کیا دشمنی جو ختم نہیں ہو رہی۔ بھابھی میں کدورت، کینہ اور بغض شروع سے ہے۔ اٹھارہ سال سے وہ تو تبدیل نہ ہوئیں البتہ بھائی کو اپنے طور طریقوں میں ڈھال کر جمال ہاؤس کی بیٹیوں سے دور کر دیا۔

میں نے فون کر کے بھیا اور بھابھی کی اس حرکت کی بابت پوچھا۔ صرف بھائی نے بات کی بھابھی پاس بیٹھی سنتی رہیں۔ بھائی کو ذرا پشیمانی نہ ہوئی اور بولے۔

"بس ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ سب کو راضی کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ہمیں جلدی تھی۔ کل ہماری فلائٹ ہے، دعا کرو ہم خیریت سے پہنچ جائیں۔"

یہ کہہ کر کال ڈسکنکٹ کر دی۔ فجر کی اذانیں ہر طرف گونجنے لگیں میں نے نم آنکھوں سے وضو کیا اور معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا۔ وہ ہی بہترین منصف ہے۔

یوں ہی شب قدر گزر گئی۔ دل غموں سے بوجھل تھے لیکن جمال ہاؤس کی خواتین کو اللہ نے ہمت حوصلہ اور صبر سے نوازا ہے۔

چاند رات کو شمارہ نے کچھ خوشی کا تاثر دیا، اس لیے تو دکان میں مصروفیت کے باوجود لپک کر شمارہ پکڑا، افسردگی کے بادل کم ہوئے۔ عید کے دن آپس میں گلے مل کر حقیقی خوشیاں محسوس کیں۔ پچھلے واپڈا والے بھائی ٹائم سے اپنے بچوں کو لے کر آگئے۔ بھائی اسلم کی بے حسی کہیں دور دفن ہو گئی۔

ج:۔ پیاری کوشی! مسز خالد نے ہمیں فون کیا تھا۔ انہوں نے اپنا نمبر دوبارہ دیا ہے آپ ہمیں اپنا ایڈریس یا فون نمبر واٹس ایپ کر دیں۔ اس نمبر پر واٹس ایپ کر دیں ہم مسز خالد کو دے دیں گے۔ 0345-2852056 خواتین کی محفل میں شرکت کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ آپ کی بھابھی کی تنگ دلی، اور بھائی کی بے حسی افسوس ناک ہے۔ بچے تو معصوم ہوتے ہیں۔ انہیں اتنی سمجھ، عقل نہیں ہوتی۔ آپس میں لڑتے بھی ہیں پھر خود ہی مان بھی جاتے ہیں بڑوں کو بچوں کی لڑائی میں بولنا ہی نہیں چاہیے کجا کہ ان سے اس حد تک دشمنی پال لینا۔ اس کی جس قدر مذمت کی جائے کم ہے۔ اللہ تعالیٰ سب

سائرہ گیلانی......ساہیوال

میں عرصہ تیس سال سے شعاع وخواتین کی قاری ہوں۔ چند ماہ قبل پہلی بار شعاع میں خط لکھا تھا جس کو محفل میں جگہ دے دی گئی۔ اس حوصلہ افزائی کے بعد اب خواتین ڈائجسٹ کی محفل میں بھی حاضر ہو رہی ہوں۔ چونکہ میرا ادران ڈائجسٹوں کا تعلق تیس سال پر محیط ہے لہٰذا یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ میرے پسندیدہ ہیں۔ ایک بات اور واضح کر دوں کہ میں جب بھی خط لکھوں گی تو مجموعی طور پر چلنے والے رجحانات پر تبصرہ کروں گی۔

میں کچھ عرصہ سے محسوس کر رہی ہوں کہ دو تین خاص موضوعات تبدیل نہیں ہو رہا ہے حالانکہ ہماری اکثر مصنفین زیادہ تر حقیقت کے قریب لکھ رہی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ہیرو یا ہیروئن کے لیے ایک اسٹینڈ بائی موجود ہوتا ہے یعنی اگر اسے اس کا پسندیدہ شخص نہ بھی ملے تو بھی اس کے لیے ایک وسیع ظرف والا انسان ایک مدت سے منتظر رہتا ہے جسے بالآخر قبولیت مل جاتی ہے۔ اس موضوع کو ذرا محدود کیجیے۔ یہ کسی ایک کا تجربہ تو ہو سکتا ہے لیکن اکثریت کا نہیں۔

دوسرا یہ کہ اس بات کو بہت قابل قدر بتایا جا رہا ہے کہ اگر کوئی کسی کو ٹھکرا دے تو اس کے باوجود بھی وہ سالہا سال اس کا انتظار کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ اس کی جانب متوجہ ہو ہی جاتا ہے۔ یہ ایک غیر حقیقی رویہ ہے اور بالکل بھی قابل تقلید نہیں۔ کبھی کبھار ایسا موضوع تو ٹھیک ہے لیکن تواتر سے نہیں۔ امید ہے پہلے کی طرح ہی آپ نے برا نہیں مانا ہوگا۔ ایک سینئر قاری کی حیثیت سے میں اتنا تو اپنا حق سمجھتی ہوں۔

اب ذرا بات ہو جائے 'مالا' کے بارے میں اس میں کوئی شک نہیں کہ نمرہ احمد ایک بہت ذہین اور قابل مصنفہ ہیں لیکن 'مالا' میں غیر ملکی فلموں اور ناولوں کا غلبہ محسوس ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ماہر کا بار بار یہ کہنا کہ ماہر کبھی غلط نہیں ہوتا، خاص قابل اعتراض ہے۔ اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ماہر

اسی طرح سلطان صاحب کا کردار بھی اندھیرے میں ہے۔

ماہر فرید ہے تو ضرورت سے زیادہ ذہین اور مستقل مزاج، مالا ہے تو ضرورت سے زیادہ خود اعتماد اور آزاد، ہلال ہے تو ضرورت سے زیادہ مستقبل بین۔

عبدالمالک ہے تو ضرورت سے زیادہ بے حس اور سرد مزاج، زیاد سلطان ہے تو ضرورت سے زیادہ سنگدل اور ظالم، نگینہ بیگم ہے تو ضرورت سے زیادہ بے رحم اور بدفطرت، لے دے کے ایک بیربل ہی نارمل انسان تھا وہ بے چارہ اب بالکل ہی غائب ہو چکا ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود بہرحال نمرہ قاری کو باندھے رکھنے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں۔

ہما کو ایک بخاری سے دوبارہ لکھنے کی درخواست ہے۔

ج: سائرہ جی! بہت شکریہ تیس سال بعد آپ نے خاموشی توڑی اور خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا، آپ نے حقیقت پر مبنی مشورے دیے ہیں۔ کسی کو چھوڑنا واقعی اتنا آسان نہیں ہوتا اور یہ بھی نہیں ہوتا کہ چھوڑنے کے بعد دوسرا بہت اچھا انسان ہمیں مل جائے۔ لیکن یہ بھی تو سوچیں کہ حقیقت اور افسانے میں یہی فرق ہوتا ہے۔ حقیقت کی دنیا میں آپ دیکھتی ہیں کہ بہت کم انصاف ہوتا ہے۔ ظالم کو ظلم کی سزا ہمیشہ نہیں ملتی۔ کچھ معاملات روز محشر اللہ پر چھوڑ دیے جاتے ہیں جبکہ ایک مصنف کو ہر کردار کے ساتھ انصاف کرنا پڑتا ہے اسے اچھے کردار کو جزا اور برے کردار کو سزا دینی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے آپ کو لگتا ہے ایک کو چھوڑا تو دوسرا مل گیا۔

یہ درست ہے کہ حقیقت دنیا میں کوئی کسی کے لیے انتظار میں نہیں بیٹھا رہتا لیکن ہیرو، ہیروئن کے کردار کی عکاسی کے لیے کچھ غیر معمولی خوبیاں بھی شامل کرنا پڑتی ہیں نا؟

سائرہ جی آپ نے خط لکھنے میں بہت دیر کی۔ اب اتنی دیر نہ لگایے گا مہینہ دو مہینہ بعد ہماری محفل کا چکر لگاتی رہیے گا۔

☆☆

روشنیوں کا سفر

ادارہ

سوالات یہ ہیں۔

1۔ چاندرات عید کے دن سے زیادہ بارونق اور بھرپور ہوتی ہے۔ آپ چاند دیکھ کر عید کے دن کے لیے کیا تیاریاں کرتی ہیں؟

2۔ وقت کے ساتھ ساتھ اقدار بھی بدلی ہیں کیا آپ کے ہاں اب بھی روایتی انداز میں عید منائی جاتی ہے؟ آپ آج کی اور بچپن کی عید میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟

3۔ خواتین ڈائجسٹ سے پہلا تعارف کیسے اور کب ہوا؟ وقت کے ساتھ ساتھ آپ کی زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں، ان تبدیلیوں میں خواتین ڈائجسٹ کا ساتھ رہا؟

4۔ کبھی ایسا ہوا کہ کوئی کہانی شروع کی اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئیں ہانڈی جل کر راکھ ہو گئی۔ یا کوئی اور کام بگڑ گیا اور گھر والوں سے ڈانٹ کھانا پڑی؟

5۔ کوئی ایسی کہانی جس کے کرداروں اور ماحول میں آپ کو اپنی اور اپنے گھر والوں کی جھلک نظر آئی؟

آیئے دیکھتے ہیں۔ ہماری قارئین نے کیا جواب دیے ہیں۔

فرزانہ انصاری...... کراچی

1۔ یہ سچ ہے چاندرات عید کے دن سے زیادہ بارونق اور بھرپور ہوتی ہے عید کا چاند تو خیر نظر نہیں آتا ہاں اعلان سن کر خوشی کے احساس کے ساتھ غم کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ماہ رمضان الوداع ہو رہا ہوتا ہے۔

کپڑے استری کر کے پردے کور وغیرہ چڑھاتی ہوں۔ صبح کے لیے دودھ گرم کرنا، بادام پستے کاٹ کر رکھنا، ان کی بچوں کی عید کی ساری چیزیں سامنے تیار کر کے رکھنا کہ صبح ڈھونڈنا نہ پڑے۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر ٹی وی کھول لیتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں آپی مجھے عید کے پروگرام، چاندرات کے پروگرام، مارننگ شو اور خبریں بہت پسند ہیں۔ اب چاندرات کو بازار تو جاتے نہیں بس گھر میں ٹی وی پر دیکھتی رہتی ہوں۔ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ رات میں کسی کو فون کرتی نہیں کہ سب مصروف ہوں گے بس ساڑھے بارہ بجے ایک بجے تک سو جاتی ہوں تاکہ فجر پر وقت پر اٹھ جاؤں۔

2۔ وقت کے ساتھ اقدار بدلی ضرور ہیں مگر ہم جیسے پرانے لوگ اب بھی روایتی انداز سے ہی عید مناتے ہیں۔ فجر کی نماز کے بعد عید کی تیاری میں لگ جانا، شیر خورمہ تیار کرنا، حالانکہ اب تو صرف حسن ہی عید کی نماز پڑھنے جاتا ہے۔ حسن کے آنے کے بعد ہم دونوں مل کر مٹھائی کھاتے ہیں۔ حذیفہ اور اس کے پاپا آرام سے سو رہے ہوتے ہیں۔ یہ فجر کے وقت آتے ہیں تو ان کی ہمت نہیں ہوتی عید کی نماز کے لیے جانے کی، حالانکہ میں بہت ضد کرتی ہوں مگر نہیں جا پاتے۔ کہتے ہیں، تھکن سے برا حال ہو رہا ہے۔ بس اب تو سونے دو۔"

بقیہ صفحہ نمبر 202

راحت جبیں

آنگنا پھول کھلیں گے

اٹھارہویں قسط

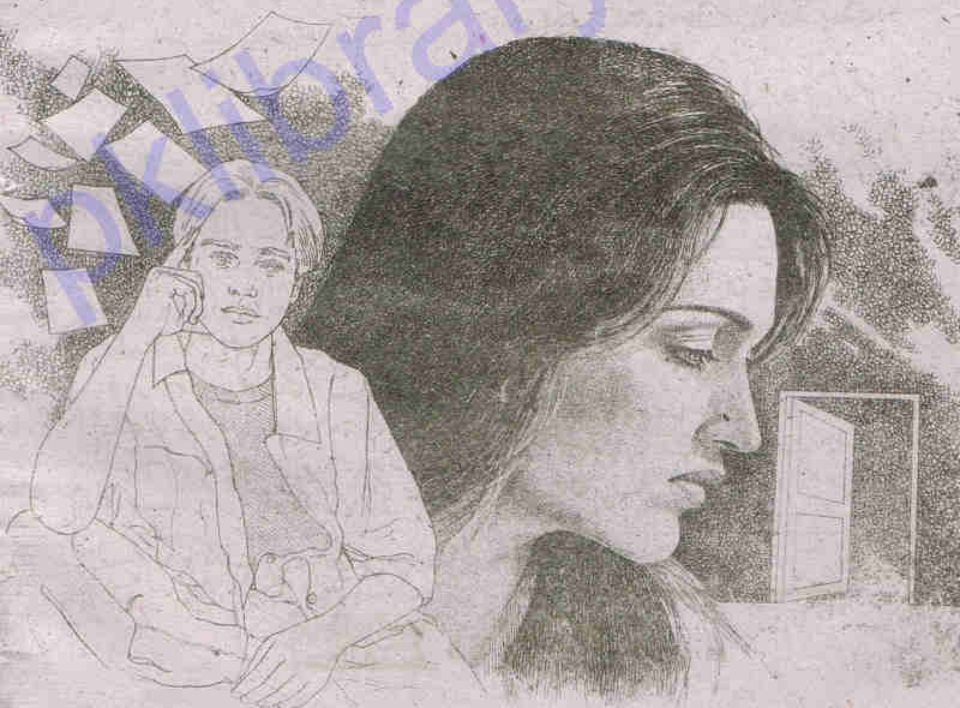
''امی اب بس کریں میرے پیر سوج گئے ہیں۔'' ارم کا بس چلتا تو بیچ مارکیٹ میں بیٹھ جاتی ایک سے ایک بہترین چیز کی تلاش میں انہوں نے پورا مال کھنگال لیا تھا۔

''ہاں تھک تو میں بھی گئی ہوں چلو باقی کل پر رکھتے ہیں۔'' صد شکر کہ آسیہ مان گئیں۔

''لیکن گھر جانے سے پہلے مجھے کسی اچھی جگہ سے کھانا کھلائیں۔'' ارم نے جھٹ سے فرمائش جڑ دی۔ تب ہی آسیہ کا موبائل بجنے لگا۔

''تمہاری ساس کی کال ہے۔ یہ پکڑو۔'' انہوں نے باقی کے بیگز بھی ارم کو تھما دیے۔

''جی آپا!'' سمدھنوں میں بلا کی یگانگت تھی۔ دن میں تبادلہ خیال کے لیے کتنے ہی فون کھڑکا لیے جاتے۔ ہاجرہ تو ویسے بھی اکیلی تھیں۔ انہیں بار بار مشورے کے لیے آسیہ کی ضرورت پڑتی۔ انہوں نے تو کہا تھا۔ بری کی تیاری بھی آسیہ ارم کی مرضی سے خود ہی کرلیں۔ لیکن آسیہ کو مناسب نہ لگا۔



چلو۔" کچھ دیر بات کرنے کے بعد انہوں نے عجلت میں کہا۔

"کہاں؟"

"تمہاری ساس یہاں قریب ہی ایک بوتیک پر ہیں۔ انہوں نے کہا ہے ارم ساتھ ہے۔ ولیمے کا ڈریس اس کی پسند سے ہی لے لیتے ہیں۔"

"امی!" ارم نے احتجاجاً انہیں دیکھا۔ صبح سے شاپنگ کے لیے خوار وہ اس حلیے میں ساس کے سامنے جاتی اچھی لگے گی۔ مگر آسیہ نے اس کی ایک نہ سنی۔ اصل بھاگ جانے کا دل اس وقت چاہا جب اس نے صوفے پہ بیٹھے عفان کو دیکھا۔ جو تسلی سے بیٹھا موبائل میں مصروف تھا۔ ارم نے ہاتھوں میں پکڑے سارے بیگز ایک طرف ڈھیر کر دیے۔ کاش وہ ان کے ساتھ خود بھی ڈھیر ہو سکتی۔

تب ہی عفان نے سر اٹھا کر دونوں کو دیکھا اور احتراماً کھڑا ہو گیا۔ آسیہ اس سے سلام دعا کرنے لگیں۔

ارم کیا کرتی بے وقوفوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

آسیہ آگے بڑھ گئیں۔

ارم نے تیزی سے آگے بڑھنا چاہا مگر وہ دراز قامت راستے میں حائل ہو گیا۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"بھتنی لگ رہی ہوں۔" اس نے دل میں جواب دیا۔

"اچھی ہوں۔"

"یہ تو بعد میں پتا چلے گا۔" بھوری آنکھوں میں مسکراہٹ کا تاثر ابھرا۔

"اچھے لوگ ہمیشہ اچھے ہی ہوتے ہیں۔" ارم کو اپنی گھبراہٹ پر غصہ آنے لگا۔

"آپ کے بچے کیسے ہیں؟"

"ہیں......!" ارم کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"چڑیا کے بچے۔" عفان نے حیرت سے دوبارہ دہرایا۔ اس نے شاید پہلے بھی یہی کہا۔ اس کے کان بند ہو رہے تھے۔

"وہ تو اڑ گئے۔" وہ خود بھی اڑنے کے لیے رستہ تلاشنے لگی۔ تب ہی آسیہ نے اسے پکار لیا تو عفان ایک طرف ہو گیا۔ ارم تیزی سے گزر کر آسیہ ہاجرہ سے ملنے لگی۔

☆☆☆

ارم کے کمرے میں سامان ہی سامان بکھرا تھا۔ بری کی شاپنگ ایک طرف ہاجرہ نے اسے ویسے بھی بہت سے تحائف لے دیے تھے۔

سامان اٹھاتے رکھتے ارم کے لبوں پر مسکان بکھر گئی۔

سب سے مشکل مرحلہ ولیمے کے ڈریس کا تھا۔ یا برائیڈل ڈریس کا۔

آسیہ اور ہاجرہ برائیڈل میں سرخ رنگ چاہ رہی تھیں۔ نجانے کب وہ عقب میں آ کھڑا ہوا۔

"مجھے سرخ رنگ پسند نہیں۔"

تینوں ہی چونک گئیں۔

"یہ والا کیسا ہے۔" ہاجرہ نے ایک اور ڈریس کی طرف اشارہ کیا۔

"بے کار ہے۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"تم نے پہننا ہے۔" ہاجرہ چڑ گئیں۔

ارم نے بمشکل مسکراہٹ ضبط کی۔
"مجھے دیکھنا تو ہے نا یا اس پر بھی پابندی ہے۔"
"اف۔" ارم کی گردن ہی جھک گئی۔
"جا کر بیٹھو جس نے پہننا ہے خود ہی پسند کرے گی۔" ہاجرہ نے ڈانٹ دیا تو وہ کندھے اچکا کر واپس مڑ گیا۔
پھر ارم کو ایک ڈریس پسند آ ہی گیا۔ لیکن وہ اس میں کچھ تبدیلیاں کروانا چاہتی تھی ڈیزائنر نے یقین دہانی کروائی کہ وہ مقررہ وقت تک سب کچھ کروا دے گی۔
ارم کی نظر بے اختیار آئینے کی طرف اٹھی۔ وہ کہنی پر وزن ڈالے ایک طرف کو جھک کر بیٹھا اسی کو دیکھ رہا تھا۔ ماتھے پر ہلکی سی شکن بتاتی تھی کہ یہ دیکھنا، دیکھنا نہیں۔ اس کا ذہن کہیں اور ہے جیسے ہی ارم سے نگاہ ملی۔ اس نے سیدھا ہو کر اثبات میں گردن ہلا دی۔
گویا اس کی پسند کو اپروول دے دیا تھا۔
"ارم......!" ثانیہ کی آواز پر ارم چونک گئی۔ ثانیہ نے بکھرے سامان کو دیکھا۔ اسی تجسس میں وہ آئی تھی۔ سنا تھا ارم کی ساس نے بہت شاپنگ کروائی تھی۔
"کچھ مدد کرواؤں۔"
"ہاں اتنا سامان ہے سمجھ میں نہیں آ رہا کہاں رکھوں۔ اس پر تھکاوٹ اتنی ہے کہ۔" پھر اچانک یاد آیا۔
"تمہاری شاپنگ ہو گئی؟"
"ہاں تم نے تو کبھی کہا نہیں عبید لے گیا تھا۔"
"ہاں وہ کہہ رہا تھا۔ میں خود ہی شاپنگ کروادوں گا۔" ارم جوتوں کے ڈبے الماری میں رکھنے لگی۔ آسیہ نے ایک بیگ کھولا۔ میک اپ کا سامان تھا۔
"تمہاری ساس کچھ زیادہ ہی شو آف نہیں کرتیں۔"
"وہ کہتی ہیں مجھے تمہارے لیے شاپنگ کرنا اچھا لگتا ہے۔" ارم نے سادگی سے بتایا۔
"کمال ہے۔" ثانیہ نے تعجب سے بھنویں اچکائیں۔
"عفان بھی ساتھ تھا۔"
"ہاں۔" ارم نے رخ بدل لیا مگر لبوں کے کونوں میں مچلتی مسکان ثانیہ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہی۔
"کیا کیا باتیں ہوئیں۔" ثانیہ بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔
"کچھ خاص نہیں۔" ارم نے کنی کترائی۔
"تم بتانا نہیں چاہتیں۔"
"بس اس نے مجھ سے میرا سیل نمبر مانگا تھا۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بتا گئی۔
"پھر......؟"
"مجھے اپنا نمبر بھول گیا۔" ارم نے معصومیت سے بتایا۔
"تمہیں اپنا نمبر یاد نہیں۔" عفان نے تحیر سے پوچھا۔ آسیہ اور ہاجرہ جیولر سے الجھ رہی تھیں۔
"یاد تھا ذہن سے نکل گیا۔" ارم نے شرمندگی سے نچلا لب دانتوں تلے دبایا تو عفان نے اس کے ہاتھ سے اس کا سیل لے لیا۔ اپنا نمبر ڈائل کیا۔ تو اس کے موبائل پر بیل جانے لگی۔
"میرا نمبر سیو کر لینا مجھے عفان کہتے ہیں۔" آخری جملے میں شرارت ہی شرارت تھی۔

''مطلب آدم بیزار نہیں ہے۔ رومینٹک مزاج ہے۔'' ثانیہ نے تبصرہ کیا۔ ارم نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بتا گئی تھی۔ اور اس میں چھپانے والی کوئی بات بھی نہیں تھی۔

''پتا نہیں۔''

''چلو آج رات پتا چل جائے گا۔''

''آج رات۔'' ارم نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''نمبر لیا ہے کال نہیں کرے گا۔''

''آ...... مجھے نہیں پتا میں ابو سے چائے کا پوچھ لوں۔'' ارم جلدی سے باہر نکل گئی ثانیہ نے اردگرد پھیلے سامان کو دیکھا۔

ارم کو جب بھی ملا بنا کوشش کے چھپڑ پھاڑ کر ہی ملا۔ وہ واقعی خوش نصیب تھی۔

ثانیہ کے اندر تاسف سا ابھرا۔

''میری زندگی میں تو کوششیں ہی لکھی ہیں۔''

☆☆☆

ایسے گھر میں رہنے اور بسنے کے خواب تو اس نے دیکھے تھے۔

گیٹ کھلا اور گاڑی پورچ میں داخل ہوئی۔ نگاہوں میں وسیع لان کا منظر ابھرا۔

وہ، عبید اور ان کے بچے...... اس نے اپنی فیملی کو ایسے ہی لان میں بیٹھ کر چائے پیتے دیکھا تھا۔

وسیع و عریض ڈرائنگ روم کے بیش قیمت فرنیچر آرائشی فانوس۔ بڑا سا کرسٹل ڈیکوریشن پیس وہ گھر امارت اور روایت کا خوب صورت امتزاج تھا۔

''ایلس ان آونڈر لینڈ۔'' عبید نے سرگوشی کی۔ وہ جو ننھی بچی کی طرح گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ شرمندہ سی ہو کر ہاجرہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ جنہوں نے ان کی خاطر مدارت میں کوئی کمی نہ چھوڑی تھی۔

آخر ہونے والی بہو کی بھاوج پہلی بار ان کے گھر آئی تھی۔

حالانکہ آسیہ اسے اس طرح بھیجنے کو تیار نہ تھیں۔ مگر کارڈ چھپ کر آگئے تھے اور عبید کو کارڈ دینے آنا تھا تو ثانیہ بھی تیار ہو گئی۔ وہ عبید کی وجہ سے مجبوراً راضی ہو گئیں۔ ورنہ وہ اس وقت ایک روایتی ماں کی طرح اپنی بیٹی کی خوشیوں کو ہر حاسد کی نظر سے دور رکھنا چاہتی تھیں۔

''آنٹی اس گھر اور کاروبار میں تو باقی لوگوں کا بھی حصہ ہو گا۔''

بہت سی ضروری باتوں کے درمیان ثانیہ نے اچانک ہی غیر ضروری بات کر دی۔ عبید نے پہلو بدلا۔

''نہیں یہ سب کچھ عفان کا ہے۔'' ہاجرہ بیگم نے مسکرا کر تسلی کروائی۔

''میں نے تو ابھی تک عفان کو دیکھا ہی نہیں۔'' ثانیہ نے اپنی مایوسی چھپائی کچھ تو ایسا مل جائے کہ دل کو تسلی ہو۔ یہاں تو سب کچھ پرفیکٹ نظر آ رہا ہے (ہو سکتا ہے عفان میں ہی کوئی کمی ہو)

اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ کچھ دیر میں اس کے ہاتھ کیا لگنے والا تھا۔

''بیٹا آپ ہمارے گھر آئی ہی پہلی بار ہو ورنہ عفان سے ملاقات ہو جاتی۔'' ہاجرہ نے رسانیت سے کہا۔

''ابھی تو وہ آفس......'' ہاجرہ کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ جب وہ دراز قامت اندر داخل ہوا۔

''السلام علیکم۔''

ہاجرہ مسکرا دیں۔ عبید نے آنے سے پہلے عفان کو کال کر دی تھی۔ تب ہی وہ آفس سے جلدی اٹھ گیا۔ کتنا بھی مغرور ہو مگر اسے رشتے نبھانے تو آتے تھے۔ آخر حاجرہ کا بیٹا تھا۔

عبید اٹھ کر اس سے ملنے لگا۔ اور ثانیہ سلام کا جواب بھی نہ دے پائی۔
"یہ عفان تھا۔"
گہری مایوسی اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔
کوئی کمی کوئی خامی۔
وہ ایک دراز قامت پرکشش اور جاذب نظر نوجوان تھا بات کرنے کے انداز میں رکھ رکھاؤ اور وقار تھا۔
عفان اس سے حال احوال پوچھ رہا تھا۔ وہ حال دل کیا بتاتی۔ بس بناوٹی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا کر رہ گئی۔
عفان عبید کے ساتھ محو گفتگو تھا۔
ثانیہ کو چپ سی لگ گئی۔ وہ بس ہاجرہ کی ہر بات کے جواب میں ہوں ہاں ہی کرتی رہی عبید نے ایک دو بار اس کی خاموشی کو محسوس کر کے اس کی طرف دیکھا تو وہ ذرا سنبھلی۔
عبید ہاجرہ بیگم سے بارات اور دیگر معاملات کے بارے میں بات کر رہا تھا۔
عفان معذرت کر کے کھڑا ہو گیا۔ اسے کپڑے تبدیل کرنے تھے۔ فریش ہونا تھا۔
"بی بی جان۔" ثانیہ نے لگاوٹ سے پکارا۔
"میں آپ کا گھر دیکھ سکتی ہوں۔"
"کیوں نہیں بیٹا آپ کا اپنا گھر ہے۔" انہوں نے خوش دلی سے کہتے عفان کو دیکھا۔
"بھابی کو گھر دکھا دو۔"
یہ کام تو مسرت بھی کر سکتی ہے۔ عفان نے دل میں سوچا مگر مروت میں چپ رہا۔ اسے ثانیہ عجیب سی لگی۔
ایک ایک چیز کو دیکھتی ہر کونے کے بارے میں دریافت کرتی۔ جیسے اس نے وہاں رہنا ہو عفان کو کوفت ہونے لگی

"آپ کا گھر بہت خوب صورت ہے۔" ثانیہ کے لہجے میں حد درجہ ستائش تھی۔ "لوگ تو ایسے گھر میں رہنے کے خواب دیکھتے ہیں۔"
"شکریہ۔" وہ مسرت کو بلا کر خود اپنے کمرے میں جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیونکہ ثانیہ کا ارادہ تو شاید سرونٹ کوارٹرز بھی دیکھنے کا تھا۔
"ارم آپ کی کال کا انتظار کرتی رہی۔" وہ فش ایکوریم کے پاس رک گئی۔
"میری کال؟" عفان نے تعجب سے پوچھا۔
"آپ نے اس کا نمبر جو لیا تھا۔" ثانیہ کی نگاہ چھوٹی نیلی، چمکیلی مچھلی پر تھی۔ دل چاہا مٹھی میں لے لے (وہی، ہر چیز دسترس میں ہو۔)
"نمبر تو......" عفان کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
"لڑکیوں کی خواہش ہوتی ہے اپنے منگیتر سے بات کرنے کی۔ میں اور عبید تو پوری پوری رات بات کیا کرتے تھے۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔
"ایسی کون سی باتیں تھیں؟" وہ نادان تھا۔ معصوم یا حد درجہ چالاک۔ شاید اس سے کچھ اگلوانا چاہتا تھا۔
ثانیہ سنبھلی۔
"لگتا ہے آپ بالکل بھی رومینٹک نہیں ہیں۔"
"شاید۔" عفان نے ہلکے سے سر کو جھٹکا۔
"کوئی بات نہیں ارم بہت قناعت پسند لڑکی ہے۔ گزارہ کر لے گی۔" وہ ہنسی۔

(شاید جو میری زندگی میں آئے اسے گزارہ ہی کرنا پڑے۔)
"پتا نہیں وہ اتنا بڑا گھر کیسے سنبھالے گی۔" وہ شاید خود کلامی تھی۔ عفان بور ہونے لگا۔
"اس گھر کے معاملات بہت اچھی طرح سے چل رہے ہیں۔ اسے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔"
"وہ محنت کی عادی ہے گھر سنوارنے سجانے کا تو جنون ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اتنی اچھی کہ میں اسے اپنی بھابھی بنانا چاہتی تھی۔"
عفان چونک گیا۔ "تو یہ......"
"تو یہ کہ آپ کا رشتہ آ گیا اور انکل نے نہ کسی سے پوچھا اور نہ کسی کو بتایا۔ بس فٹ سے ہاں کر دی۔" ثانیہ نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔
"ارم سے بھی نہیں پوچھا؟" اس سے قبل کہ ثانیہ عفان کے سوال کا جواب دیتی۔ افتاں و خیزاں مسرت دوڑتی ہوئی آئی۔
"کیا ہوا؟"
وہ ثانیہ کو دیکھ کر ٹھٹکی پھر عفان کو دیکھا۔
"وہ ...... وہ آئی ہیں۔"
"وہ کا کوئی نام بھی ہوگا۔"
"زارا بی بی۔" مسرت کی آواز مدھم ہوئی۔ عفان کے چہرے پر ایک غیر معمولی سا تاثر ابھرا۔ پتھریلا سرد وہ ثانیہ سے معذرت کرتا تیزی سے چلا گیا۔ مسرت بھی اس کے پیچھے لپک گئی۔
لابی میں اکیلی کھڑی ثانیہ کو بے عزتی کا احساس ہوا۔
☆☆☆
وہ مانی کے کاٹ کے پاس کھڑی تھی۔ سیاہ برانڈڈ کرتا پاجامے میں ملبوس بنا دوپٹے کے...... اس کے اسٹیپس میں کٹے بال چہرے کے اطراف میں بکھرے تھے۔ سنہری زنجیر والا بیگ کندھے پر جھول رہا تھا۔
چہرے پر میک اپ کی تہہ جس نے اس کے دلکش نقوش کو مزید نکھار بخشا تھا۔ عفان کو یاد نہ تھا کہ کبھی اس نے زارا کو سیاہ لباس یا اتنے میک اپ میں دیکھا ہو۔ وہ تو مست ملنگ ٹائپ لڑکی تھی۔
"کیسے ہو عفان؟"
وہ اسے یکسر نظر انداز کر کے کاٹ پر جھکا اور مانی کو بازوؤں میں بھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ وہ بھی جو کچی نیند میں تھا ہڑبڑا کر جاگا۔ عفان کو دیکھا تو ایک بے ساختہ مسکراہٹ پھول جیسے لبوں پر کھلی پھر اس نے کندھے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔
"ہائے وہ اس مسکراہٹ پر اپنی ساری دولت لٹا سکتا تھا۔"
عفان نے اس کا سر چوم لیا۔ زارا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
کچھ یاد آیا تھا اور بہت ہی شدت سے یاد آیا تھا۔
"بس ہو گئی ممتا ٹھنڈی۔" گہرا طنزیہ تمسخرانہ لہجہ۔
زارا کے آنسو پلکوں پر ہی منجمد ہو گئے۔
"محسن نے اچانک ہی دوبئی کی فلائٹ بک کروالی۔ یہ میں ہی جانتی ہوں کہ دل سے مانی کو چھوڑنے۔"
"تم اسے ایک ہی بار چھوڑ جاؤ۔ ہم پر احسان ہوگا۔" وہ غرایا۔
زارا ایک لمحے کو چپ سی ہو گئی۔

اتنا کروامت بولو عفان! کبھی ہمارے درمیان بہت خوب صورت اور باعزت رشتہ تھا۔" زارا کے لہجے میں کسک جاگی۔

کبھی یہ گھر اس کا تھا۔ یہ لوگ اس کے تھے۔ وہ انہیں چھوڑنے اور دور ہونے کا سوچتی بھی تو سانس بند ہو جاتی مگر پھر وہ کڑی ہی ٹوٹ گئی جو زارا کو اس گھر سے جوڑے ہوئے تھی۔

"اب اس رشتے کا نام بھی تمہاری زبان پر نہیں چاہیے۔" عفان کی نگاہوں سے شرارے برسنے لگے۔

"جیسے ہی سسرال میں حالات اسٹیبل ہوئے میں مانی کو لے جاؤں گی۔" اس نے حسرت سے اس کے کندھے سے لپٹے بیٹے کو دیکھا۔

"میں مانی کو تمہیں دوں گا۔ ایسی کسی بھول میں مت رہنا۔" عفان نے دانت پیسے۔ "اب تم جاؤ یہاں سے۔"

"عفان میں۔"

"مسرت۔"

وہ عفان کی آواز پر بھاگی آئی اور منت بھری آواز میں بولی۔

"زارا بی بی آجائیں۔"

زارا نے ایک گہری سانس لی۔

"میں بی بی جان۔"

"گھر میں مہمان ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ تم ان سے ملو۔" عفان نے درشتی سے اس کی بات کاٹی۔

زارا کے اندر اشتعال کی لہر اٹھی۔ وہ اس کی مسلسل بے عزتی کر رہا تھا اور وہ برداشت کر رہی تھی۔ وہ تیزی سے اس کے سامنے آئی۔

"تم کچھ بھی کر لو عفان! مانی سے میرا رشتہ کبھی نہیں بدل سکتا۔ میں اس کی ماں ہوں اور ماں ہی رہوں گی۔" مانی کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی وہ تیزی سے وہاں سے نکلی۔

"اس کو باہر تک چھوڑ کے آنا۔" عقب سے عفان نے مسرت سے کہا تھا۔

ثانیہ اس خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر ٹھٹک کر رکی۔ جس کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر غصہ تھا۔

زارا کے قدم بھی تھم گئے۔

"وہ میں ڈرائنگ روم میں جانا چاہ رہی تھی۔" ثانیہ نے بوکھلا کر کہا۔

زارا نے اسے سرتاپا دیکھا۔

"یہاں سے رائٹ سائیڈ پر ہے۔"

عقب میں آتی مسرت کو سمجھ نہ آئی کہ وہ زارا کو باہر تک چھوڑے یا ثانیہ کو ڈرائنگ روم تک...... پھر ثانیہ کو مڑتے دیکھ کر وہ زارا کے پیچھے بھاگی۔ کہ زارا جاتے ہوئے ہمیشہ اس کے ہاتھ پر کچھ رقم رکھ جاتی تھی۔

راہداری کے آخر میں ثانیہ رکی اور پلٹی۔

اسے کمرے سے عفان کی آواز آرہی تھی۔

وہ تجسس میں کمرے کے دروازے تک آئی۔

سامنے کے منظر نے اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔

☆☆☆

وہ کب سے نوٹ کر رہی تھی۔ ماں بے چین ہے۔ کوئی کام ان کی توجہ نہیں کھینچ رہا۔ بار بار موبائل اٹھا کر ٹائم

میں پھر سنجیدگی سے غور کرنے کا ارادہ کریں اور ہیر واپس رکھ دیں۔
"اماں۔" ارم نے عقب سے ماں کے گلے میں بازو ڈال کر ٹھوڑی ان کے سر پر ٹکائی۔
"کس بات کی بے چینی ہے؟"
"کتنی دیر ہوگئی۔ یہ لوگ ابھی تک واپس نہیں آئے۔" آسیہ کے انداز میں جھنجلاہٹ تھی۔
"ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی۔ آنے جانے میں چائے پانی پینے میں اتنا وقت تو لگ ہی جاتا ہے۔"
"تمہیں نہیں پتا عبید کو ثانیہ کو ساتھ نہیں لے جانا چاہیے تھا۔ میں اس لڑکی پر اعتبار نہیں کرسکتی۔ اس نے کوئی ایسی ویسی بات کردی یا کچھ......"
"کیسی بات؟" ارم پاس آکر بیٹھ گئی۔
"تم سمجھ ہی نہیں رہیں۔ تمہارا رشتہ پہلے وسیم کے ساتھ ہونے جارہا تھا۔"
"تو؟" ارم نے حیرت سے ماں کا چہرہ دیکھا۔
"یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں۔"
"کوئی بھی بات اتنی بڑی نہیں ہوتی۔ چند لفظوں کا ہیر پھیر بات کا مفہوم بدل دیتا ہے اور ثانیہ تو اس بات میں ماہر ہے۔" وہ چڑ گئیں۔
"چند لفظوں کا ہیر پھیر میری قسمت بدل سکتا ہے تو پھر آپ کو یہ بات ہاجرہ آنٹی سے پہلے ہی کرلینی چاہیے تھی۔"
ارم ان سے بھی زیادہ چڑ گئی کوفت الگ ہوئی۔ یعنی اتنی معمولی بات اس کے سر پر تلوار بن کر لٹکی رہے گی۔
"ارم! میری جان! تم بہت معصوم ہو۔"
بیٹی کی شادی ماں کو اس کے مستقبل کے حوالے سے ہزاروں خدشات میں مبتلا کررہی تھی۔ گویا دل نوچ کر غیروں کی ہتھیلی پر رکھنا تھا۔
"امی میں معصوم ہوں لیکن بے وقوف نہیں۔ آپ ہی تو کہتی ہیں ہر کسی کو اپنے حصے کے دکھ اور سکھ دیکھنے ہیں۔ مجھے اپنے رب پر پورا بھروسا ہے وہ مجھے اکیلا نہیں چھوڑے گا اور......"
عبید اور ثانیہ کو اندر آتے دیکھ کر ارم نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔
آسیہ نے بغور بہو کے تاثرات جانچے دونوں خوش باش گھر میں داخل ہوئے۔ سلام کیا اور وہیں بیٹھ گئے۔
"کیسی تھیں ہاجرہ؟" آسیہ نے محتاط انداز میں دریافت کیا۔
"بالکل ٹھیک تھیں۔" عبید نے جواب دیا۔
"بیٹے کی شادی کی خوشی میں اور بھی ٹھیک تھیں۔" ثانیہ ہنسی۔ "بار بار کہہ رہی تھیں۔ سب سے چھوٹے بیٹے کی پہلی شادی ہے۔ میں تو پھر سے جوان ہوگئی ہوں۔"
"سب کی پہلی شادی ہی ہوتی ہے۔" عبید نے ٹوکا۔
"کسی کسی کی دو بھی ہوجاتی ہیں۔"
"وہی تو......" ثانیہ سنبھلی ساتھ ہی ارم کی طرف متوجہ ہوئی۔
"ارم! تم بہت خوش قسمت ہو۔ اتنا اچھا گھر اور عفان، اس کی فیملی میں خوامخواہ پریشان تھی کہ پتا نہیں جلدی جلدی میں کیسا رشتہ ہوگا مگر اب ان سے مل کر دیکھ کر مطمئن ہوگئی ہوں۔"
ارم نے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔
"بیٹیوں کے رشتے جلدی میں تو نہیں ہوتے۔ دیکھ بھال کر ہی کیے جاتے ہیں۔" آسیہ نے رسانیت سے

کہا۔
"یہ تو سارا رستہ عفان اور اس کی فیملی کی تعریفیں ہی کرتی آئی ہے۔" عبید نے کہا۔
"کیوں نہ کروں میں کوئی ارم کی دشمن تھوڑی ہوں۔ جب اتنا اچھا سسرال ملا ہے تو خوش ہی ہوں گی۔ یہ تو آپ لوگ ہی مجھ سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔" ثانیہ نے سنجیدگی سے کہا۔
سب خاموش ہی رہے۔ دلوں سے کدورت دور نہیں ہوئی تھی۔ مگر رشتہ نبھانے کے لیے ضروری تھا کہ خاموشی اختیار کرلی جائے۔
"میں چائے بناتی ہوں۔ کون کون پیئے گا۔" ارم کھڑی ہوگئی۔
"اب تم کچن کے کاموں سے چھٹی لو۔ بلکہ اپائنٹمنٹ لو۔ اب تمہارے ایک دو فیشل ہو جانے چاہئیں۔" ثانیہ اس کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔ آسیہ نے بہانے سے ہاجرہ کو بھی کال کرلی۔
گھر سب ٹھیک چل رہا تھا۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا۔
☆☆☆
گھر میں شادی کی رونقیں عروج پر تھیں۔ سامان خریدا جا رہا ہے پیک ہو رہا۔ مہمانوں کی لسٹ بن رہی ہے۔ بس آوت جاوت لگی تھی۔
ارم بھی بھی رک کر حیران ہو کر سارے گھر کو دیکھتی۔
وہ یہاں بس چند دن کی مہمان تھی۔
یہ گھر پرایا ہونے والا تھا۔
"پرایا......" اس نے بے حد تحیر سے اس لفظ کو زیر لب دہرایا۔ اور ستون سے لپٹی بیل کو دیکھا۔ اس نے یہ بیل خود اپنے ہاتھوں سے لگائی تھی۔ اس کے ایک ایک پتے کو گنا تھا۔ پہلی کلی سے پھولوں کے جوبن تک وہ اس کی سہیلی رہی تھی۔
وہ ایک ایک سیڑھی چڑھتی اوپر آئی۔
آغاز موسم گرما تھا......اور بہار اپنے عروج پر تھی۔
یہ پھولوں بھری چھت اسے بنی بنائی نہیں ملی تھی۔
اس نے گملے خود پینٹ کیے تھے۔
خزاں کی دھوپ میں سکھا کر بہار کے بیج بوئے تھے۔ اس نے کتنی جاں فشانی عرق ریزی اور مشقت سے اس بہار کو اپنا مقدر کیا تھا۔
"کوئی اس کے بعد پودوں کو پانی دینے آئے گا۔" اس نے خالی آب خوروں کو دیکھا۔
"یا چڑیاں خالی آب خوروں کو دیکھ کر ایسی طرح لوٹ جائیں گی۔"
اسے فرصت نہ ملی تھی اور کسی نے دانہ پانی نہ رکھا تھا۔
"میری طرح تمہارا ابھی دانہ پانی اٹھ گیا ہے۔"
وہ ایک دم سے کرسی پر بیٹھی، گرد آلود میز پر سر رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ یہاں تک کہ کسی نے اسے بازو کے گھیرے میں لے کر کندھے سے لگالیا۔ بھائی کا لمس پا کر وہ مزید بکھر گئی۔
عبید اپنی گیلی آنکھیں آستین سے پونچھتا رہا۔
یہ کہانی آج کی تو نہیں تھی۔
جب اسے پہلے بار گود میں لیا۔

جب وہ پاؤں پاؤں چلنا سیکھی۔
جب اس کی موٹر سائیکل کی آواز پر دروازہ کھولنے بھاگتی تھی۔
جب وہ اس کا بیگ اپنے کندھے پر ڈال اسکول چھوڑنے سے لے کر جب وہ بہن سے راز دار سہیلی بنی ساتھ ہنسنے اور رونے والا رشتہ بنی۔
یہ کہانی آج کی تو نہ تھی۔
''یہ ہمیشہ تمہارا گھر رہے گا۔''
''لیکن میں اس آنگن کی تتلی نہیں رہوں گی میرے بھائی! جو اپنی موج آتی اپنی موج جاتی ہے۔ میں تو منڈیر پر بیٹھی چڑیا ہو جاؤں گی۔ جو آکر منتظر نگاہوں سے سب کو دیکھتی ہے کیا میرے حصے کا دانہ پانی موجود ہے یا نہیں۔''
''تم ہمیشہ اس آنگن کی تتلی رہو گی ارم یہ بھائی کا وعدہ ہے۔'' ایسے وعدے اور دعوے کبھی پورے نہیں ہوتے۔
کیونکہ دریا ہمیشہ آگے کو بہتا ہے۔ واپس نہیں پلٹتا۔

☆☆☆

''کچھ الیکٹرونکس میں سے لے لیں۔''
آسیہ نے پوچھا انہیں ہر چیز میں کمی لگ رہی تھی۔ جہیز جو نہیں جا رہا تھا۔ توفیق صاحب نے مسکرا کر آسیہ کو دیکھا ان کے ارمان ادھورے رہ گئے تھے۔
پاس بیٹھی ثانیہ کی زبان میں کھجلی ہوئی مگر چپ سادھ گئی۔ اس کے خیال میں تو پہلے ہی زیور، کپڑوں اور باقی لوازمات پر کافی رقم خرچ ہو گئی تھی۔
''ہاجرہ بی بی نے سختی سے منع کیا ہے کہ گھر میں جو کچھ ہے سب ارم نے ہی استعمال کرنا ہے۔ انہیں برا لگے گا۔''
''اللہ کا شکر ہے اتنے اچھے لوگ مل گئے۔'' آسیہ نے کہا تو ثانیہ نے بغور انہیں دیکھا۔ تبھی عبید آ گیا۔ ہاتھ میں چیک تھا۔
''ابو! یہ ہماری طرف سے ارم کے لیے ہے۔'' اس نے ثانیہ کے قریب بیٹھ کر چیک باپ کی طرف بڑھایا۔ ثانیہ نے چونک کر عبید پھر چیک کو دیکھا تو دل ڈوب گیا۔
دو لاکھ کا تھا۔
''بیٹا! اس کی ضرورت نہیں۔ سب انتظام ہو گیا ہے۔''
توفیق صاحب کو خوشی ہوئی کہ بیٹے نے ذمہ داری کا احساس کیا ہے مگر چیک نہیں لیا۔
''بھائی ہونے کے ناتے میرا بھی فرض بنتا ہے۔'' اس نے بصد اصرار چیک انہیں تھما دیا۔
ثانیہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔
''میں سوچ ہی رہی تھی کہ ہمیں بھی ارم کو کوئی گفٹ دینا چاہیے۔ اچھا ہے اپنی مرضی سے لے لے گی۔''
''ماشاء اللہ! تم لوگوں نے حق ادا کر دیا۔ ثانیہ نے بھی بہت اچھے طریقے سے سارا انتظام سنبھال رکھا ہے۔'' توفیق نے بہو کی حوصلہ افزائی کی اور کسی حد تک یہ درست بھی تھا۔
''اب چلیں آج زیور اٹھانا ہے۔'' آسیہ نے یاد دہانی کرائی تو توفیق صاحب اٹھ گئے۔
''مجھ سے مشورہ ہی کر لیتے۔'' ثانیہ نے ان کے جانے کے بعد شکوہ کناں نگاہوں سے شوہر کو دیکھا۔

"دھیان نہیں رہا۔" عبید نے ٹالا۔
"جب سارا انتظام ہو گیا تھا تو اتنے پیسے دینے کی کیا ضرورت تھی۔" ثانیہ سے رہا ہی نہ گیا۔ عبید نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔
"مطلب ہم اسے کوئی اور گفٹ کر دیتے۔ آنے والے وقت میں ہمارے کام آ سکتے تھے۔" ثانیہ کے لہجے میں مایوسی سی تھی۔
عبید اس کی ذات کے بہت سے رنگوں سے اب واقف ہو تھا۔ اس لیے غصہ کرنے کے بجائے اس کا ہاتھ دبا کر بولا۔
"فکر نہ کرو زندگی رہی تو ان شاء اللہ تمہارے لیے اور جوڑ لوں گا۔"
"ہاں مگر یہ تو چلے گئے۔"
وہ چپ ہو گئی۔ مزید بولنا اپنا ہی پردہ کھولنا تھا۔

☆☆☆

شب کا آغاز ڈھولک کی تھاپ سے ہوا۔
چنچل ہنسی، الہڑ سرگوشیاں، مہندی رچے ہاتھوں سے چوڑیوں کی کھنک رات کی چنری پر ستاروں کی طرح دمکنے لگی۔
دادی نے موتیا رنگ پر چھوٹی چھوٹی سبز بوٹیوں والا سوٹ زیب تن کیا۔ تیل لگا کر چوٹی گوندھی، بازو تھک جاتے تھے ہر بل دینے کے بعد سانس لینے کو رکتیں۔ پھر اپنی پٹاری کھولی۔ کمرے میں تبت سنو کی خوشبو پھیل گئی۔ اس کے ساتھ ہی ان کی سرمے دانی بھی رکھی تھی۔
"کہا بھی ہے تھک جائیں گی۔ بخار ہو جائے گا پر نہیں ان کا مہندی میں جانا ضروری ہے۔ پیروں پر بار نہیں آتا کرسی گھماتے پھریں گے۔" نادرہ کو ان کی وہیل چیئر سے چڑ تھی۔
"کون سا پورا گھر لیول پر تھا۔ کہیں سیڑھیاں چڑھانی پڑتیں تو کہیں اٹھانی۔" وہ بولتے بولتے ٹھٹک کر رکیں۔
صحن میں بچھی چارپائی پر وہ بازو آنکھوں پر رکھے لیٹا تھا۔
اور ڈھولک کی تھاپ دیوار تاپ کر گویا صحن میں کنکھی ڈال رہی تھی۔
"وسیم!" پتا نہیں کیوں انہوں نے بے چین ہو کر پکارا۔
"ہوں۔" اس نے بازو نہیں ہٹایا۔
"نیند آ رہی ہے تو اندر جا کر سو جاؤ۔ یہاں تو شور شرابا آ رہا ہے۔"
وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پاؤں زمین پر رکھے سر جھکا ہوا تھا۔ مبادا اماں آنکھوں کی لالی نہ دیکھ لے۔
"سوچ رہی ہوں تمہاری بھی شادی کی تاریخ لے آؤں۔" نادرہ کو الہام سا ہوا تو بہلانا چاہا۔
"دادی تیار ہو گئی ہیں۔ تو میں چھوڑ آؤں۔" وہ کھڑا ہوا۔
"تم کیا کرو گے میں لے جاتی ہوں۔ یا تمہارے ابا لے جائیں گے۔"
"ہاں میں کیا کروں گا؟" اس نے بے خیالی میں خود کلامی کی۔
صحن میں جلتی ٹیوب لائٹ کے گرد پتنگوں کا رقص شروع تھا۔
"بس اسے ایک نظر دیکھوں گا۔" وہ کتنی خوش ہے۔ ہنس رہی ہو گی۔ مسکراتی شرماتی ہو گی۔ کیا پتا اس ہنسی کی اوٹ میں اس کی آنکھ بھی لال ہوئی ہو۔

وہ مسکرا رہی تھی۔
سہیلیوں کی اوٹ میں شرماتی جھجکتی۔
اس کے گرد سفید اور پیلے پھولوں کی بہتات تھی۔ خود اس نے گلاب اوڑھ رکھے تھے۔ جن میں کسی اور کے نام کی خوشبو مہکتی تھی۔ وہ خوشبو اسے مدہوش کر رہی تھی۔
کہیں کوئی کمی؟
کہیں کوئی کسک؟
کچھ ذرا سا کھونے کا احساس؟
وسیم کا دل مایوسی کی اتھاہ گہرائی میں ڈوب گیا۔
ارم کی آنکھوں میں جگنوؤں کی چمک تھی۔
اس نے کرسی اسٹیج کے قریب کی اور لوٹ آیا۔
ارم دادی کی طرف متوجہ ہوئی۔
اس نے دیکھا ہی نہیں..... کون تھا جو غم غصے اور مایوسی کی آگ میں جلتا وہاں سے گیا تھا۔
اپنے جذبوں کو سنبھال کر چلنے والے شاید اتنے مطمئن اور پرسکون ہو سکتے ہیں۔
"نتاشا! آج کی رات میرے نام کر سکتی ہو۔"
"ہاں کیوں نہیں.......؟"
نتاشا کو اس کے سلگتے دل پر تسلی کے پھاہے رکھنے تھے۔ اس آگ کو اپنی محبت کی پھوار سے ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کرنا تھا۔
"اگر میں یہ فرمائش ارم سے کرتا تو اس کا جواب کیا ہوتا۔"
کال کاٹتے ہوئے وسیم نے بے دھیانی سے سوچا تھا۔
☆☆☆
"اماں! آپ آئیں شگن کی مہندی لگا کر رسم ادا کر دیں۔"
اماں بے چاری نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا کہ کس اماں کو اتنی عزت دی جا رہی ہے۔ اور جب احساس ہوا کہ بھری محفل میں ان سے زیادہ بزرگ اماں کوئی نہیں ہیں۔ اور آسیہ یہ عزت ان ہی کو بخش رہی ہیں۔ تو نہال ہو گئیں۔ آنکھیں بھر آئیں۔
وسیم کی منگنی کا منظر آنکھوں میں گھوم گیا جہاں کسی نے لفٹ ہی نہیں کروائی۔
اس عورت کو تو بس دکھاوے کا موقع ملنا چاہیے۔ ساری چاچیوں، مامیوں، پھوپھی، خالہ کو چھوڑ کر دلہن کی دادی آ گئی۔
"مجھ سے کون سا اوپر چڑھا جائے گا۔" دادی نے تھوڑی کنی کترائی۔
"ارے دادو نیت ہونی چاہیے۔ یہ کون سا مشکل ہے۔"
سفید شلوار قمیص پر سبز پٹکا گلے میں ڈالے عبید قریب آیا۔ اپنے کزن کو اشارہ کیا۔ ایک آدھ منٹ میں دادی کرسی سمیت اسٹیج پر تھیں۔ اس سے آگے میز تھی۔ آرائشی لوازمات تھے۔
ارم مسکرا کر اٹھی۔ اور دادی کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ہتھیلی ان کے گھٹنے پر رکھ دی۔
آخر آسیہ کی بیٹی تھی۔ گلابی نازک سی گوری ہتھیلی دادی کے سامنے تھی۔
"اے کاش اس ہاتھ پر۔"

دادی نے دل سے اٹھتی ہوک کو دل میں ہی دبا کر ہر خیال کو جھٹکا اور ارم کی نیکی پر ڈھیروں دعائیں رقم کر دیں۔

دو قدم پیچھے کھڑی ثانیہ متحیر تھی۔ یہ ساری فیملی ہی کھسکی ہوئی تھی۔

''کہاں گم ہو۔'' عقب سے عبید نے اس کے کندھے سے کندھا ٹکرایا۔

''یہ ہو کیا رہا ہے۔''

''اسے بزرگوں سے دعائیں لینا کہتے ہیں۔ جب ان کے بوڑھے دل مسکراتے ہیں تو اللہ مقدر میں بڑی کامیابیاں لکھتا ہے۔''

ثانیہ نے دیکھا دادی کے چہرے کی ہر جھری۔ سرمہ لگی بوڑھی آنکھیں اور پوپلے لبوں پر ہنسی کے پھول کھلے تھے جب رواں رواں مسکرا رہا تھا تو محو دعا کیوں نہ ہوتا۔ اور ساری دعائیں کس کے مقدر میں لکھی جا رہی تھیں۔

دادی نے جھک کر ارم کی روشن پیشانی چوم لی۔

''ہر دعا مستجاب نہیں ہوتی۔''

اس کی خود کلامی اس کے کندھے پر جھکے عبید کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''جب اللہ نے کہہ دیا کہ میں تمہاری دعائیں سنتا ہوں۔ نہ قبول ہوں تو اس سے بہتر عطا کرتا ہوں۔ تو پھر اپنی دعا کی قبولیت پر اصرار کیسا؟''

سارے صوفی اسی گھر میں پیدا ہونے تھے۔

وہ چڑ کر آگے ہوئی۔

''دادی تھوڑی دعائیں پوتی کے لیے بھی بچا لیں۔'' ثانیہ ارم کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

''دعائیں مفت میں نہیں ملتیں۔ کمائی جاتی ہیں۔''

دادی کو تازہ تازہ عزت اور اتنا پروٹوکول ملا تھا انہوں نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ حاضرین کے قہقہے برجستہ تھے ثانیہ جز بز ہوگئی۔

''ثانیہ بھابھی! دادی کا گھٹنا پکڑ لیں ہو سکتا ہے کچھ دان کر دیں۔'' عبید کی کزن نے آواز لگائی۔

''مجھے ان کی دعاؤں کی ضرورت نہیں۔''

ثانیہ نے سر جھٹک کر میوزک والے کو اشارہ کیا کہ والیم تیز کر دے۔

☆☆☆

''سارے دنیا کے میسنے گھسے اس گھر میں جمع ہیں۔ ہمیں تو ساری زندگی ایسے دکھاوے نہ آئے۔'' نادرہ کو تپ چڑھی تھی۔ جب سے واپس آئی تھیں یونہی بولتی جا رہی تھیں۔ شبیر خاموشی سے کھانا اور دادی فیرنی کھاتی رہیں جو ارم کے گھر سے آیا تھا۔

''اور یہ بڑھ بڑھ کر اس لڑکی کا منہ ماتھا چوم رہی تھیں۔ یہ بھی خیال نہ آیا کہ اس لڑکی نے گھر بلا کر بے عزتی کی تھی۔ ان کے پوتے کے رشتے کو ٹھکرایا تھا۔''

''تم بھی تو تیار شیار ہو کر چلی گئی تھیں۔ بیٹے کا اتنا دکھ تھا تو نہ جاتیں۔'' دادی بڑبڑائیں۔

''بیٹی کی سسرال کا معاملہ نہ ہوتا تو کبھی نہ جاتی...... اور خیر میرے لیے کون سی نئی بات ہے۔ بیٹی کے سسرال والوں نے ہمیشہ جوتیاں ہی چٹوائی ہیں۔'' نادرہ نے تڑخ کر کہا۔

شبیر خوامخواہ کھانسنے لگے۔

''پانی سامنے رکھا ہے۔'' نادرہ نے چڑ کر کہا۔ شبیر نے دو گھونٹ پانی کے لے کر گلاس رکھا۔

"سنا ہے لڑکے والوں نے جہیز نہیں لیا۔" دادی نے پوچھا۔
"خوامخواہ کی باتیں جہیز نہیں لیا ہوگا تو ٹھوک کر پیسہ دے دیا ہوگا۔ دولاکھ تو عبید پکڑا ئے ہیں۔ میں تو کبھی تمی۔ بیوی کی دفعہ ہاتھ دبانا اور بہن کی دفعہ لٹانا اسی گھر کی ریت ہے۔"
"ہاں تو اس کے بھائی کے پیسے تھے بہن کو دے دیے۔ ثانیہ کو کس بات کی تکلیف ہے۔" شبیر بگڑ کر بولے۔
"اچھا تو اصل دکھ دولاکھ کا ہے۔" دادی نے صحیح نبض پکڑی۔
"میں نے بھی کہہ دیا ہے۔ آہستہ آہستہ عبید کی تنخواہ اپنے قبضے میں کرنا، ورنہ ساری زندگی ماں کی طرح سر پکڑ کر روؤ گی۔ اور وہ بہن کا گھر بھرتا رہے گا۔" نادرہ نے دادی کی بات کو نظر انداز کرتے ہاتھ نچاتے کہا۔
"اسے کوئی اچھی عقل نہ دینا۔" شبیر نے بگڑ کر کہا۔
"اچھی عقل والیاں ساری زندگی میری طرح رلتی ہیں۔ بس کریں اور کتنی فیرنی کھائیں گی۔ پیٹ خراب ہو گیا تو میری جان کو مصیبت۔"
وہ غصے میں جاتے جاتے دادی کو بھی ٹوک گئیں۔ دادی تملا گئیں۔
"اس کو لگتا ہے اس میں عقل تھی۔"
"یہ وسیم ابھی تک نہیں آیا۔" شبیر نے بات پلٹی۔

☆☆☆

"جھمکا۔" ثانیہ کے اشارے پر ارم نے اپنا جھمکا چھولیا۔
ثانیہ نے تصویر کھینچ لی۔ ارم سفید اور پیلے پھولوں سے سجے جھولے پر بیٹھی تھی۔ رسم ختم ہوگئی تھی۔ مہمان کھانے کے بعد خوش گپیوں میں مصروف تھے تو کچھ سونے کی تیاریوں میں۔ ارم بھی تھک گئی تھی۔ مگر ثانیہ کے جوش کی وجہ سے رک گئی۔ وہ اپنے موبائل میں اس کی تصویریں لے رہی تھی۔
اس نے یہ والی تصویر بھی عفان کے نمبر پر سینڈ کردی۔
عفان نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔
وہ کسی ایک تصویر میں بھی نمایاں نہ تھی۔ جھمکا۔ چوڑی۔ مہندی۔ بندیا۔
وہ خاموشی سے جھمکا چھوتے ہاتھ کو دیکھتا رہا۔
احساسات عجیب سے تھے۔ دل کہتا تھا۔
وہ جو ایک خوب صورت بندھن میں بندھے جا رہے ہیں۔ تو اس کی خوب صورتی کو بھی محسوس کرو۔
مگر دماغ میں فتور بھرا تھا۔
جو کہتا ہے یہ رشتہ عمر بھر کا ہو سکتا ہے مگر دل کا نہیں۔
محبت مت کرنا خوار کرتی ہے چھوڑ دیتی ہے۔ راستہ بدلنے میں دیر نہیں لگاتی۔
وہ خاموشی سے جھمکا چھوتے ہاتھ کو دیکھتا رہا پھر تصویر کو کلوز کیا۔
ہتھیلی پر اس کا نام نمایاں تھا۔
"تجسس کے مارے برا حال ہو جائے گا۔" ثانیہ ہنسی۔
"کس کا؟" دوپٹہ ٹھیک کرتی ارم نے چونک کر پوچھا۔
ثانیہ نے شرارت سے نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔
ارم کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"تم عفان کو بھیج رہی ہو۔"
"ہاں آتش شوق بھڑکنے دو۔"
"مت کرو ثانیہ! مجھے کیا پتا وہ کیسا ہے، کس مزاج کا ہے۔ ہو سکتا ہے اسے اچھا نہ لگے۔ میں تو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔" ارم پریشان ہوگئی۔
"لیکن میں تو اس کے بارے میں بہت کچھ جان گئی ہوں۔" ثانیہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔
"مثلاً۔" ارم نے ہلکے سے تجسس کے ساتھ پوچھا۔
عفان کے سامنے ارم کی مختلف تصویریں تھیں۔ اور ذہن ادھیڑ پن میں تھا۔ کیا آنے والی اس کی ساری ذمہ داریاں بانٹ پائے گی۔
"کیا وہ مائی کو قبول کرے گی۔"
"وہ زندگی کا ہر سکھ اسے دینے کو تیار تھا۔ کیا وہ اس کے ساتھ اس کی الجھنیں سلجھا سکے گی۔ کیا وہ اپنی زندگی میں آنے والی لڑکی سے کچھ زیادہ کی امید تو نہیں لگا بیٹھا۔"
سوال...... سوال...... سوال۔
اور جواب یہی تھا کہ اسے ارم سے بات کرلینی چاہیے۔
"یہ لو، اس کی کال آرہی ہے۔" ثانیہ چہکی ارم نے گھبرا کر روکا۔
"پلیز مت اٹھانا۔"
مگر وہ ثانیہ ہی کیا جو رک جائے۔
"کیا ہوا؟ آپ سے صبر نہیں ہوا؟" وہ ثانیہ کی آواز پر سنبھلا۔
"آپ نے کھیل ہی عجیب شروع کردیا ہے۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔"
"کیا کریں ابھی نکاح جو نہیں ہوا؟" ثانیہ آکر ارم کے پاس بیٹھ گئی۔
"ایسا تو نہیں ہے کہ دیکھا ہی نہ ہو......" اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔
"چلیں بات ہی کروا دیں۔"
"بات؟" ثانیہ نے ارم کو دیکھا۔ اس نے زور سے نفی میں گردن ہلائی۔
"آپ کی ہونے والی دلہن گھبرا رہی ہے۔"
"ابھی سے......؟ ابھی تو عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔" عفان کا لہجہ عجیب سا تھا اور ذہن کہیں اور مگر ثانیہ نے اس کا کچھ اور مطلب لیا اور دل کھول کر ہنسی۔
"بات کروا دیں وعدہ کرتا ہوں زیادہ تنگ نہیں کروں گا۔" اسے بے تحاشا ہنسنے والی لڑکیاں اچھی نہیں لگتی تھیں۔
"لو بھئی بات کرلو۔ موصوف بے چین ہو رہے ہیں۔" ثانیہ نے زبردستی ارم کے کان سے موبائل لگا دیا۔
ارم کو بات کرنا ہی پڑی۔
"السلام علیکم۔" مدھم خوب صورت لہجہ، نرم آواز...... ثانیہ کی شوخ، چنچل آواز کے بعد ارم کے نرم لہجے نے عفان کے تنے ہوئے اعصاب پر پھوار کا کام کیا۔
"کیسی ہو؟"
"اچھی ہوں۔"
عفان نے ذہن سے غبار سا ہٹتا محسوس کیا۔

"سنا ہے میری کال کا انتظار کر رہی تھیں۔" وہ یہ بات نہیں کرنے والا تھا۔ مگر پتا نہیں کیا ہوا وہ ٹریک ہی بدل گیا۔

"نہیں تو۔" اس نے بوکھلا کر ثانیہ کو دیکھا۔

عفان نے اس کا نمبر لیا تھا اور وہ لاشعوری طور پر منتظر رہی تھی۔ اس کے فوراً بعد عفان کی بہنوں اور بھابیوں نے باری باری ارم سے بات بھی کی تھی۔ مگر عفان کی کال نہیں آئی۔ مگر اب وہ یہ بات عفان سے تو نہیں کہہ سکتی تھی۔

"مطلب میں تمہیں کال کروں نہ کروں تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"ابھی ہمارے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں بنا۔"

"ہماری منگنی ہوئی ہے۔" عفان نے جتایا۔

"کچی بنیادوں پر پکی عمارتیں کھڑی نہیں کرتے۔"

"بس ایک رات کا فاصلہ ہے۔"

"پھر آپ کو حق حاصل ہوگا۔"

عفان کو ماننا پڑا۔ وہ جتنی بھی معصوم اور سادہ نظر آتی تھی۔ اپنے خیالات میں مضبوط اور واضح تھی۔ اسے اچھا لگا۔

"اف...... مہندی کی رات کون اتنی سنجیدہ باتیں کرتا ہے۔" ثانیہ نے سر پیٹ لیا۔ اسے اپنی باری یاد آئی۔

"چلیں اب خدا حافظ کہہ دیں آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" ثانیہ نے موبائل ارم کے ہاتھ سے لے لیا۔

تو عفان نے گڈ نائٹ کہہ کر کال کاٹی بعد میں یاد آیا اس نے ارم سے کچھ اور کہنے کے لیے کال کی تھی۔

☆☆☆

سارے کمرے مہمانوں سے بھرے تھے۔ خود ارم کے کمرے میں بھی اس کی کزنز براجمان تھیں۔ آسیہ نے اسے دودھ کا گلاس دے کر سونے کی تاکید کی تھی تاکہ صبح فریش اٹھے۔ مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

وہ باہر نکل آئی۔ اوائل اپریل کی خوش گوار رات گرما اور موتیے کی خوشبو سے بوجھل تھی۔ اس کا دھیان خود بخود عفان کی طرف چلا گیا۔

وہ اس کا ہمسفر بننے جا رہا تھا۔

"پتا نہیں مزاج کا کیسا ہوگا۔"

ایک دو ملاقاتوں اور باتوں سے کیا اندازہ ہو سکتا تھا۔

"پگلی! تم ابھی تک سوئی نہیں۔" عبید اپنے کام سمیٹ کر ابھی ابھی آیا تھا۔ ارم اداسی سے مسکرائی۔

"بے چینی سی ہو رہی ہے۔ سب اتنی اچانک ہو گیا۔ ڈر سا لگا ہے اجنبی لوگ ہیں۔" وہ بھائی سے کہے بغیر نہ رہ سکی۔ عبید نے مسکرا کر اس کی ناک کھینچی۔

"میری بہن اتنی اچھی ہے کہ بہت جلد ان کی اجنبیت اپنائیت میں بدل جائے گی۔"

"عبید! مجھ سے وعدہ کرو۔" ارم نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑا۔ وہ بچپن میں بھی اسی طرح عبید کا ہاتھ پکڑ کر پکا وعدہ کیا کرتی تھی۔

"نہ بھئی اب یہ وعدے جا کر عفان سے لینا میں نے تمہارے بہت نخرے اٹھا لیے۔" عبید نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"وعدہ کرو۔ میرے بعد امی ابو کا بہت خیال رکھو گے۔ ان کے معاملے میں ہمیشہ اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔

میں جانتی ہوں ان کے ساتھ زیادتی بھی ہوگئی تو وہ کبھی خود سے تمہیں نہیں کہیں گے۔"
بیٹی کا صرف جسم رخصت ہوتا ہے۔ روح تو میکے کی دہلیز پر چھوڑ آتی ہے۔ زندگی تو ماں باپ کے گھر میں گزرتی ہے۔ باقی تو بس ذمہ داریاں نبھانی ہوتی ہیں۔
"تمہیں سسرال سے بلالیا کروں گا۔ پگلی کیا وہ صرف تمہارے پیرنٹس ہیں۔" عبید نے اس کے سر پر چپت لگائی۔
"اب جاکر سو جاؤ۔"
"مجھے ابھی عشاء پڑھنی ہے۔"
"میرے کمرے میں چلی جاؤ۔ میں یہاں کہیں سو جاؤں گا۔"
ارم وضو کر کے کمرے میں آئی تو ثانیہ ابھی تک کروٹیں بدل رہی تھی۔
"تمہیں بھی نیند نہیں آ رہی۔"
"ہوں۔" ثانیہ بیٹھ گئی۔ ارم نے جائے نماز اٹھا کر بچھائی۔
"شاید تھکاوٹ زیادہ ہوگئی ہے۔"
ارم نے نماز شروع کر دی۔
ثانیہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اندر کی بے چینی حد سے سوا تھی۔
"کیا میں ٹھیک کر رہی ہوں۔" یہ سوال ہر وقت اس کے سر پر ہتھوڑے کی طرح برستا۔ مگر وہ نظر انداز کر جاتی۔
سامنے بڑی سی چادر اوڑھے لڑکی اپنے رب کے حضور کھڑی تھی۔ اس کے رکوع و سجود، قیام، کہیں بھی عجلت نہ تھی۔ سکون ہی سکون جیسے سب کچھ اپنے رب کے حوالے کر چکی ہو۔
ثانیہ کو یاد نہ آیا اس نے آخری بار عشاء کی نماز کب پڑھی تھی۔
وہ کبھی بھی نماز کی پابند نہ رہی تھی نہ اس کے گھر کے باقی افراد کبھی دو پڑھ لیں تو کبھی تین...... فجر اور عشاء تو شاید مہینوں بعد ہی پڑھی جاتی تھیں۔
"لیکن میں کیوں گلٹ میں مبتلا ہوں۔" وہ جھنجھلا کر لیٹ گئی۔
"یہ رشتہ میں نے نہیں اس کے گھر والوں نے طے کیا ہے۔ ہر مشکل کا وبال ان ہی کے سر ہوگا۔"
خود کو تسلی دے کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

اپنے شادی کے جوڑے میں خود کو پور پور سجائے سارا زیور پہنے وہ آج کی دلہن لگ رہی تھی۔ بیوٹیشن نے کہا تھا۔ وہ اسے سوفٹ لک دیں گی تاکہ وہ برائیڈ سے مختلف نظر آئے۔ مگر اس کا اصرار تھا اسے وہی میک اپ چاہیے جو ارم کا کیا تھا۔ ارم کو کئی دفعہ لگا وہ نارمل بی ہیو نہیں کر رہی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اس فنکشن میں ارم سے زیادہ خوب صورت لگے۔ وہ عبید کو یاد دلانا چاہتی تھی اس کی بیوی کیا کمال کی شے ہے۔
وہ اسے دیکھ کر پھر سے مبہوت ہو جائے۔
ٹھٹک جائے چلنا بھول جائے۔
وہ واقعی ٹھٹک گیا۔
وہ انہیں پارلر سے پک کرنے آیا تھا۔
"تمہیں کیا ہوا؟" اس نے سر تا پا ثانیہ کو دیکھا۔ وہ جو گردن اکڑائے کھڑی تھی۔ پزل سی ہوگئی۔

''کیا ہوا؟ اچھی نہیں لگ رہی؟'' اس نے پھر سے آئینے میں خود کو دیکھا۔

''بہت اچھی لگ رہی ہو۔ مگر یہ دوبارہ دلہن بننے کا شوق کہاں سے آ گیا۔'' وہ ہنسا۔

''تم بھی ڈھنگ سے تیار ہو جاتے۔''

''ٹائم ہی کہاں ملا اب جلدی کرو۔ بارات آ چکی ہے۔ ارم ریڈی نہیں ہے۔''

''ہوں لے کر آتی ہوں۔'' ثانیہ کو ہلکی سی مایوسی نے گھیر لیا۔ وہ تعریف تو کر رہا تھا۔ مگر اس تعریف میں والہانہ پن مفقود تھا۔

تب ہی ارم آ گئی۔

لبوں پر ہلکی سی مسکان۔

آنکھوں میں حیا کے رنگ۔

بھائی کا سامنا کرنے سے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

''ماشاءاللہ! ہماری ارم تو بہت ہی حسین لگ رہی ہے۔ ہے نا ثانیہ۔'' عبید نے بے اختیار آگے بڑھ کر ارم کے سر پر ہلکے سے ہاتھ رکھا۔

''اب دیر نہیں ہو رہی۔'' ثانیہ نے چڑ کر کہا اور آگے بڑھی کہ لڑکھڑا گئی۔ عبید نے بے اختیار سنبھالا۔

''کچھ نہیں ہائی ہیل پہنی تھی تو اس لیے۔''

''ضرورت کیا تھی اتنی لمبی ہیل پہننے کی۔ اب پورے ہال میں لڑھکتی پھروں گی۔''

''مجھے سنبھالنے والے بہت ہیں۔ تم نہ سنبھالنا۔'' وہ غصے سے کہہ کر جانے لگی۔

''اس کا قد چھوٹا ہے نا شاید......''

وہ چڑ رہی تھی عبید کو مزا آنے لگا تو جان بوجھ کر بلند آواز سے بولا۔

صدمے سے ثانیہ کا برا حال ہو گیا۔ وہ ان سے بھی پہلے باہر نکل گئی۔

''آج تو تنگ مت کرو۔'' ارم نے ٹوکا۔

''انسان اپنی شخصیت کے ساتھ ہی اچھا لگتا ہے۔ وہ مجھے بہت پیاری لگتی۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے ہر چیز میں تمہارا مقابلہ کیا ہے اور اس چکر میں وہ اپنی پرسنالٹی کھو رہی ہے۔'' عبید سنجیدہ ہو گیا۔

''تمہیں اس کی عادت کا پتا تو ہے۔ اتنی حسین لگ رہی تھی مگر تم نے ذرا بھی تعریف نہیں کی۔'' ارم نے ناراضی سے کہا۔

''موقع دیکھ کر یہ فریضہ بھی انجام دے دوں گا۔'' وہ ہنسا۔ ثانیہ کو اپنی تعریف موصول ہو گئی۔ جب وہ ارم سے پہلے ہال میں داخل ہوئی تو ویٹر نے بچوں کو ہٹانا شروع کر دیا۔

''پیچھے ہٹ جاؤ بچو! دلہن آ گئی ہے۔''

ثانیہ نے گردن اکڑا کر عقب میں آتی ارم کو دیکھا جسے ان کی کزنز لے کر آ رہی تھیں۔ پھر اس نے ہنس ہنس کر ہر کسی کو بتایا۔

''جب میں آ رہی تھی تو سب کو لگا دلہن آ گئی ہے۔''

''تم بھی تو نئی نویلی دلہن ہی ہو۔'' عبید کی چاچی نے تسلی دی۔

''شادی کو وقت ہی کتنا ہوا ہے۔''

''جی اس لیے تو شادی کا جوڑا پہنا ہے۔ بعد میں کہاں موقع ملنا تھا۔'' ثانیہ ہنسی۔

قباحت اس کا شادی کا جوڑا پہن کر دلہن کی طرح تیار ہونے میں نہیں تھی۔ قباحت تو اس کے انداز و اطوار

اور چھچھورپن میں تھی۔
اسے یہ فکر نہیں تھی کہ اسے آنے والے مہمانوں کو دیکھنا ہے۔ یا ارم کو اس وقت کس چیز کی ضرورت تھی۔
وہ جہاں فوٹوگرافر کو دیکھتی اپنا فوٹو شوٹ شروع کروا دیتی۔ آتے جاتے عبید کا بازو پکڑ کر روک لیتی۔ وہ اس وقت ہزار کاموں میں الجھا ہوا تھا۔

"تم ہیلپ اتار کیوں نہیں لیتیں۔"

"کیوں؟"

"بار بار سہارے کے لیے مجھے جو پکڑ لیتی ہو۔"

ثانیہ نے چڑ کر اس کا بازو چھوڑ دیا۔ اور ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ جہاں نکاح کے لیے آنے کی اجازت مانگی جارہی تھی۔

نکاح محض تین بول تو نہیں تھے۔
تین عہد تھے۔
تین نصیحتیں تھیں۔
ان تین بولوں میں اس کی حیثیت بدل گئی تھی۔
اس کے حق دار بدل گئے تھے۔
اس کا گھر اس کے رشتے اس کی زندگی بدل گئی تھی۔
اس نے پہلا سائن کرنے سے پہلے باپ کی طرف دیکھا تھا۔
انہوں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔
وہ آج ان کے لیے چائے بنا کر ان کے کمرے میں لے کر گئی تھی۔

آج ارم کا اس گھر میں آخری دن تھا۔ اور ماں باپ کے لیے بنائی شاید آخری بیڈ ٹی باپ نے ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیا۔ ان کی آنکھ کنارے بھی آ ٹھہری تھی۔ اور وہ کہہ رہے تھے۔

"میں نے اپنی دانست میں ایک بہترین انسان کا امتحان تمہارے لیے کیا ہے۔ تم بھی اسے یہ سوچ کر اپنی زندگی میں شامل کرنا کہ تم صرف اس کے سکھ کی نہیں دکھ کی بھی ساتھی ہو۔ اس کے گھر والوں کو اپنا سمجھنا۔ عزت دو گی تب ہی عزت پاؤ گی تمہاری ذات میں محبت، نرمی اور صبر کے جو وصف ہیں۔ انہیں اپنی طاقت بنانا، نئے گھر کی بنیاد رکھتے ہوئے پرانی بنیادیں ہلا مت دینا۔"

ارم نے پہلا سائن کر دیا۔

ثانیہ نے بے اختیار اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑیں اور لب بھینچ لیے۔ آسیہ نے اس کا ایک ایک جوڑا سنبھال سنبھال کر سوٹ کیس میں رکھ کر سوٹ کیس بند کیا۔ پھر اس کی پیشانی چوم لی۔

"میرا رواں رواں تمہارے لیے دعا گو ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا شادی جھلملاتے کپڑے زیور پہن کر اپنی خواہشیں پوری کرنے کا نام نہیں یہ تو ایک امتحان گاہ ہے۔ ہماری تربیت تمہارے کردار اور سوچ کا امتحان۔"

ارم نے دوسرا سائن کیا۔

"زندگی کا نیا سفر تمہارے لیے آسانیاں لائے۔ لیکن اگر کچھ مشکل آئے تو ہمت نہ ہارنا۔ اور اگر ہمت ہارنے لگو تو پلٹ کر دیکھنا ہم تمہارے ساتھ کھڑے ہوں گے۔"

بھائی کا ہاتھ اس کے سر پر تھا۔

وہ اسے گھر سے رخصت کر رہے تھے۔ نکال نہیں رہے تھے۔ وہ سب اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ اس کی ہمت اس کا حوصلہ بن کر۔

ہال میں مبارک سلامت کا شور اٹھا۔

تو عفان چونک گیا۔ لوگ آ کر اس سے گلے مل کر اسے مبارک باد دے رہے تھے۔ وہ تیار ہو کر ماں کے سامنے آیا تو وہ گلے لگا کر رو پڑیں۔

"مجھے تو لگا تھا یہ دن دیکھنے سے پہلے ہی مر جاؤں گی۔"

"آج تو ایسی باتیں مت کریں۔" عفان اداس تھا اور ہاجرہ کیوں رو رہی تھیں۔ یہ بھی جانتا تھا۔

ابھی زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا تھا جب ان کا زبیر دلہا بنے اسی طرح ان کے سامنے کھڑا تھا۔

"نئی زندگی شروع کرنے جا رہے ہو۔ خوش رہنا۔ اسے بھی خوش رکھنا۔ اللہ تم دونوں کو آباد رکھے۔ لمبی عمر دے۔" ان دعاؤں کا تسلسل رکنے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

"میں تم سے محبت کا وعدہ نہیں کرتا ارم مگر اس رشتے کو پورے خلوص سے نبھاؤں گا۔" اس نے توقف سے گلے ملتے خود سے عہد کیا تھا۔

"توبہ۔" ثانیہ دھپ سے ماں کے قریب بیٹھی اور ساتھ ہی ہیل اتار لی عادت جو نہ تھی۔

"تو نہ پہنتی اتنی لمبی ہیل۔" نادرہ نے ٹوکا تو اسے عبید کی بات یاد آئی۔ صدمے سے ماں سے پوچھا۔

"امی میرا قد چھوٹا ہے۔"

"چھوٹا تو نہیں کافی بڑا پیکٹ ہے۔ اوپر سے سارے مہنگے میوے ڈالے ہیں۔" ثانیہ نے غصے سے ماں کو دیکھا۔ وہ دولہا والوں کی طرف سے بانٹے گئے چھوہارے پلس ڈرائی فروٹ کھا رہی تھیں۔

"دادی کیوں نہیں آئیں۔ وہ کیسے گھر پہ رہ گئیں۔" ثانیہ نے چڑ کر پوچھا۔

"بس رہنے دو کل کی فرنی کھا کھا کر پیٹ خراب کر لیا۔ میری تو بس ہو گئی۔ باتھ روم کے پاس چارپائی بچھا آئی ہوں۔ وہ جانے اور ان کا بیٹا...... میں تو کہہ آئی ہوں۔ زیادہ ضرورت پڑی تو آصفہ کو بلا لینا اس کا فرض ہے۔ میں کس خوشی میں اس کا گند دھوتی رہوں۔"

"اچھا چپ بھی کر جائیں شروع ہی ہو جاتی ہیں۔"

"عبید تو ٹھیک ہے نا تمہارے ساتھ۔"

"ٹھیک ہی ہے۔"

"اب ارم تو چلی جائے......" نادرہ کچھ کہنے لگی تھیں کہ ثانیہ نے کاٹی۔

"بس دعا کریں۔ واپس نہ آ جائے۔"

"واپس کیوں آئے گی؟" نادرہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"گھر چل کر بتاؤں گی۔" وہ پراسرار انداز میں مسکرائی۔

☆☆☆

کمرے میں سرخ اور سپید پھولوں کی آرائش تھی۔ مسرت نے اس کی کمر کے ساتھ تکیہ ٹکایا تو وہ قدرے ریلیکس ہو کر بیٹھی۔ اس کا استقبال والہانہ انداز میں ہوا۔ بہت سی رسمیں اس کے پہلو میں بیٹھا شخص قدرے خاموش تھا مگر اس نے کسی رسم کو ہونے سے روکا نہیں تھا۔

(وہ جانتا تھا ماں اداس ہے۔ زبیر کی یاد، پردیس میں بیٹھے بیٹے بیٹیاں جو شرکت نہ کر سکے تھے۔ جبکہ وہ ہر موقعہ پر ویڈیو کالز کے ذریعے شامل رہے تھے)

زیادہ تر مہمان وہ تھے جو ہال سے ہی رخصت ہو گئے تھے۔ کچھ قریبی عزیز گھر تک آئے اور رسموں کے بعد واپسی کی راہ لی۔

"بی بی جان نے کہا ہے آپ نے کھانا نہیں کھایا تو کچھ ہلکا پھلکا لے لیں۔ جوس یا پھل ......" مسرت مختلف لوازمات کے ساتھ آئی۔ بالی کی وجہ سے وہ بارات کے ساتھ نہ جا سکی۔ یہ قلق دور کرنے کے لیے بی بی جان نے اسے سونے کی بالیاں تحفے میں دی تھیں۔ جنہیں پہن کر وہ گھر میں ہونے والی ہر رسم میں اٹھلاتی رہی۔

"ابھی رکھ دو۔ بعد میں لوں گی۔" ارم نے کہا۔

"آپ کو اس گھر میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا سب لوگ بہت اچھے ہیں، بی بی جان، چھوٹے بھیا، بس تھوڑا غصے کے تیز ہیں۔"

"زیادہ غصے والے ہیں۔" ارم تھوڑا ڈر گئی۔ ان کے گھر میں تو کبھی کسی نے اونچی آواز میں بات بھی نہیں کی تھی۔

"نہیں زیادہ نہیں جب کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے تو غصہ کرتے ہیں۔ یا پھر......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"یا پھر؟" ارم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں ہم تو ملازم لوگ ہیں۔ پھر بھی ہمارا بہت خیال رکھتے ہیں۔ آپ تو اس گھر کی ملکہ ہوں گی۔" اس نے بات ٹالی۔ یعنی دوسروں کی مرضی کا خیال نہیں رکھتے۔ ارم نے یہی نتیجہ نکالا تھا۔

☆☆☆

"اب میرے پاس بیٹھے کون سی تسبیح کر رہے ہو جاؤ اپنی دلہن کے پاس۔" ہاجرہ نے ٹوکا۔ وہ جو کب سے ان کے پاس سر جھکائے بیٹھا تھا۔ مسکرا دیا۔

"آج تو غصہ نہ کریں۔"

"غصہ کیوں کروں گی۔ آج تو تم نے مجھے بڑی خوشی دی ہے۔ اس گھر کو پھر سے آباد کیا ہے اللہ تم دونوں کو شاد و آباد رکھے۔ جاؤ دلہن انتظار کر رہی ہو گی۔" وہ اچھی طرح سمجھتی تھیں۔ وہ اپنے بہن بھائیوں کے رویوں کی تلافی کرنے بیٹھا ہے انہیں اس بات کا یقین دلانے کہ وہ شادی کے بعد بھی انہیں تنہا نہیں چھوڑے گا۔

"میں ماں کو......"

"عفان۔" ہاجرہ نے ناراضی آمیز سنجیدگی سے اسے ٹوکا۔ "آج کی رات ایک لڑکی کے لیے بہت اہم ہوتی ہے۔ اس کے کچھ خواب، کچھ خواہشیں ہوتی ہیں۔ جب تم دونوں میں انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے گی تو خود بخود تمہاری ہر ذمہ داری بانٹ لے گی۔ خود سے اس کے پیر ڈالو گے تو بوجھ سمجھے گی؟"

انہوں نے بات کرتے کرتے سائیڈ دراز سے کنگن نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

"دلہن کو منہ دکھائی میں دے دینا۔"

"یہ تو......" وہ چونکا۔

"ہاں وہ یہاں سے جاتے ہوئے کچھ بھی اپنے ساتھ لے کر نہیں گئی۔" انہوں نے افسردگی سے کہا۔

عفان بنا کنگن چھوئے کھڑا ہو گیا۔

"میں ایسی کوئی بھی چیز ارم کو نہیں دوں گا۔ جسے زارا نے پہنا ہو۔"

"چیزوں کا کیا قصور ہے۔ خاندانی کنگن ہیں۔"

"میں اس کے لیے لے چکا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔" وہ کہہ کر چلا گیا۔

"گھنا...... میسنا ہر بات کا پتا ہوتا ہے۔ بس ماں کو ستاتا ہے۔"

☆☆☆

ثانیہ جب گھر میں داخل ہوئی۔

وہ گھر سے نکل رہا تھا۔ اس پر نگاہ پڑی تو رک گیا۔ ٹھٹک گیا۔ قدم اٹھانا ہی بھول گیا۔

وہ ایک شہزادی کی سی آن بان سے چلتی اس کے مقابل آئی۔

''کیا ہوا؟'' ثانیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''آج سمجھ میں آیا۔ شہزادے جنگلوں میں راستہ کیوں بھول جاتے ہیں۔'' فرخ مسمرائز سا ہو کر بولا۔

''کیوں بھول جاتے ہیں؟'' ایک خوب صورت مسکراہٹ نے ثانیہ کے لبوں کا احاطہ کیا۔

''تم جیسی کالی بلیاں راستہ جو کاٹ جاتی ہیں۔'' وہ تلخی سے کہہ کر پاس سے گزر گیا۔

ثانیہ کا نقرئی قہقہہ فضا میں بکھر گیا۔

وہ زبان سے کچھ بھی کہہ گیا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں بتا گئی تھیں۔ اس کا حسن جلا کر خاکستر کر دینے کی صلاحیت اب بھی رکھتا تھا۔

یہی ایک چیز تھی اسے صبح سے نہیں ملی تھی۔

''ثانو! تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟''

''آپ کو ایک بہت خاص بات بتانے آئی ہوں۔'' وہ جوش میں قریب آئی۔

''اندر ہی آجاؤ۔ رابعہ بھی آئی ہوئی ہے۔''

☆☆☆

تھکاوٹ سے برا حال تو تھا ہی۔ پیاس سے حلق میں کانٹے چبھنے لگے تو ٹھنڈے ٹھار جوس نے توجہ کھینچ لی۔

ابھی گلاس اٹھایا ہی تھا جب دروازہ کھلا ارم نے گھبرا کر گلاس واپس رکھ دیا۔

عفان نے اسے گلاس واپس رکھتے دیکھ لیا تھا۔

''رکھ کیوں دیا؟''

ارم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''پی لو، میں منع تھوڑی کروں گا۔''

''نہیں میں نے پی لیا تھا۔'' ارم کو گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ وہ پاس آ کر بیٹھ گیا۔ پھر گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ارم نے ایک دو گھونٹ لیے اور واپس رکھ دیا۔

وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

ارم کو پسینے آنے لگے۔

''بہت خوب صورت ہو۔''

پہلی نظر...... پہلی بات...... پہلا لمس۔

اس کا ہاتھ عفان کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس پر لکھا اپنا نام پڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' رابعہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ نادرہ بھی ٹکر ٹکر ثانیہ کا منہ دیکھنے لگیں۔

''میں نے دیکھا ہے اس لڑکی کو بھی اور اس بچے کو بھی......''

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

زارا انجرا

آئینہ

"میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ نے یہ بات ہضم کیسے کی۔ فوراً کھری کھری کیوں نہیں سنادیں۔" فہمیدہ کی کڑک دار آواز پورے گھر میں گونجی تھی، جاذب نے جلدی سے ایل ای ڈی آف کی اور مما پاپا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ عفاف بھی یقیناً اسی طرف جانے کے لیے اپنے کمرے سے نکلی تھی۔ دونوں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ رومیصہ ان سے پہلے ہی پہنچ کر صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کررہی تھی۔

"کیا ہوا ہے مما؟" جاذب نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ اورنگزیب صاحب جزبز سے کنپٹیاں مسل رہے تھے۔

"بیٹا جی صبح آپ کے والد محترم آپ کی پھوپھی جان کو بس ٹرمینل چھوڑنے گئے تھے تو انہوں نے لگے ہاتھوں بیٹی کا رشتہ بھی دے ڈالا۔" فہمیدہ نے استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے کن اکھیوں سے شوہر کو دیکھا جو اس غیر متوقع ہنگامے پر اب پشیمان ہورہے تھے کہ انہوں نے بیوی سے اس بات کا ذکر ہی کیوں کیا، خود ہی کسی نہ کسی طرح آپا کو ٹال دیتے۔ مما کی بات سن کر جہاں جاذب کو شاک لگا تھا وہیں عفاف اور رومیصہ بھی منہ کھول کر پاپا کو دیکھنے لگیں۔

"دس از ٹو مچ پاپا! کیا سوچ کے نسیمہ پھوپھی یہ بات کرکے گئی ہیں؟"

رومیصہ حیرت سے باپ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"بالکل بیٹا جی! یہی بات میں کہہ رہی ہوں کہ نسیمہ آپا کی ہمت کیسے ہوئی یہ بات کرنے کی...... اور اگر کم عقلی کی وجہ سے انہوں نے ایسا کہہ دیا تھا تو کم از کم یہ تو انہیں منہ توڑ جواب دیتے۔"

فہمیدہ کی آواز چھت پھاڑ رہی تھی۔

"ایکچوئلی مما غلطی آپ کی ہے جو آپ لوگوں کو ان کی اوقات کے مطابق ڈیل نہیں کرتیں۔ جب چھوٹے لوگوں کی بھی خوب خاطر مدارت کریں گی تو وہ تو اسی طرح سر پر سوار ہوں گے۔" جاذب بھی مارے اشتعال کے پیچ وتاب کھاتا اب مما کو قصوروار ٹھہرا رہا تھا۔

"جاذب!"

اورنگزیب صاحب گرجے۔ "وہ پھوپھو ہیں تمہاری، میری سگی بہن...... کچھ تو لحاظ رکھو۔"

"انہوں نے کون سا لحاظ رکھا اتنی بڑی بات کہتے ہوئے۔"

جاذب کے بولنے سے پہلے ہی فہمیدہ بول پڑیں۔ "ارے ان کی حیثیت ہے جو میرے بیٹے کے لیے...... رشتے کی بات......؟ ہونہہ۔"

"ماما بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ انہیں بات کرنے سے پہلے ہماری اور اپنی حیثیت کا فرق نظر نہیں آیا؟ کہاں وہ لوئر مڈل کلاس لوگ! اور رشتہ جوڑنے چلے ہمارے گھر۔" عفاف بھی کیوں پیچھے رہتی۔

"مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی ایک نارمل سی بات کا بتنگڑ بنا کر آپ کی ماما نے جو تماشا کھڑا کیا ہے۔ اس کا مقصد کیا ہے۔" اورنگزیب صاحب صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کررہے تھے۔

"مقصد صرف یہ ہے کہ آپ کی "آپا جان" کو ایسی بات کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے تھا۔ میرا بیٹا فیوچر کا ڈاکٹر ہے تو کیا ایسے گھر

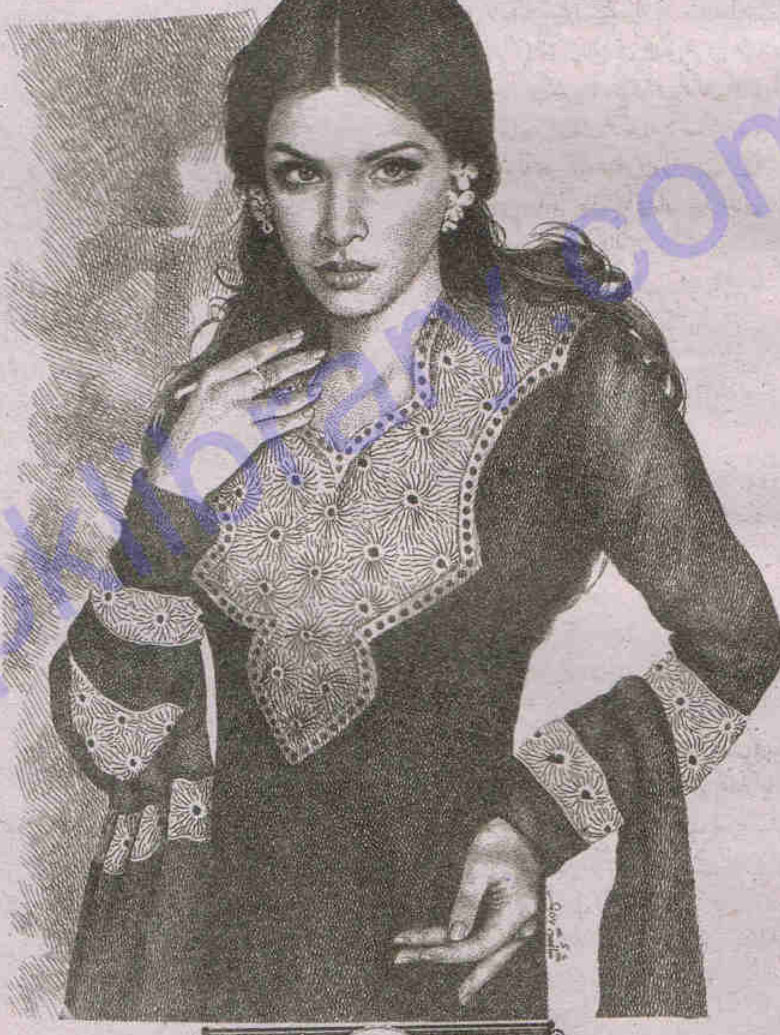
سے رشتہ لوں گی میں...... نہ تعلیم نہ شکل وصورت نہ حیثیت نہ مرتبہ۔'' فہمیدہ کا پارہ کسی صورت کم نہیں ہونے والا تھا۔

''خونی رشتوں میں حیثیت اور مرتبہ اہمیت نہیں رکھتا۔ نزہت ایک سلجھی ہوئی سلیقہ مند بچی ہے کل کو ہماری خدمت کرے گی۔ احساس کرے گی ہم سب کا۔'' انہوں نے بڑے رسان سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''زبردست! آپ کی سوئی ابھی تک ادھر ہی اٹکی ہے۔'' فہمیدہ کی بھنویں پھر سے تن گئیں۔

''پاپا پلیز! یہ ایموشنل باتیں مت کریں اور ہاں اپنے رشتہ داروں کو سمجھادیں کہ اگر ہم سے ملنا چاہتے ہیں تو ایسی بے ہودہ خواہشات کو اپنے گھروں میں ہی دفن کر کے آیا کریں ورنہ ہمیں کسی سے ملنے کا کوئی شوق ہے، نہ ضرورت۔'' جاذب پھر سے بھڑ گیا۔

''ارے لوگ تو ایسے رشتہ داروں کو منہ نہیں



لگاتے یہ تو ہمارا ظرف ہے کہ ہم کلاس ڈیفرنس کی پرواہ کیے بغیر ان سے ملتے ہیں۔"

فہمیدہ نے نخوت بھرے انداز سے کہا۔ مگر اورنگزیب صاحب شاید اپنے رشتہ داروں کی مزید توہین برداشت نہیں کر سکتے تھے سو کمبل اوپر تک لے کر سوتے بن گئے اور وہ تینوں بہن بھائی بھی سر جھٹک کر اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔

اس کے بعد بھی کئی روز تک بیوی بچے انہیں بے نقط سناتے رہے۔

☆☆☆

اورنگزیب اب یہ سوچ سوچ کر پریشان رہتے تھے کہ وہ کس منہ سے آپا کو جواب دیں گے۔ بات اگر صرف فہمیدہ کی ہوتی تو وہ یقیناً انہیں دوبارہ قائل کرنے کی کوشش کرتے مگر تینوں بچے بھی اسٹیٹس سے ہٹ کر سوچنا ہی نہیں چاہ رہے تھے اور اسٹیٹس کا فرق تو بلاشبہ تھا اور کوئی معمولی نہیں بلکہ زمین آسمان کا فرق تھا۔ اورنگزیب صاحب کے گھر میں ہر فرد کے پاس گاڑی بمع ڈرائیور ہمہ وقت موجود تھی گھر میں کئی ملازمین تھے۔

ان کے بہن بھائی بلاشبہ لوئر یا اپر مڈل کلاس سے تعلق رکھتے تھے لیکن انہوں نے کبھی رشتوں کو بھی دولت کے ترازو میں نہیں تولا تھا اور ہمیشہ اپنے بہن بھائیوں کو دل کھول کر نوازتے تھے مگر آج جب رشتے کی بات آئی تھی تو دولت کا پلڑا بھاری پڑ گیا تھا۔

پھر ایک دن آفس سے ہی انہوں نے آپا کو فون کیا اور معذرت سے انہیں انکار کر دیا۔

نسیمہ آپا کی ساری حسرتوں کا خون ہو گیا تھا، انہیں تو بڑا مان تھا۔

جس بھائی نے ہمیشہ دولت پر رشتوں کو فوقیت دی اچانک اس کے لیے دولت کیسے اہم ہو گئی۔ مگر نسیمہ آپا بھائی کی مجبوری سمجھ چکی تھیں۔ یقیناً اولاد کے آگے بے بس ہو کر ہی انہوں نے انکار کیا ہو گا۔ سو انہوں نے بڑے ظرف سے کام لیتے ہوئے پھر بھی اس بات کا گلہ کیا نہ شکوہ۔ لیکن فہمیدہ کے دل میں سسرالی رشتہ داروں کے لیے اب وہ چاہ نہ تھی اور بچے بھی اب ددھیالی رشتہ داروں سے کھنچے کھنچے رہتے تھے۔

نسیمہ ایک بار پھر بھولے سے آ گئیں۔ فہمیدہ اور بچوں نے ان کی انتہائی تذلیل کی۔ کبھی غریب ہونے کا طعنہ تو کبھی ان کی اولاد کے ان پڑھ اور معمولی شکل صورت ہونے پر تضحیک، کبھی پینڈو کہہ کر ان کا مذاق اڑایا۔ نسیمہ بمشکل دو تین دن ہی رکیں اور کان لپیٹ کر واپس چلی گئیں۔ اورنگزیب صاحب کو بھی متنبہ کر دیا گیا تھا کہ ان پر پہلے کی طرح عنایات کرنے کی ضرورت نہیں اور یہ کہ اب لوگوں کو ان کی اوقات میں رکھا جائے گا۔

"مگر کن لوگوں کو؟ صرف اورنگزیب کے عزیز واقارب کو، اپنے میکے سے تو فہمیدہ کو کوئی شکایت نہیں تھی اور انہیں تو وہ دل کھول کر نواز رہی تھیں۔

اورنگزیب پر فیملی کی طرف سے لگائی جانے والی پابندیاں بھی طول پکڑتی جا رہی تھیں۔

"نسیمہ آپا کی کال آئی تھی؟" کیا فرما رہی تھیں؟ باقاعدگی سے اورنگزیب کے فون کی چیکنگ کے بعد تفتیش ہوتی۔

"آپا نے اپنی بیٹی کے رشتے کی بات ہی کی تھی آپ لوگوں نے اس معمولی بات کو ان کا جرم ہی بنا دیا ہے۔" کبھی کبھی وہ جھنجھلا جاتے مگر کب تک...... بیوی بچوں کے آگے بے بس ہونا ہی پڑتا ہے۔

☆☆☆

"گاؤں سے شرافت بھائی کے بیٹے کی شادی کا کارڈ آیا تھا۔"

"دنیا کہاں سے کہاں سے پہنچ گئی ہے گھر گھر میں موبائل فون ہیں۔ بھلا اتنی دور شادی کا بلاوا دینے کے لیے کارڈ بھیجنے کی فارمیلٹی پوری کرنے کی کیا تک بنتی ہے۔" فہمیدہ نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

"کس کی شادی کا کارڈ؟" اورنگزیب صاحب نے نوالہ منہ میں ڈالتے پوچھا۔

''ڈونٹ نو پاپا۔'' رومیصہ نے بیزاری سے کہا عفاف اور جاذب بھی برے برے منہ بناتے کھانا میں مگن رہے۔

''آپ کے گاؤں سے ایک آدمی آیا تھا کارڈ لے کر میں نے اس سے ریسیو کر کے آپ کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔''

''جی! گاؤں سے...... دیکھ لیں کتنے عقل مند ہیں آپ کے رشتہ دار...... پورے چار گھنٹے کی مسافت طے کر کے آیا وہ غریب بندہ' پر نہیں جی کارڈ ہی بھیجنا ہے چاہے سات سمندر پار کیوں نہ ہو۔''

فہمیدہ نے اس انداز سے کہا کہ تینوں بچے طنزیہ ہنسی ہنسنے لگے۔

''ویسے پاپا دومنٹ لگتے کال پر...... مگر ماما کی بات بالکل ٹھیک ہے کارڈ ہی بھیجنا ہے چاہے سات سمندر پار ہو۔'' جاذب نے بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

''نہ جانے جو کارڈ لے کر آیا تھا اس کے ساتھ انہوں نے کیا سلوک کیا ہوگا۔'' انہیں تشویش ہوئی مگر دانستہ پوچھا نہیں تھا۔ شاز کو آواز دی کہ کارڈ لائے۔

''ارے یہ تو دو کارڈ ہیں۔'' انہوں نے زیر لب کہتے ہوئے یکے بعد دیگرے دونوں کارڈز کھول کر دیکھے۔

''شرافت بھائی کے بیٹے عرفان کی شادی نزہت کے ساتھ۔'' دونوں گھروں سے کارڈز آئے تھے اور اورنگزیب صاحب کو اس رشتے کی بہت خوشی ہوئی تھی مگر انہیں دکھ بھی ہوا تھا کہ ان سے مشورہ کیے بغیر ہی شادی بھی طے کر لی۔ بیوی بچوں نے جو طنز کیا وہ الگ۔

''دیکھ لیا ساری زندگی آپ جن کی محبتوں کا دم بھرتے رہے کیسے انہوں نے آپ کو پرایا کر دیا۔ رشتوں کی بھنک بھی نہ پڑنے دی اور غیروں کی طرح دعوت نامہ بھیج دیا۔'' فہمیدہ ہر وقت شوہر کو جتاتی تھیں۔

''بھئی ایسی لو اسٹینڈرڈ شادی آپ کو ہی مبارک ہو ہم تو جانے سے رہے۔'' فہمیدہ نے شوہر کو پیشگی مطلع کر دیا۔ اور پھر اورنگزیب صاحب بھی آفس کی مصروفیت کی وجہ سے صرف ولیمہ پر ہی جا سکے۔ سب بہن بھائی اور خاندان والے ان کا اس طرح اکیلے اور عین وقت پر غیروں کی طرح آنے پر خاصے حیران تھے۔ اورنگزیب صاحب نے اچھی خاصی رقم سلامی کے طور پر بھتیجے کو دی اور بھانجی کے جہیز کے لیے بھی کل رقم دی یہ الگ بات کہ یہ سب ان کی اپنی فیملی سے مخفی تھا۔

''اگر بچیاں بھی شادی پر آجاتیں تو کم از کم مل ہی لیتے...... کتنا عرصہ ہو گیا انہیں دیکھے ہوئے۔'' نعیمہ آپا بھائی سے گلہ کرنے لگیں۔

''آپا! آپ تو جانتی ہیں جاذب کا ایم بی بی ایس کا فائنل ایئر ہے' رومیصہ بھی میڈیکل میں ایڈمیشن کی تیاری کر رہی ہے اور عفاف کا بھی لاء کا تیسرا سال ہے خیر سے بچوں کو اسٹڈی سے ہی فرصت نہیں ہوتی۔'' انہوں نے رسان سے سمجھایا۔

''چلو میں پھر کسی وقت آؤں گی عاشر کو لے کر خیر سے اگلے مہینے آرہا ہے وہ بھی۔''

نعیمہ آپا نے خوش دلی سے کہا مگر اورنگزیب صاحب نے اوپرے دل سے ضرور آنے کا کہا پھر توجہ ہٹانے کے لیے وہ عاشر کے متعلق پوچھتے ہوئے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

☆☆☆

شومئی قسمت مہینے بعد عاشر کو ساتھ لے کر نعیمہ آپا سچ مچ اسلام آباد پہنچ گئیں۔ فہمیدہ اندر سے چاہے کتنا ہی جز بز ہوئیں مگر بظاہر اچھے طریقے سے نند کا خیر مقدم کیا۔ کھانے پر بھی کچھ اہتمام کرنا ہی پڑا یہ الگ بات عفاف اور رومیصہ سلام دعا کے بعد اپنی ایکٹیوٹیز میں بزی ہو گئیں اور جاذب ویسے ہی دوستوں کے ساتھ مری گیا ہوا تھا اور اس کی کل واپسی تھی۔ اورنگزیب مطمئن تھے چلو بیوی کا موڈ تو بہتر ہے اور ماں کی وجہ سے دونوں بچیوں کے موڈ بھی بہتر ہو گئے۔ رات کا کھانا خوش گوار ماحول میں تناول کیا گیا۔ اصل میں نعیمہ کے ساتھ ایسا رویہ رکھنا فہمیدہ کی مجبوری تھی کیونکہ نعیمہ آپا نند ہونے کے ساتھ فہمیدہ کی چچی بھی تھیں اور ان کے ساتھ ایسی ویسی بات کر کے وہ

اپنے میکے میں کوئی برا تاثر نہیں دینا چاہتی تھی۔

کھانے کے بعد چائے پی گئی۔ اورنگزیب عاشر کی ذہانت اور قابلیت سے خاصے متاثر ہوئے تھے۔ عاشر نے بی کام کیا تھا اور مزید تعلیم افورڈ نہ کرنے کی وجہ سے دبئی جا کر کام کرنے کو ترجیح دی تھی۔ جب سے وہ دبئی گیا تھا ان کے گھریلو حالات میں بہت تبدیلی آگئی تھی وہ اپنے سے بڑے واحد کو بھی دبئی بلانے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا کیونکہ واحد بھی ماسٹر کرنے کے بعد نوکریوں کے چکر میں خوار ہو رہا تھا لیکن اب چھوٹے بھائی کے بیرون ملک سیٹ ہونا چاہتا تھا۔

اگلے دن اتوار کی وجہ سے سب لوگ معمول سے کافی لیٹ جاگے تھے جو جس ٹائم اٹھتا شازو اس کی مرضی کا ناشتہ بنا دیتی۔

دوپہر کو جاذب بھی واپس آگیا۔ لنچ سب نے ساتھ مل کر کیا اسی دوران نعیمہ آپا نے اعلان کیا کہ ہم کل واپس جائیں گے۔ فہمیدہ نے سکون کا سانس لیتے دل ہی دل میں شکر کا کلمہ پڑھا مگر کچھ دیر بعد سارا سکون غارت ہو گیا جب کھانے کے بعد بچوں کے ادھر ادھر ہوتے ہی نعیمہ آپا نے لاؤنج میں بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے واحد کے لیے عفاف کے رشتے کی بات کی۔ کچھ دیر پہلے نند ہونے کی وجہ سے جو لحاظ کی چار دیواری کھڑی تھی۔ وہ بھربھری ریت کی طرح ڈھے گئی اور ظاہری خلوص و محبت کا بت بھی پاش پاش ہو گیا تھا۔

”نعیمہ آپا کیا بات کر رہی ہیں آپ؟ میرا خیال ہے آپ اپنے حواسوں میں نہیں ہیں۔“

فہمیدہ نخوت سے بولیں۔ اورنگزیب صاحب جانتے تھے کہ اب معاملہ گرفت سے باہر ہو چکا ہے کیونکہ فہمیدہ آج نئے پرانے سارے حساب چکا دیں گی وہ پریشانی سے کنپٹیاں مسلنے لگے۔

”فہمیدہ میں بالکل ہوش و حواس میں ہوں لیکن تم شاید اپنے حواس کھو رہی ہو۔“ نعیمہ آپا کے بے تاثر انداز میں کہی گئی اس بات پر وہ اور بھڑ گئیں اور بنا لگی لپٹی کھری کھری سنانے کا سوچا۔

”آپ بڑی ہیں میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں مگر آپ کو شاید عزت راس ہی نہیں، پہلے آپ کی دوسری بہن اپنی بیٹی کا رشتہ لے کر ہمارے در پر آئی اور اب آپ جھولی پھیلائے کھڑی ہیں۔“

فہمیدہ نے طنزیہ ہنسی ہنستے تحقیر آمیز الفاظ میں نعیمہ آپا کو ذلیل کرنا چاہا جوان کی بات سن کر اب بہن کی حماقت پر حیران ہو رہی تھیں کہ بیٹی کا رشتہ لے کر آگئی تھی۔

”جاذب بالکل ٹھیک کہتا ہے کہ لوگوں کو اگر ان کی اوقات میں نہ رکھا جائے تو وہ یونہی سر پر سوار ہو جاتے ہیں (جاذب اور عاشر بھی وہیں آگئے تھے اور عفاف اور رومیصہ بھی ہنگامے کی آواز سن کر بھاگی آئی تھیں)

”کیا اوقات ہے آپ کی جو آپ نے اتنی بڑی بات کی۔ ساری زندگی ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے ہماری اترن پہننے والوں کے ساتھ میں رشتے جوڑوں گی؟؟ پانچ مرلہ کا مکان ایک موٹر سائیکل اور معمولی کالجوں میں پڑھے بچے اس سے بڑھ کر کیا ہے آپ کے پاس؟ بس اتنی سی اوقات ہے آپ کی اور چلی آئیں میری بیٹی کا رشتہ لینے...... جائیے کوئی اور در کھٹکھٹائیے۔“

وہ تن فن کرتی نان اسٹاپ بولتی رہیں۔

عاشر کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ اتنی ذلت، اتنی بے عزتی نجانے وہ کیوں اور کیسے برداشت کر رہا تھا۔ فوراً آگے بڑھ کر اس نے ماں کا بازو کھینچا اور چلنے کے لیے کہا۔

”نہیں عاشر! فہمیدہ اپنی بات کر چکی ہے اب میری باری ہے۔ نعیمہ آپا نے متانت سے کہا۔

”میرا خیال ہے جب کوئی اپنی اوقات سے بڑھ کر بات کر دے تو پھر اسے آئینہ دکھانا تو بنتا ہے نا ں میری اوقات تو پانچ مرلہ گھر اور موٹر سائیکل ہے اب میں تمہاری اوقات بتاؤں؟

تم وہی فہمیدہ ہو جس نے میرے لائق فائق خوب صورت بھائی کی تعلیم سے متاثر ہو کر خود آ کر مجھ سے اپنے رشتے کی بات کی تھی۔ تمہیں اپنے باپ کے گھر میں دو وقت کی روٹی بھی میسر نہ تھی تو تم نے اپنا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے میرے بھائی کو پھانسا اور پھر رشتے کے لیے میری منت سماجت کی۔

تمہیں یاد ہے نا کہ بارات کے نام پر آئے دس صرف ''دس'' لوگوں کے لیے چائے پانی کا انتظام بھی اورنگزیب نے خود کیا تھا اور تمہیں یہ بھی یاد ہے کہ تمہاری بہن کے رشتے سے لے کر شادی کے تمام اخراجات بھی ''میرے بھائی'' نے اٹھائے تھے اور یقیناً تم یہ بھی نہیں بھولی ناں کہ تمہارے دونوں بھائیوں کو گھر اور کاروبار اورنگزیب نے ہی بنا کے دیئے تھے۔ یہ ہے تمہاری اوقات...... جس دولت کا تم مان کر رہی ہو میرے بھائی میرے ماں جائے کی کمائی ہے جو تم دونوں ہاتھوں سے میکے پر لٹاتی ہو۔

تم نے بالکل ٹھیک کہا اگر لوگوں کو ان کی اوقات کے مطابق نہ رکھا جائے تو وہ سر پر چڑھ کر ناچتے ہیں۔ نعیمہ آپا نے آخری لفظوں پر خاصا زور دیا۔

''اگر ہم بھی سسرالی بن کر تمہیں تمہاری اوقات کے مطابق ڈیل کرتے تو آج تم بھی اپنی اصلیت نہ بھولی ہوتیں۔''

''چلو عاشر''

بیٹے کو ساتھ لے کر نعیمہ آپا چلی گئیں اور فہمیدہ گم صم انہیں باہر تک جاتا دیکھتی رہیں اور پھر ان کے جانے کے بعد اورنگزیب صاحب کی وہ شامت آئی کہ خدا کی پناہ...... پھر جب تک انہوں نے اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ قطع تعلق کی ہامی نہ بھری فہمیدہ نے جان بخشی نہ کی۔

☆☆☆

جاذب کو ہاؤس جاب مکمل ہوتے ہی نوکری مل گئی تھی اور اب اس کا ارادہ نیورولوجی میں اسپشلائزیشن کا تھا۔ عفاف بھی بار ایٹ لا کے لیے باہر جانا چاہتی تھی مگر فہمیدہ کو اس کی شادی کی فکر تھی اورنگزیب بھی دونوں بڑے بچوں کی شادی کی فکر سے آزاد ہونا چاہتے تھے کیوں کہ رومیصہ کا تو ایم بی بی ایس کا سکینڈ ایئر تھا۔ عفاف کے لیے کافی رشتے دیکھنے کے بعد انہیں آفاق اچھا لگا تھا۔ ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھنے والا خاصا ہینڈسم لڑکا تھا ایسے ہی رشتے کی تو خواہش تھی فہمیدہ کو، سو انہوں نے جھٹ پٹ منگنی کردی اور اب جاذب کے رشتے کے لیے کمر کس لی۔

زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا تو، انہیں پریشے پسند آگئی۔

ماڈرن اور خوب صورت سی پریشے جاذب کو بھی بہت پسند آئی تھی اور انگیجمنٹ پریڈ میں ہی دونوں میں کافی

انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ فہمیدہ نے اپنے میکے سے صرف اکادکا لوگوں کو بلایا۔ شادی کے تمام فنکشنز شہر کے مہنگے ہوٹل میں رکھے گئے لیکن بہو بیگم کے ہائی فائی خاندان کا بھانڈا بارات پر ہی پھوٹ گیا۔ پتا چلا کہ لڑکی کے سگے باپ کو دوسری بیوی نے ملائیشیا سے نہ آنے دیا اور بھائی تو کوئی تھا نہیں سو محترمہ جہیز کے نام پر ایک عدد مما کو ساتھ لے آئیں۔ مہمانوں میں ہونے والی چہ میگوئیوں اور اس کے نتیجے میں لوگوں کی طرف سے اٹھنے والے سوالات سے بچنے کے لیے فہمیدہ نے اعلا ظرفی سے کام لیتے ہوئے بہو کے حالات پر پردہ پوشی ڈالنا ہی مناسب سمجھا کیونکہ اگر ایسا نہ کرتیں تو اپنی ہی جگ ہنسائی ہوتی۔ خیر بہو کے ساتھ اس کی ماں کو بھی قبول کرنا پڑا۔ پریشے کی فرمائش پر ان کا روم فرنشڈ کیا گیا اس کی فرمائش پر ہی جاذب نے ہنی مون کے لیے یورپ جانے کا پلان کیا۔ فہمیدہ کے لیے یہ سب ہضم کرنا مشکل تو تھا مگر نئی نئی شادی کی وجہ سے چپ تھیں۔

عفاف کی وجہ سے خاصی پریشان تھی کہ اس کی انگیجمنٹ جاذب سے پہلے ہوئی تھی مگر اس کے سسرال والے شادی کے لیے ابھی تک ٹال مٹول کر رہے تھے۔ کتنا اصرار کیا تھا اورنگزیب نے کہ جاذب کی اور عفاف کی شادی اکٹھی کی جائے مگر آفاق کے گھر والے ماننے کو تیار ہی نہ تھے اور انگزیب صاحب کو کہیں سے اطلاع ملی تھی کہ انہوں نے اپنے بیٹے کی کئی نام نہاد منگنیاں کی ہیں وہ صرف لڑکی والوں سے قیمتی جیولری اور باقی قیمتی گفٹس وصول کرتے رہنے کے بعد کوئی موقع دیکھ کر منگنی توڑ دیتے ہیں۔ اور اورنگزیب صاحب اس خبر کی تصدیق بھی کروا چکے تھے۔

☆☆☆

"جاذب اپنی ساس سے کہو اب اپنے گھر جائیں کیونکہ لوگ اب باتیں کرتے ہیں بیٹا۔" وہ جیسے ہی ہنی مون سے لوٹے فہمیدہ نے بیٹے کو علیحدگی میں سمجھانے کی کوشش کی مگر پریشے نے یہ بات سن کر ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

"اگر جاذب کے والدین یہاں رہ سکتے ہیں تو میری ماما کیوں نہیں، جتنا یہ گھر جاذب کا ہے اتنا ہی میرا ہے سو میری ماما میرے ساتھ رہیں گی۔" اس نے بنا لگی لپٹی دوٹوک بات کر دی۔

"بی بی یہ ہمارا گھر ہے اور تم ہمارے ساتھ اپنی ماں کا موازنہ نہ کر رہی ہو؟ اگر بہت شوق ہے اسے ساتھ رکھنے کا تو اسی کے گھر چلی جاؤ۔" آگے بھی فہمیدہ تھیں۔

"آنٹی بی ہیو یور سیلف۔" پریشے دھاڑی۔

"مائی فٹ۔" تمہاری اوقات کیا ہے؟ اور تم مجھے بی ہیو سکھاؤ گی۔ باپ تک نے تو منہ نہیں لگایا تمہیں اور جہیز کے نام پر ایک ماں اٹھا لائی ہو۔ اگر تم اپنے گریبان میں جھانکو تو تم تو ہم سے نظر ملانے کے قابل بھی نہیں۔ رشتہ کرتے وقت کیسے جھوٹ بولے تم لوگوں نے اور نکلے کیا کنگلے۔ یہ ہے تمہاری اوقات سو اب اپنی زبان سنبھال کر رکھنا۔"

فہمیدہ نے بڑی جلدی بہو کو اوقات بتا دی۔

"ماما پلیز۔ کچھ تو خیال کریں وہ پریشے کی مما ہیں میرے لیے قابل احترام ہیں، میرے دل میں جو حیثیت آپ کی ہے وہی ان کی ہے۔ لیکن مجھے آپ کی کم ظرفی پر افسوس ہے، پریشے کی مما کو تو چار دن آپ برداشت نہیں کر سکیں لیکن اپنے میکے والوں کو تو آج تک پال رہی ہیں اور اگر پریشے کا خاندان کنگلا ہے تو آپ کے خاندان کی حقیقت بھی مجھے معلوم ہے۔ ایک اور بات پریشے کی اوقات یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر جاذب کی بیوی ہے۔ آپ کو اپنا گھر مبارک ہو، میں پریشے کو اور آنٹی کو لے کر الگ گھر میں چلا جاؤں گا۔"

فہمیدہ کو ایک بار پھر وقت نے آئینہ دکھا دیا تھا۔ ان کا بیٹا انہیں کم ظرفی کا طعنہ دیتے ہوئے ان کی اوقات بتایا گیا تھا۔ فہمیدہ نے رشتوں پر دولت اور اسٹیٹس کو اہمیت دی تھی مگر نہ اسٹیٹس ملا نہ ہی رشتے رہے تھے۔ رشتوں کی قدر نہ کرنے والوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

☆☆

حمیرا شفیع

دل کا آنگن سونا ہے

ناولٹ

رمضان المبارک کا مقدس مہینہ سایہ فگن ہو چکا تھا۔ آج پہلا روزہ تھا۔ روزہ کھلنے میں بس ایک آدھ گھنٹہ ہی باقی تھا، افطاری کی تیاری کرتے ہوئے پچو کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے آج بہت دنوں کے بعد اس نے کچن کو رونق بخشی تھی۔

عافیہ بیگم جیسی سگھڑ اور ذمہ دار خاتون خانہ کے



ہوتے ہوئے ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔

یہ تو کچھ ہنگامی صورت حال ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اسے ہانڈی چولہا دیکھنا پڑ رہا تھا۔ دراصل ماہ پارہ کی صحت ابھی پوری طرح سے بحال نہیں ہوئی تھی مگر اس نے ضد کر کے روزہ رکھ لیا تھا۔

ماموں جان نے سمجھایا بھی تھا کہ مریض کو رعایت ہوتی ہے مگر وہ نہیں مانی۔ سحری بھی برائے نام کی تھی۔ ابھی آدھا دن بھی نہیں گزرا تھا کہ نڈھال ہو گئی۔ ٹانگوں کے زخموں سے الگ درد کی ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔ پہلے تو وہ پین کلر پھانک لیتی تھی مگر اب روزے کی وجہ سے وہ بھی نہیں لے سکتی تھی۔

احسن صاحب گھر آئے تو انہوں نے عافیہ بیگم سے کہا کہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔ اس کے زخموں کا معائنہ بھی کروالیں گے اور اس کے لیے عمدہ سی ملٹی وٹامن ٹیبلیٹ بھی تجویز کروالیں گے جو وہ افطاری یا سحری میں لے سکے تاکہ کمزوری نہ ہو۔ اب وہ سب وہیں گئے تھے۔

یوں تو عافیہ بیگم نے دوپہر میں ہی افطاری کے لیے کھانا وغیرہ بنا کر فریج میں رکھ دیا تھا۔ ارادہ تھا کہ واپسی پر دیگر لوازمات تیار کریں گی۔

انہوں نے خاص طور پر دہی بڑوں کا سامان منگوایا تھا، کیونکہ ان کے بقول ماہ پارہ افطاری میں دہی بڑے نہایت شوق سے کھاتی تھی۔ مگر ابھی کچھ دیر پہلے ہی ماموں جان کا فون آیا تھا کہ وہ لوگ ٹریفک میں پھنس گئے ہیں۔ آنے میں شاید دیر ہو جائے۔ یوں تو گھر میں کھجوریں وغیرہ بھی موجود تھیں۔ مگر پچو نے سوچا کہ وہ خود ہی دہی بڑے بنا لیتا ہے یہ کون سی کوئی مشکل ڈش تھی۔ دہی پھلکیاں تو وہ اکثر بناتا ہی رہتا تھا۔ فقط ابلے آلو، چنے، ٹماٹر اور پیاز وغیرہ ہی شامل کرنے تھے۔

جب تک وہ لوگ پہنچے وہ دسترخوان سجا چکا تھا۔ چند منٹ بعد روزہ بھی کھل گیا۔ ماموں جان تو چٹ پٹی چیزوں سے پرہیز کرتے تھے۔ عافیہ بیگم نے بھی کھجور اور شربت سے ہی روزہ کھولا، البتہ ماہ پارہ سر جھکائے رغبت سے دہی بڑے کھا رہی تھی۔

''ماموں جان! آپ بھی چکھیں نا۔'' اس نے مسرور سا ہو کر کٹوری ان کی جانب بڑھائی۔ اس کے اصرار پر انہوں نے چمچ بھر کر منہ میں ڈالا۔

ہائیں یہ کیا...... اتنا میٹھا۔

ہمارے ہاں تو کبھی میٹھے دہی بڑے نہیں بنے۔'' ماموں جان نے کٹوری پرے ہٹائی۔ وہ شوگر کی وجہ سے ویسے بھی میٹھے کا پرہیز کرتے تھے، اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

عافیہ بیگم نے شاید ڈبوں کی ترتیب بدل دی تھی۔ اور اس احمق نے بغیر سوچے سمجھے نمک کی جگہ چینی شامل کر دی تھی۔ اس نے ایک بار پھر دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ ماہ پارہ اسی رغبت سے دہی بڑے کھا رہی تھی۔

وہ بھی اطمینان سے کھانا کھانے لگا۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ ماموں جان اسے کیسی گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دراصل وہ دل میں سوچ رہے تھے کہ پچو نے شاید ماہ پارہ سے ازلی پرخاش کی وجہ سے جان بوجھ کر یہ حرکت کی ہے۔

ویسے بھی وہ اس کی گھر میں آمد کے بعد سے کچھ زیادہ ہی گم صم سا رہنے لگا تھا۔ نجانے وہ ماہ پارہ سے ابھی تک اتنا خائف کیوں تھا حالانکہ ماضی کے برعکس اب تو وہ بے چاری لاتعلق اور بے ضرر سی نظر آتی تھی۔ وہ ایک الگ ہی نہج پر سوچ رہے تھے۔

☆☆☆

چچی جان کچن میں داخل ہوئیں تو عجیب سی افراتفری اور بے ترتیبی کا ساں تھا۔ سنک برتنوں سے بھرا تھا۔ ماسی نے شاید چھٹی کر لی تھی، چولہے پر نجانے کب سے دودھ ابل رہا تھا۔ انہوں نے ڈھکن ہٹایا تو دل دھک سے رہ گیا۔ تین کلو دودھ ابل ابل کر فقط دو گلاس بچا تھا۔ ان کے اندر اشتعال کی ایک لہر اٹھی۔

بہو کی تلاش میں باہر نکلیں۔ اس کے بیڈ روم کا

دروازہ بند تھا۔ گیراج میں اس کی اسکوٹی غائب تھی۔ غالباً اسی پر مٹر گشتی کرنے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ یہ اسکوٹی وہ اپنے ہمراہ جہیز میں لائی تھی۔ یونی ورسٹی بھی اسی پر آتی جاتی تھی۔

پہلے پہل تو چچی کو بہت اچھا لگا۔ وہ تو ساری عمر کہیں بھی آنے جانے کے واسطے شوہر اور بیٹوں کی محتاج رہی تھیں۔ ان کے پاس بھی ہزار بہانے ہوتے تھے۔ کبھی موٹر سائیکل کی ٹینکی میں پیٹرول نہ ہوتا اور کبھی وہ اپنی کسی مصروفیت کی وجہ سے صاف انکار کر دیتے۔ مگر بہو بیگم کی ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی جب جی چاہتا بائیک کو کک لگاتی اور فراٹے بھرتی نکل جاتی۔ اس کی اس شتر بے مہار روش سے تنگ آ کر انہوں نے ایک دن بیٹے سے شکایت جڑ دی وہ لاپروائی سے بولا۔

”اچھا ہے نا اماں! خود ہی چلی جاتی ہے۔ میرے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے۔ آپ بھی چلی جایا کریں اس کے ساتھ۔ قسم سے بڑی اچھی بائیک چلاتی ہے فری۔“

وہ بڑبڑاتے ہوئے کچن میں آئیں فریج سے کھچڑی نکال کر اوون میں گرم کی اور پلیٹ لیے اپنے بیڈروم میں چلی آئیں، سامنے پلنگ پر چچا میاں دراز تھے۔ دائیں بازو پر پلستر چڑھا تھا۔

”میری برداشت تو بھئی ختم ہو چکی ہے۔ بہو رانی ایک نمبر کی کام چور اور غیر ذمے دار ہے۔ سارا کچن الٹا پڑا ہے۔“ انہوں نے پلیٹ میاں کی سامنے رکھی۔

”ناراض مت ہوا کرو بیگم! بہو آہستہ آہستہ گھریلو امور کی عادی ہو جائے گی۔“ وہ تحمل سے بولے۔

”ارے کب ہو گی؟ ہم نے تو سولہ کا سن لگتے ہی سارا کچن سنبھال لیا تھا۔“

”ارے بھئی وہ تو پڑھائی میں مصروف رہی ہے اب تک۔ پکانے ریندھنے کا موقع پہلے کہاں ملا ہو گا۔ تم نے تو ساتویں جماعت میں پڑھائی چھوڑ دی تھی تو خالہ جان نے تمہیں ہانڈی چولہے کے سپرد کر دیا تھا۔“

نادانستگی میں یہ چند جملے ان کی زبان سے کیا پھسلے، مانو قیامت آ گئی۔ چچی تو پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں۔ پھٹ پڑیں۔

”ہاں۔ ہاں میں تو جاہل، ان پڑھ تھی۔ ساری عمر گھر سنبھالتی رہی۔ سب کی خدمتیں کرتی رہی۔ پڑھی لکھی ہوتی تو سب کچھ چوپٹ چھوڑ کر جب جی چاہتا گھومنے نکل کھڑی ہوتی۔

یہ بھی کوئی ننھی کاکی تھوڑی ہے جو آپ اتنی رعایت دے رہے ہیں اچھی خاصی پکی عمر کی ہے۔ میرے سے چند ہی سال چھوٹی ہو گی۔“ اس مبالغہ آرائی پر چچا جان پھر تڑپ اٹھے۔

”خدا کا کچھ خوف کرو بیگم! اپنے فرحان سے صرف دو سال ہی سینئر ہے تم نے تو اپنی ہم عمر ہی بنا لیا۔“

”بہرحال کچھ بھی کہیں۔ مجھ سے اب اکیلے کچن نہیں سنبھالا جاتا۔ پہلے تو ماہ پارہ کا بہت آسرا ہو گیا تھا۔ اسے بھی اس کی ماں لے کر چلتی بنیں۔“

”ہاں تو تم لوگوں نے بھی ٹھیک سے خبر گیری نہیں کی اسپتال میں اس کی۔“

”میں کیا کرتی ان ہی دنوں آپ نے بھی اپنا بازو فریکچر کروا لیا تھا۔ میرا تو خود کا بی پی کا ایشو چل رہا تھا۔

سوچا تھا کہ ایک نے تو اپنی من مرضی کر لی ہے۔ دوسرا اگر مان جائے تو میرا بڑھاپا سنور جائے گا۔ لڑکی اچھی ہے اور پھر صاحب جائیداد بھی ہے۔“ اصل بات ان کے منہ سے نکل ہی گئی۔

چچا بھی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

عافیہ بیگم نے افطاری کے بعد کچن سمیٹا۔ سحری کے لیے آٹا گوندھ کر رکھا۔ دہی جمایا اور پھر دو گلاس دودھ الائچی ڈال کر گرم کیا۔ ایک گلاس وہ پچو کے کمرے میں ڈھک کر آئیں اور دوسرا لے کر اپنے بیڈروم میں چلی آئیں...... احسن صاحب ایک میگزین کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ انہوں نے گلاس انہیں تھمایا۔

”شکریہ بیگم! آپ ہر وقت گھر کے کاموں میں ہی گھن چکر بنی رہتی ہیں۔“

"نہیں! ایسا تو نہیں ہے۔" وہ خوش دلی سے مسکرائیں۔ "دراصل رمضان کی وجہ سے مصروفیت تھوڑا بڑھ جاتی ہیں۔ پہلے تو ماہ پارہ بھی اچھا خاصا ہاتھ بٹادیا کرتی تھی۔ افطاری بنانے کی تو وہ بے حد شوقین تھی مگر اب اسے نجانے کیا ہوگیا ہے۔ ہر وقت چپ سادھے لیٹی رہتی ہے۔ ایسی سست تو وہ کبھی نہیں ہوئی تھی۔" وہ فکر مندی سے بولیں۔

"دراصل بیگم! بچے اس عمر میں جذباتی لحاظ سے بہت حساس اور نازک ہوتے ہیں۔ ان کی سوچ پختہ نہیں ہوتی۔ وہ زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کو اتنی آسانی سے قبول نہیں کرتے۔"

ان کا اشارہ شاید ان دونوں کی شادی کی جانب تھا۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے سنتی۔

"پھر کچھ حادثوں کے اثرات بھی گہرے ہوتے ہیں۔" "واقعی حادثے تو اس بے چاری کی زندگی میں بہت ہوئے تھے۔ پہلے چھوٹی سی عمر میں باپ جیسے انمول رشتے سے محروم ہوئی، پھر بچپن اور لڑکپن نا مساعد حالات میں گزارا۔ پھر ماں کی اچانک شادی، چچا کے ہاں ہونے والا واقعہ، کیا کچھ اس معصوم بچی نے جھیلا تھا۔ وہ سوچ کر آب دیدہ سی ہوگئیں۔

"تم فکر نہ کرو بیگم!" انہیں غمگین ہوتے دیکھ کر انہوں نے دلاسا دیتے ہوئے ان کا کندھا سہلایا۔ "وہ ٹھیک ہوجائے گی۔ بس آپ سختی نہ کرنا۔ نرمی اور شفقت سے ہی پیش آتی رہنا۔ سختی ایسے نازک پودوں کو توڑ دیتی ہے جبکہ نرمی انہیں جھکا دیتی ہے۔"

وہ تدبر سے انہیں حکمت عملی سمجھا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ "اور بیگم! میں بھی آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ کتنی محنت اور خلوص سے آپ نے میرے اس مکان کو گھر بنایا۔ مجھے رفاقت کا ایک باوقار احساس دلایا۔"

وہ کھلے دل سے، ان کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر ڈھیرے ڈھیرے بول رہے تھے۔ اور وہ اندر تک سرشار ہوتے ہوئے جھینپی جھینپی سی مسکرا رہی تھیں۔

شوہر کی جانب سے (وہ بھی اتنے قلیل عرصے میں ہی) ایسی پذیرائی اور توصیف شاذ ہی عورتوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ورنہ ساری عمر بھی ہڈیاں گھسانے کے بعد شوہر حضرات گلے شکوے کرتے ہی نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

رمضان کا دوسرا عشرہ چل رہا تھا۔ سڑکوں اور بازاروں میں رش اور گہما گہمی بڑھتی جا رہی تھی۔ عافیہ بیگم پپو کے ہمراہ مارکیٹ آئی ہوئی تھیں۔ عید کے لیے کچھ اشیاء خورد و نوش کی خریداری کرنی تھی۔ کپڑے سلنے درزی کو دیے تھے۔

انہوں نے کاٹن کے نفیس سے دو دو جوڑے احسن صاحب اور پپو کے درزی کو، اس تاکید کے ساتھ تھمائے کہ وہ دیے گئے ناپ سے انیس بیس بھی ادھر ادھر نہ کرے۔ پھر وہ ایک کلاتھ شاپ میں گھس گئیں۔ دو سوٹ انہوں نے منتخب کیے۔ ایک اپنے لیے اور ایک شاید ماہ پارہ کے لیے۔ وہ دکان دار سے بھاؤ تاؤ کر رہی تھیں۔ پپو عدم دلچسپی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ شاپ کے دوسرے پورشن میں ریڈی میڈ کپڑے بھی رکھے تھے۔

اچانک اس کی نظر دیدہ زیب سی اناری کلر کی فراک پر پڑی جو ڈسپلے پر لٹک رہی تھی۔ اس کے ساتھ نازک سا نیٹ کا دوپٹہ بھی تھا۔ وہ محو سا ہو کر غیر ارادی طور پر لباس کو دیکھنے لگا۔ سیلز مین اس کی دلچسپی بھانپ کر پھرتی سے آگے بڑھا۔ فراک کا ایک کونا چٹکی سے پکڑا تو اس کا گھیر مزید کھل گیا۔ نازک سا کپڑا اور خوب صورت سا کام۔

سیلز مین چرب زباں سا تھا۔ لباس کی خوبیاں بتا رہا تھا۔ وہ جھینپ سا گیا۔ بھلا اس نے کس کے لیے خریدنی تھی۔ وہ معذرت کرتا ہوا پلٹ آیا۔ عافیہ بیگم جوڑے پیک کروا رہی تھیں۔ شام ڈھلے دونوں گھر لوٹے تو بے حد تھک چکے تھے۔

افطاری کے بعد، عافیہ بیگم احسن صاحب کو

شاپنگ دکھا رہی تھیں۔ وہ بھی قریب بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ہلکے رنگوں کے جوڑے، ایک نسبتاً گہرے پرنٹ کا تھا، جو شاید ماہ پارہ کے لیے انہوں نے خریدا تھا۔ اس نے ایک نظر دیکھا تو چھم سے اس کے تصور میں وہ دیدہ زیب اناری فراک لہرا گئی۔ اس نے سر جھٹکا اور تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

عافیہ بیگم واشنگ مشین لگا کر کپڑے دھو رہی تھیں، جب دروازے پر موٹر سائیکل رکنے کی آواز آئی۔ پھر کسی نے نہایت عجلت سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ انہوں نے جلدی سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے کنڈی کھولی سامنے ہانپتی کانپتی سی حواس باختہ ماہ پارہ کی چچی کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے اسکوٹی پر ایک ماڈرن سی طرح دار لڑکی بیٹھی تھی، جو منہ پر ہاتھ رکھے ہنس رہی تھی۔

"کم بخت! اتنی طوفانی رفتار سے چلا کر لائی ہے۔ مجھے تو لگ رہا تھا کہ میرا یہ آخری سفر ہے۔" چچی پھولی سانسوں سے بتا رہی تھیں۔

"کون کم بخت؟" عافیہ بیگم کو صحیح صورت حال سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ "اچھا! آپ لوگ اندر تو آئیں۔" انہوں نے دروازے کا دوسرا پٹ بھی کھولا۔

"میری بہو ہے۔ ایسے موٹر سائیکل چلائی ہے کہ لوگ سرکس میں بھی نہیں چلاتے ہوں گے۔ اس سے اچھا تھا کہ پانچ سو رکشے والے کو دے کر آ جاتی۔" وہ ڈولتے قدموں سے اندر داخل ہوئیں۔ سر الگ چکرا رہا تھا۔

"توبہ ہے! آنٹی نے اتنی چیخیں ماریں کہ میں ڈر رہی تھی لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں ان کو اغوا کر کے لے کر جا رہی ہوں۔ مگر ساس کو بھی آخر کوئی کیوں اغوا کرنے لگا؟" وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتے ان کی حالت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

وہ دونوں ساس بہو کو لیے ڈرائنگ روم چلی آئیں۔

چچی تو فوراً صوفے پر ڈھیر ہو کر لمبی سانسیں لینے لگیں جبکہ بہو ایک کرسی پر ٹک گئی۔

"آپ روزے سے ہیں؟" عافیہ بیگم نے مہمان داری کے خیال سے پوچھا۔

"نہیں میری تو مجبوری ہے پر اور آنٹی تو روزہ رکھتی ہی نہیں ہیں۔" منہ پھٹ بہو نے ان کا بھانڈا پھوڑا۔

"وہ۔ وہ۔ دراصل مجھے بلڈ پریشر کا مسئلہ ہے نا تو اس لیے۔" چچی خجل سی ہو کر وضاحت دینے لگیں۔

"ویسے آنٹی، ڈاکٹر کہتے ہیں کہ روزہ رکھنے سے بلڈ پریشر کنٹرول میں رہتا ہے۔" بہو نے چہک کر کہا۔

اس سے پہلے کہ بحث طول پکڑتی عافیہ بیگم جلدی سے بولیں۔

"آپ دونوں آرام سے بیٹھیں، میں شربت لاتی ہوں۔" ان کے جانے کے بعد بہو نے ادھر ادھر کا طائرانہ جائزہ لینا شروع کیا۔ کونے کونے سے نفاست ٹپک رہی تھی۔ ایک کارنر پر عافیہ بیگم اور ان کے شوہر کی نکاح کے دن کی تصویر سجی تھی۔ وہ واحد تصویر تھی جو احسن صاحب کی آپا نے زبردستی بنوائی تھی۔

"آنٹی کے شوہر کتنے ہینڈسم ہیں۔" بہو نے توصیفی لہجے میں تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بے چارے کی بیوی برسوں پہلے فوت ہو گئی تھی۔" چچی نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ عین جوانی میں "بیوہ" ہو گئے تھے۔"

"بیوہ نہیں رنڈوے بیوقوف!" چچی نے لتاڑا۔

اتنے میں عافیہ بیگم شربت لیے چلی آئیں تو دونوں خاموش ہو گئیں۔

"یہ اپنی ماہ پارہ نظر نہیں آ رہی۔" چچی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ماہ پارہ نے دراصل اپنی پڑھائی دوبارہ شروع کر رہی ہے۔ اس نے اپنی دوست سے سلیبس وغیرہ پوچھنا تھا۔ اسی کے گھر چھوڑ کر آئی ہوں۔" وہ سادگی سے بتا رہی تھیں۔

پھر ادھر ادھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد چچی

نے اپنا گلا کھنکھارا اور گہری نظروں سے عافیہ بیگم کو دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

"دیکھو بھابھی! آپ نے نکاح کرلیا بہت اچھا کیا۔ شریعت نے آپ کو اس کا حق دیا تھا۔ آپ کا پھر سے گھر بس گیا۔ ہم بہت خوش ہیں مگر برا نہ ماننا سچ کہتی ہوں، ماہ پارہ کا یہاں رہنا قطعی مناسب نہیں ہے۔ آج کل زمانے کا چلن خراب ہے کسی کی نیت کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا۔ جوان بچی ہے۔ تم خود بھی سمجھ دار ہو۔ ہمارا تو کون ہے اس کے چچا تو۔"

"رفعت!" عافیہ بیگم نے تحمل سے ان کی فراٹے بھرتی زبان کو روکا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ کسی کی نسبت کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا مگر یاد رکھیں، ہر کسی کا ایمان بھی خراب نہیں ہوتا۔ اچھی بری نیتوں کا حال تو صرف خدا کو معلوم ہے مگر میں بھی ماہ پارہ کی ماں ہوں۔ اپنی بچی پر پڑنے والی ہر اچھی بری نظر کو خوب پہچانتی ہوں۔۔ آپ بلاوجہ فکر مند نہ ہوں۔ ماہ پارہ یہاں بالکل محفوظ ہے۔"

"ارے کیسے فکر مند نہ ہوں۔ تم تو بچی کو اچانک اسپتال سے اچک کر لے گئیں۔ بہتیرے فون کیے تم نے تو ڈھنگ سے جواب نہ دیا اسی دوران تمہارے بھائی کا بازو فریکچر ہوگیا۔ ہمیں تو پھر اپنی پڑ گئی۔ اب جونہی ان کی حالت کچھ سنبھلی ہے تو فوراً مجھے یہاں دوڑایا کہ جا کر خبر گیری کروں اور ہو سکے تو ماہ پارہ کو ساتھ لیتی آؤں۔ تم نے سنا تو ہوگا کہ اپنا تو پھر اپنا ہوتا ہے مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالتا ہے۔"

"ہیں یہ کیا بات ہوئی؟ مرنے والے کو بھلا کیا فرق پڑتا ہے اسے چھاؤں میں ڈالا جائے یا دھوپ میں۔" بہو کی زبان پھر پھسلی۔ اسے شاید محاورہ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"تم خاموش ہو کر بیٹھو۔ میں بھابھی سے بات کررہی ہوں۔" انہوں نے اسے ڈپٹا۔

"آپ کی فکر اور خیال کا شکریہ رفعت! فی الحال تو ماہ پارہ یہیں ٹھیک ہے۔ آپ بس دعا کریں کہ بچی کا نصیب نیک ہو۔" انہوں نے سلیقے سے بحث سمیٹی وہ بھی واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ دروازے تک پہنچی ہی تھیں کہ وہ دھڑ سے کھلا اور بپو اندر داخل ہوا۔ دو اجنبی خواتین کو سامنے پا کر کچھ گھبرا سا گیا۔

چچی نے اسے سرتاپیر گھورا تو وہ بیچارہ مزید حواس باختہ سا ہوگیا۔ بامشکل دونوں کو سلام کیا اور تیزی سے ایک سائیڈ پر ہو کر نکلنا چاہا تو دیوار کے ساتھ رکھے، گملے سے پاؤں ٹکرا لیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔

بہو کے منہ سے فلک شگاف قہقہہ برآمد ہوا اور چچی اسے شرربار نظروں سے گھورتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

عافیہ بیگم نے دروازہ بند کیا اور بے اختیار اطمینان بھری سانس ان کے منہ سے خارج ہوئی۔ ان کے مرحوم شوہر کے گھر والے، ہمیشہ سے ہی ان کے لیے امتحان ثابت ہوئے تھے۔

بپو کے آفس میں آج کل آڈٹ ہو رہا تھا۔ وقت کی بچت کے پیش نظر، باس نے افطاری کا انتظام بھی دفتر میں ہی کردیا تھا۔ رات گئے تک شفٹ چلتی وہ نماز تراویح وغیرہ ادا کر کے۔۔ تھکا ہارا گھر لوٹتا اور بستر پر گر کر بے سدھ ہو جاتا۔ صبح سحری کے وقت بھی مشکل سے ہی آخری چند منٹ پہلے بیدار ہوتا۔ عافیہ بیگم جلدی سے اسے سحری کمرے میں ہی دے جاتیں۔

آج چھٹی تھی تو وہ روزہ رکھ کر، نماز تلاوت سے فارغ ہوتے ہی دوبارہ بستر پر گر گیا۔ دن چڑھے تک سوتا رہا یہاں تک کہ سورج کی کرنوں نے کھڑکی کے راستے اندر داخل ہو کر، اس کی بند آنکھوں پر دستک دینا شروع کی۔ اس نے مندی مندی آنکھیں کھول کر دیکھا اور کسل مندی سے کروٹ بدل لی۔ پھر ایک بھرپور انگڑائی لے کر اٹھا کھڑکی کے پردے ایک طرف ہٹائے۔

سامنے کا منظر دیکھ کر، نیند کا سارا خمار جاتا رہا برآمدے میں کرسی پر ماہ پارہ بیٹھی تھی اور اس کے سامنے میز پر کتابیں کھلی تھیں۔ وہ مگن سی پڑھائی میں مصروف تھی۔ آج بہت دنوں کے بعد اس نے اسے دیکھا تھا۔ ہلکے زرد رنگ کا لباس نہ صرف اس کی اپنی رنگت سے ہم

آہنگ ہو رہا تھا بلکہ اس کے آس پاس پھیلی ایک عجیب سی سوگواری اور اسرار کو بھی بڑھا رہا تھا۔

اسے دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ وہی ماہ پارہ ہے، شوخ و شنگ اور چلبلی سی، ہر وقت شرارت پر کمربستہ، یہ زندگی کے نشیب و فراز اور حالات کا اتار چڑھاؤ انسان کو کتنا بدل دیتا ہے۔ اس نے تاسف سے پھر اسے دیکھا۔ وہ سامنے رکھے لیپ ٹاپ سے الجھ رہی تھی۔۔ وہ پہچان گیا۔

یہ ماموں جان کا وہی تاریخی لیپ ٹاپ تھا جس پر وہ پہلے خود کام کرتے تھے، پھر کافی عرصے تک پپو اس پر پڑھائی کرتا رہا۔ پھر جب وہ بی ایس کر رہا تھا تو اس نے ضد کر کے نیا خرید لیا اور ماموں جان نے اپنے والے کو کسی قیمتی متاع کی مانند الماری میں سنبھال کر رکھ دیا اور اب غالباً وہی انہوں نے ماہ پارہ کو عنایت کر دیا تھا۔ بڑوں کو نجانے پرانی چیزوں سے اتنا پیار کیوں ہوتا ہے۔ وہ چونکہ اس لیپ ٹاپ پر کام کر چکا تھا۔ اس لیے اس کی، کارکردگی سے بھی آگاہ تھا۔

اب بھی ماہ پارہ، نجانے اس سے کیسے کام چلا رہی تھی۔ اس نے اپنا جدید لیپ ٹاپ اٹھایا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا برآمدے میں آیا۔ اس نے پرانا لیپ ٹاپ پرے ہٹایا اور ماہ پارہ کے سامنے اپنے والا رکھا اور پھر خاموشی سے پلٹ گیا۔

کچھ دور جا کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ ماہ پارہ سر جھکائے، اس کے لیپ ٹاپ پر اپنی مومی انگلیاں پھیر رہی تھی۔

☆☆☆

صبح کام پر جاتے ہوئے احسن صاحب نے عافیہ بیگم سے کہا۔

''بیگم! آج شام کو افطاری پر ذرا زیادہ اہتمام کر لیجیے گا۔ میں نے اپنے دیرینہ دوست شاہ جی کو مدعو کر رکھا ہے۔''

''جی بہتر'' وہ انہیں ان کی گھڑی تھماتے ہوئے بولیں۔

''دراصل شاہ جی میرے جگری یار ہیں۔ پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ شہر میں بچے اور بچیوں کی ایک کثیر تعداد، ان کے درس تدریس سے فیض یاب ہو چکی ہے۔ اب وہ فی سبیل اللہ بچے اور بچیوں کے رشتے کرواتے ہیں۔ میں نے ان سے پپو کے واسطے تو کسی مناسب رشتے کا، کب سے کہہ رکھا ہے۔ ماہ پارہ بھی ماشاء اللہ سے اپنی بچی ہے۔ اگر آپ کہیں تو اس کے بھی کوائف لکھوا دوں۔''

ان کی بات سن کر ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ مگر انہوں نے اپنے، جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جب وہ انہیں دروازے تک رخصت کر کے آئیں تو ان کے دل میں، بیک وقت خوشی اور ملال کے تاثرات ملے جلے سے تھے۔

خوشی اس بات کی تھی کہ احسن صاحب نے ایک ذمہ دار باپ کی طرح پپو کے علاوہ، ماہ پارہ کا بھی سوچا تھا۔ اور ملال اس بات کا تھا کہ انہوں نے پپو کے ساتھ ماہ پارہ کا نہیں سوچا تھا۔ آخر وہ سوچ بھی کیسے سکتے تھے۔ ماضی میں ماہ پارہ نے پپو غریب کو کتنا خوار کیا تھا۔ اور پھر جب وہ اس کی شکایت لے کر آئے تھے تو انہوں نے بھی، اپنی بیٹی کا جھوٹا دفاع کرنے کے بجائے سب کچھ سچ سچ بتایا تھا۔

اب آخر آنکھوں دیکھی مکھی کون نگلتا ہے پر جتنا پپو سادہ بچہ تھا۔ ویسی ہی شریک حیات کا بھی حق دار تھا۔ انہوں نے دوپٹے کے پہلو سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کی بچی کے لیے، اس کا سوتیلا باپ بھی سگے باپ کی مانند فکرمند تھا۔

☆☆☆

شاہ جی افطاری کر کے گئے تو چند روز بعد ہی ان کا فون آ گیا۔ ان کے پاس پپو اور ماہ پارہ دونوں کے لیے معقول رشتے موجود تھے۔ پپو کے لیے جہاں وہ بات چلا رہے تھے، وہ ان کے سالے کی بچی تھی۔ بچی فی الحال

اپنی نانی کے ہاں رہائش پذیر تھی۔ والدین قطر میں مقیم تھے اور تقریباً ایک ماہ بعد ان کی آمد متوقع تھی۔ پھر ہی وہ پپو کو دیکھنے کے واسطے آنے کا ارادہ رکھتے تھے اور ماہ پارہ کے لیے، جو رشتہ ان کے پاس موجود تھا وہ ان کا اپنا شاگرد ہی تھا۔ بڑا ہونہار بچہ تھا اور اب الیکٹریکل انجینئر کی حیثیت سے ایک نجی کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔

احسن صاحب نے لوگوں کو مدعو کر لیا مگر ان کی آمد سے پہلے ہی ایک شام شاہ جی کا فون آیا۔ وہ کچھ مضطرب سے تھے۔ انہوں نے احسن صاحب کو بتایا کہ جب انہوں نے لڑکے والوں کو تفصیلاً بتایا کہ ماہ پارہ، ان کی سگی بچی نہیں بلکہ ان کی دوسری بیگم کے پہلے شوہر سے ہے تو ان کا ردعمل چونکا دینے والا تھا۔ شاہ صاحب ایک دیانت دار انسان تھے۔ وہ رشتہ کرواتے وقت دونوں پارٹیوں کی معمولی نوعیت کے تمام معاملات کا تذکرہ، ضرور کرتے تھے تاکہ بعد میں کوئی ابہام پیدا نہ ہو۔

اب لڑکے والے پہلے تو مطمئن تھے مگر جب انہیں پتا چلا کہ ماہ پارہ، احسن صاحب کی سوتیلی بچی ہے تو انہوں نے عجیب سے خدشات کا اظہار کیا۔ مثال کے طور پر نجانے کس خاندان سے ہے۔ آخر خون کا اثر تو ہوتا ہے۔ کچھ اور بھی سوالات تھے جن سے ان کی عامیانہ ذہنیت کھل کر سامنے آ رہی تھی۔ احسن صاحب نے اس رشتے کو فی الفور منع کر دیا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ خالی خولی لڑکے کا اچھا ہونا ہی کافی نہیں ہوتا۔

ہمارے معاشرے میں لڑکی کی شادی صرف لڑکے کے ساتھ ہی نہیں، ایک طرح سے اس کے گھر والوں کے ساتھ بھی ہوتی ہے اور وہ بچی کی عزت نفس پر سمجھوتہ کرنے کے لیے قطعی تیار نہ تھے۔

انہوں نے نرم لفظوں میں، تاکہ عافیہ بیگم کی دل آزاری نہ ہو رشتے سے منع کرنے کی وجہ بتادی مگر وہ پوری بات سمجھ گئیں اور دل مسوس کر رہ گئیں۔ نجانے ان کی بچی کا نصیب کب کھلے گا۔ ہر کوئی خاندان کا پوچھے گا تو خاندان میں چچا اور چچی ہی تھے اور ان کا معاملہ ڈھکا چھپا تو نہ تھا۔

☆☆☆

گھڑی نے دو کا گھنٹہ بجایا تو ورکر اپنے اپنے کیبن سے اٹھ کر جانے لگے۔ ویسے تو یہ لنچ بریک کا وقت تھا۔ مگر روزوں کی وجہ سے ہر کسی کی اپنی اپنی مصروفیت تھی۔ کوئی وہیں بیٹھے بیٹھے ستا لیتا۔ کچھ پریئر روم میں چلے جاتے۔ اور کچھ باہر لان میں جا کر تازہ ہوا کھانے نکل جاتے۔

پپو کا دوست اور کولیگ فرقان اس کے کیبن میں آیا تو وہ سر جھکائے، اپنے موبائل کو گھور رہا تھا جبکہ سامنے اس کی سکرین تاریک پڑی تھی۔۔

"اے! تجھے کیا ہوا۔؟ کہاں گم ہو؟؟" فرقان نے اس کے سامنے چٹکی بجائی۔

"چل ذرا مارکیٹ تک چلتے ہیں مجھے جوتے لینے ہیں۔"

"میرا موڈ نہیں ہے یار! تو خود ہی چلا جا۔" وہ بےزاری سے بولا۔

"کیوں کیا ہوا ہے؟؟" فرقان نے اس کے الجھے الجھے سے رویے کو دیکھ کر پوچھا۔

"پپو ذرا لیے دیے رہنے والا کم گو سا انسان تھا۔ اس کے دوست بے حد کم تھے۔ اور وہ جلدی کسی کے ساتھ گھلتا ملتا بھی نہیں تھا۔ آفس میں بھی فرقان وہ واحد شخص تھا، جس کے ساتھ اس کی یاری دوستی چل رہی تھی اور اس میں بھی زیادہ کوشش فرقان کی ہی تھی۔ فرقان خود بھی ایک سلجھا ہوا پرخلوص سی فطرت کا مالک تھا۔ اس لیے پپو اس سے کھل کر ہر بات کر لیا کرتا تھا۔ اب بھی جب اس نے زیادہ کریدا تو بتائے بغیر نہ رہ سکا۔

"وہ یار! ماموں جان آج کل ماہ پارہ کے لیے رشتے دیکھ رہے ہیں۔"

"ہاں تو دیکھنے دو نا۔ تمہیں کیا تکلیف ہے۔.....؟" فرقان نے جھٹ کہا مگر اس کی بات پر جس

طرح تڑپ کر زخمی نظروں سے پپو نے اسے دیکھا تو وہ اپنی بات پر خود ہی شرمندہ ہو گیا۔

"سوری یار! میرا مطلب ہے کہ تم خود آگے قدم نہیں بڑھاؤ گے تو پھر کیا ہو گا۔ آخر بات کیوں نہیں کرتے ماموں جان سے......؟"

"کس منہ سے کروں۔"

"اسی منہ سے جو تمہارا ہے۔ اب اتنا بھی برا نہیں ہے۔ گزارے جوگا تو ہے نا۔"

"مگر وہ کیا سوچیں گے کہ پہلے تو شکایتیں لگاتا تھا۔"

"تو کہہ دینا کہ شکایتیں لگاتے لگاتے ہی محبت ہو گئی۔"

"اور پھر آنٹی بھی تو ہیں۔ کیا وہ مان جائیں گی۔"

"کیوں نہیں مانیں گی۔ تم جیسا کاٹھ کا الو...... میرا مطلب ہے بھرو جوان ...... برسرِ روزگار ان کو کہاں ملے گا۔"

"اور ماہ پارہ......؟"

"احمق! وہ تو تم پر پہلے دن سے ہی فدا تھی۔ شاید تم جیسا نادر و نایاب گوہر اس محلے میں دوسرا کوئی اور جو نہیں تھا۔"

"دیکھو پپو!" اب کے فرقان ذرا سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔

"تمہاری سادگی اور بھولپن کو سات سلام۔ اگرچہ یہ خوبیاں اب شاذ ہی لوگوں میں ہوتی ہیں۔ مگر ہر چیز کا حسن اعتدال میں ہے۔ جب کچھ بھی حد سے بڑھ جائے تو شخصیت کا توازن بگڑ جاتا ہے اور انسان اپنا نقصان اپنے ہاتھوں سے کر بیٹھتا ہے۔ تم بھی ہمت پکڑو۔ یہ جنگ تم نے خود ہی لڑنی ہے ورنہ بعد میں پھر پرانی فلموں کی ہیروئنز کی طرح، درختوں سے لپٹ لپٹ کر روتے رہ جاؤ گے۔"

☆☆☆

پپو کمرے میں داخل ہوا تو ماموں جان فون پر بات کر رہے تھے۔ عافیہ بیگم شاید کچن میں تھیں۔ وہ پلنگ کے ایک کونے پر ٹک گیا۔ ان کی گفتگو طول پکڑ گئی۔ وہ شاہ صاحب سے رشتوں سے متعلق ہی کوئی بات کر رہے تھے۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ فون بند کر کے پلٹے تو پپو پر نظر پڑی۔

"اچھا ہوا تم خود ہی آ گئے۔ میں تمہیں بلوانے والا ہی تھا۔ وہ جو شاہ صاحب نے رشتہ بتایا تھا نا تمہارا اپنے سالے کی بچی کا وہ لوگ پرسوں تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں۔"

"آپ منع کر دیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"کیوں بھئی؟"

"بس یونہی ابھی میرے پاس وقت نہیں ہے۔" وہ اکھڑے سے لہجے میں بولا۔ چند دن پہلے اس نے ان سے تذکرہ کیا تھا کہ اس کو دفتر والے شاید کراچی کی برانچ میں ٹرانسفر کر دیں۔ وہ سمجھے کہ پپو شاید اس واسطے منع کر رہا ہے۔

"اچھا! تو پھر ان کو کچھ دن بعد بلا لیں گے۔ ابھی انہوں نے ماہ پارہ کے لیے بھی ایک اچھا رشتہ تلاش کیا ہے۔ فی الحال انہیں مدعو کر لیتے ہیں۔" ان کا انداز مشورہ لینے والا تھا۔

"آپ انہیں بھی منع کر دیں۔"

وہ پھر سابقہ ٹون میں بولا تو انہیں سخت تعجب ہوا۔ انہوں نے اپنا چشمہ اتار کر اسے گہری نظروں سے گھورا۔

"وہ ماموں جان ...... وہ ...... دراصل۔" اس نے تھوک نگلا۔

"وہ میں ...... ماہ پارہ ...... میرا مطلب ہے۔"

انہیں شدید تپ چڑھی۔ انہوں نے پاس پڑی وزنی ڈکشنری اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری۔

"گھامڑ! ابھی تک اپنے دل کی بات نہ کرنی آئی تمہیں۔"

کتاب کی ضرب کھا کر پپو کا دماغ گھوم گیا مگر زبان تر نت چل پڑی۔

"ماموں جان! میں ماہ پارہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

ماموں ایک لمحے کے لیے حیران رہ گئے۔ پھر اس کے چہرے پر چھائے محبت کے رنگ دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔

"دفعہ ہو جاؤ نالائق، میں ابھی عافیہ سے بات کرتا ہوں۔"

☆☆☆

عافیہ بیگم کی تو دلی مراد پوری ہوئی۔ ان کی بچی تاحیات ان کے ساتھ رہے گی اس سے بڑی خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ اسی خوشی میں انہوں نے ماہ پارہ کے چچا کو بھی شامل کرنے کے لیے انہیں فون کیا تو وہ آگے سے بھڑک اٹھے۔

"کمال کرتی ہو بھابھی! تم نے بالا ہی بالا بچی کا رشتہ بھی طے کر دیا۔ ہم سے تو پوچھ لیتیں۔ ہم تو اسے اپنے عاقب کے لیے سوچ بیٹھے تھے۔"

پھر مزید جلی کٹی دو چار باتیں سنا کر، فون بند کر دیا۔ جب وہ فون رکھ کر پلٹے تو پیچھے ان کا بڑا سپوت عاقب کھڑا تھا۔

"کیوں ابا جان! آپ مجھ سے میری رائے جانے بغیر میرے لیے ماہ پارہ کا کیوں سوچ بیٹھے تھے۔ فرحان نے اپنی مرضی کی ہے تو مجھے بھی اپنا ساتھی خود منتخب کرنے کا حق ملنا چاہیے۔" آخر اولاد تو انہیں کی تھی منہ پھٹ اور بدلحاظ۔

"کیوں ماہ پارہ میں آخر کیا کمی ہے؟" چچی اندر آ کر تیکھے لہجے میں بولیں۔

"امی! کمی اور زیادتی کا تو مجھے پتا نہیں۔ بہر حال جو اس میں ایک خوبی تھی نا آپ کی نظر میں تو اب وہ بھی نہیں رہی۔"

"کیا مطلب......؟" چچا اور چچی نے بیک وقت پوچھا۔

"وہ ایسے کہ وہ جو ایک پلاٹ تھا نا جس میں ماہ پارہ صاحبہ کا بھی حصہ بنتا تھا اور آپ کروڑوں کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ اس کا عقدہ کھل گیا ہے آج۔ محکمہ ہائی وے اتھارٹی والوں کا لیٹر آیا ہے۔ وہ جگہ تو حکومت کی ملکیت ہے۔

دادا جان کو کسی ایجنٹ نے جعل سازی سے وہ جگہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے بہلا پھسلا کر ان کے نام لکھوا دی تھی۔ اگر ہم مقدمہ بھی کریں تو لاکھوں لگا کر بھی ایک دھیلا وصول نہیں کر پائیں گے۔ اب بتائیں ماہ پارہ کو بہو بنائیں گے؟"

چچا اور چچی ایک دوسرے سے نظریں چرا کر رہ گئے۔

☆☆☆

اپریل......2024ء

آج عید الفطر کی حسین شام تھی۔ صحن میں گہما گہمی اور رونق کا سماں تھا۔ بیو اور ماہ پارہ کے نکاح کی تقریب منعقد ہونے جا رہی تھی۔ ماموں جان کا تو پہلے دو تین ماہ بعد شادی کا ارادہ تھا۔ مگر ہوا کچھ یوں کہ انہوں نے کافی عرصے پہلے عمرے کے لیے درخواست جمع کروا رکھی تھی اور وہ اچانک منظور ہو گئی تھی۔ عید کے چند دن بعد پہلے گروپ کے ساتھ ان کی روانگی تھی۔ وہ جانے سے پہلے اس اہم فرض سے سبک دوش ہونا چاہ رہے تھے، تاکہ عافیہ بیگم کے ہمراہ اطمینان سے مقدس سفر پر روانہ ہو سکیں۔

عافیہ بیگم نے ماہ پارہ کے چچا کو بمعہ فیملی مدعو کیا تھا۔ انہیں امید تو نہیں تھی مگر عین وقت پر وہ سب ہی پہنچ گئے تو انہیں خوش گوار حیرت آمیز خوشی ہوئی۔ آخر کو ان کی بچی کے واحد خونی رشتے تھے۔ ان کا مان بڑھ گیا۔ چچا چچی سمیت سب ہی مطمئن نظر آ رہے تھے۔

خاص طور پر ان کی بہو، بہت چہک رہی تھی۔ اثرات بتا رہے تھے کہ ان سب کو یہاں تک لانے میں اسی کا زیادہ ہاتھ ہے۔

ماہ پارہ تو اندر کمرے میں گھسی بیٹھی تھی۔ کپڑے بھی کچھ مسلے ہوئے سے پہن رکھے تھے۔ اتنے میں مولانا صاحب تشریف لائے اور نکاح پڑھانا شروع کیا۔ جب انہوں نے بلند آواز میں دولہا کا نام

"عبیدالرحمان" کیا تو ماہ پارہ بے چاری جی جان سے لرز گئی۔

"ہائے اللہ! یہ کس سے نکاح ہو رہا ہے۔ میں تو کسی عبیدالرحمان کو نہیں جانتی۔"

پاس بیٹھی چچی کی بہو نے اس کے ہاتھوں کی لرزش اور کانپتے بدن سے جھٹ صورت حال کو تاڑ لیا اور ترنت بولی۔

"مولانا صاحب! عبیدالرحمان عرف پپو کہیے نا۔" ماہ پارہ بے چاری کی اٹکی سانس بحال ہوئی اور اس نے جھٹ دستخط کر دیئے۔ مبارک سلامت کا شور اٹھا اور عافیہ بیگم اپنی نم آنکھیں صاف کرتی مہمانوں کا منہ میٹھا کروانے لگیں۔

چچی کی بہو اٹھ کر ان کے قریب آئی اور بولی۔

"آنٹی! میں ماہ پارہ کو تھوڑا سا تیار کر دیتی ہوں۔ دولہا دلہن کا چھوٹا سا فوٹو سیشن تو ہونا چاہیے۔ یہ یادگار لمحات زندگی میں دوبارہ کہاں آتے ہیں۔"

"کیوں نہیں بیٹا! دراصل عمرے کی درخواست منظور ہوئی تو احسن صاحب نے آنا فانا نکاح کا پروگرام بنا لیا۔ اب کوئی تیاری ویاری تو کی نہیں تھی۔ اب یہ اس کی عید کا جوڑا اسل کر آیا ہوا ہے۔ وہ پہن لیتی ہے۔"

انہوں نے جوڑا نکال کر دکھایا۔

"یہ جوڑا......!" اس نے گہرے پرنٹ کی سادہ قمیض شلوار کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی۔

"آنٹی! نکاح جیسے اہم فنکشن پر ایسا لباس کون پہنتا ہے۔ کوئی تھوڑا شوخ ہو جاتا تو۔ مگر آج تو مارکیٹ بھی بند ہوگی۔" وہ سوچ کر بولی۔

"اچھا! تم ٹھہرو۔ میں دیکھتی ہوں۔ شاید پہلے سے رکھا ہوا کوئی اچھا مل جائے۔"

وہ عجلت میں ماہ پارہ کے کمرے میں داخل ہوئیں اور اس کے کپڑوں کی الماری کھنگالنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد ان کے پیچھے پیچھے پپو بھی چلا آیا۔ ہاتھ میں ایک شاپر تھام رکھا تھا۔

"آنٹی! یہ ماہ پارہ کو پہنا دیں۔" وہ کچھ جھجک کر بولا انہوں نے شاپر کے اندر ہاتھ ڈالا تو ایک بے حد خوب صورت اناری رنگ کی فراک برآمد ہوئی۔

جس دن وہ عافیہ بیگم کے ہمراہ بازار گیا تھا اور اس نے وہ اناری فراک دیکھی تھی۔ تو اس سے اگلے دن ہی وہ دوبارہ وہاں جا کر اسے خرید لایا تھا۔ یوں ہی بے اختیار سا ہو کر اور پھر اس ارادے کے ساتھ سنبھال لی تھی کہ شاید زندگی میں کبھی اچھا وقت آیا تو وہ اسے تحفتاً دے گا۔ اور اب اس سے اچھا وقت بھلا کیا ہوگا۔

"آنٹی! یہ میں نے ماہ پارہ کے لیے خریدی تھی۔" وہ تیزی سے پلٹ گیا۔

عافیہ بیگم کے دل میں جو ذرا سا وہم تھا کہ شاید پپو نے کسی دباؤ میں آ کر جذباتی فیصلہ نہ کیا ہو، وہ بھی جاتا رہا۔ وہ سرشاری ہو کر وہاں سے نکلیں۔

چچی کی بہو نے ماہ پارہ کو بہت اچھی طرح سے تیار کر دیا، اناری فراک اس کی شہابی رنگت پر خوب اٹھ رہی تھی۔ عاقب اور فرحان نے سفید براق کرتا شلوار میں ملبوس تھوڑا گھبرائے تھوڑا للچائے پپو کو بھی لا کر ماہ پارہ کے پہلو میں بٹھا دیا۔

بہو کھٹا کھٹ تصویریں لینے لگی۔

"آج کل کے زمانے میں ایسا دولہا کہاں ملے گا۔ دیکھو تو ذرا دلہن سے بھی زیادہ شرما رہا ہے۔"

چچی کی بہو نے بے لاگ تبصرہ کیا تو ساری محفل کشت زعفران بن گئی۔ پپو بے چارہ مزید شرما گیا۔ مگر جب اسے حاضرین کے ساتھ ساتھ اپنے پہلو میں بیٹھی ماہ پارہ کی مترنم ہنسی بھی سنائی دی تو وہ سمجھ گیا کہ آج، اسے اپنی پہلے والی شوخ اور چنچل سی ماہ پارہ مل گئی ہے۔

دور کھڑے احسن صاحب اور عافیہ بیگم نے دل کی گہرائیوں سے ان دونوں کی دائمی خوشیوں کی دعا کی۔

☆☆

لائبہ منظور احمد

اچھی باتیں

"پھوپھی سکینہ کہاں ہیں؟" مینا یاسمین سے سوال کرتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئی۔

"وہ باتھ روم میں ہیں۔ آپ سنائیے کیسی ہیں؟ کافی دنوں بعد چکر لگایا ہے گھر میں سب خیریت ہے" یاسمین نے تخت پر بیٹھتے سوال کیا۔

"سب ٹھیک ہیں باجی! بس طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی، اس لیے نہ آ سکی۔" اتنے میں سکینہ بی بی باتھ روم سے ہانپتی کانپتی آ کر تخت پر بیٹھ گئیں۔

"السلام علیکم! کیا حال ہے پھوپھی؟" مینا نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں تم ٹھیک ہو؟" گہری گہری سانسیں لیتے سکینہ بی بی نے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کی طبیعت کا پوچھنے آئی تھی، بخار تھا نا کچھ دن پہلے آپ کو۔"

"ہاں اب اتر گیا ہے۔" وہ سادہ لہجے میں کہتے کچن کی طرف متوجہ ہوئیں، لاؤنج میں ٹرے اٹھائے سائرہ داخل ہوئی چہرے پر نرم مسکراہٹ کے ساتھ سلام کرتے اس نے تخت اور چارپائی کے درمیان دھری میز پر ٹرے رکھی اور سر پر پیار لینے کے لیے جھکی۔

"یہ سائرہ ہے؟ رابعہ کی بیٹی؟"

مینا نے سر پر پیار دیتے سکینہ بی بی سے سوال کیا۔ "ہاں ماشاء اللہ کافی بڑی ہو گئی ہے۔ اور تمہاری ڈاکٹری مکمل ہو گئی؟"

تبصرے کے ساتھ سوال بھی کیا۔

"جی وزیر آباد میں پوسٹنگ ہوئی ہے۔"

نرم مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتے۔ اب وہ ان کا دلچسپی سے جائزہ لے رہی تھی، اتنے سالوں میں ان میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"چلو اچھی بات ہے اب جب تک یہاں ہو ہمیں اپنی ڈاکٹری کا فائدہ بھی دینا، کیوں پھوپھی؟"

وہ کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرتے مخاطب ہوئی۔

"ہاں کیوں نہیں۔ میں تو جس دن سے یہ آئی ہے روزانہ بلڈ پریشر اور شوگر اس سے چیک کرواتی ہوں۔ شوگر تو یاسمین بھی چیک کر لیتی ہے مگر اب سائرہ ہی کرتی ہے۔"

سکینہ بی بی نے فخر سے نواسی کو دیکھتے کہا۔

"میرا بھی ذرا بلڈ پریشر تو چیک کرے" مینا نے فوراً کہا۔

"جی میں بی پی آپریٹس لے کر آتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر کمرے سے آپریٹس لے کر آئی، بی پی چیک کر کے وہ کمرے میں سونے چلی گئی، رات کو ڈیوٹی پر جانا تھا۔

☆☆☆

سکینہ بی بی اور شہاب الدین کی چار اولادیں تھیں۔ شہاب الدین اپنے وقت کے میٹرک پاس تھے جبکہ سکینہ بی بی چٹی ان پڑھ، ہاں دینی تعلیم ضرور سکینہ بی بی نے حاصل کی تھی شہاب الدین نے اپنی سب اولادوں کو اعلا تعلیم دلوائی۔

ایک بیٹا ڈاکٹر جو لاہور میں ہوتا تھا جبکہ ایک بیٹا انجینئر تھا، وہ اسلام آباد میں ہوتا تھا جبکہ رابعہ بیگم ہاؤس وائف تھیں، یاسمین بیگم گورنمنٹ ٹیچر تھیں۔ سکینہ بی بی اپنی بیٹی یاسمین کے ساتھ وزیر آباد کے قریبی گاؤں میں رہائش پذیر تھیں۔ یاسمین شہاب الدین بیوہ تھیں۔ دوبارہ شادی نہیں کی وہ اپنی والدہ کے ساتھ رہتی تھیں۔



رابعہ بیگم لاہور میں رہائش پذیر تھیں مجموعی طور پر یہ خاندان پڑھا لکھا تھا۔

گاؤں کے لوگ سادہ تھے، جب بچپن میں سائرہ یہاں آتی — اپنے بہن بھائیوں اور کزنز کی نسبت یہاں رہنا پسند کرتی تھی۔

وہ اپنی نوکری کے سلسلے میں یہاں آئی ہوئی تھی، جو کوئی بھی نانی سے ملنے آتا وہ جاتے ہوئے سائرہ سے بی پی تو ضرور چیک کروا کر جاتا۔ گو نانی کے ملنے ملانے والے بچپن کے مقابلے میں اب کچھ کم ہو گئے تھے لیکن چہل پہل تو رہتی ہی تھی۔

☆☆☆

ابھی اسے آئے کچھ ماہ ہی ہوئے تھے شام کا اندھیرا پوری طرح سے پھیل گیا تھا، جب سائرہ دو دن کی ڈیوٹی کے بعد گھر آئی لاؤنج میں سامنے والے گھر کی صباحت بیٹھی تھی، سلام دعا کے بعد سائرہ کے پانی پیتے ہی وہ بولی۔

"میں کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تم جلدی سے میرے ساتھ چلو امی کا بلڈ پریشر چیک کرنا ہے۔ سجان بھی گھر نہیں، نہیں تو اس کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلی جاتی۔"

سائرہ نے جلدی سے ملازمہ کو آواز دی وہ آپریٹس لے کر آئے۔ ڈوپٹہ لیتے وہ لاؤنج کا دروازہ کھولتی صباحت کے ساتھ چلی گئی۔ سکینہ بی بی جو منع ہی کرنے والی تھیں، ان کے کچھ کہنے سے پہلے وہ چلی گئی۔

کچھ دیر بعد سائرہ کی واپسی ہوئی سکینہ بی بی کے چہرے پر خفگی تھی، سائرہ نے ان کے چہرے کو ایک نظر دیکھا۔

"میں کپڑے بدل کر آتی ہوں پھر کھانا کھاتے ہیں۔"

کمرے میں جاتے وہ ملازمہ کو کھانا دسترخوان پر لگانے کا کہتی چلی گئی۔ کھانے کے دوران بھی خاموشی رہی۔ کھانے کے بعد معمول کے مطابق وہ تینوں ٹی وی دیکھتیں اور ساتھ ایک دوسرے کو پورے دن کا حال بتاتی تھیں۔ آج معمول سے ہٹ کر خاموشی تھی تو بالآخر سائرہ نے، نانی کے پاس بیٹھتے ان کی ٹانگوں کو دباتے بات کا آغاز کیا۔

"آپ کو یاد ہے ایک سال پہلے جب آپ کی شوگر بہت لو ہو گئی تھی تو کون آپ کو ہاسپٹل لے کر گیا تھا؟ اور ماموں لوگوں کے پہنچنے تک کون آپ کے پاس ہاسپٹل میں رہا تھا اور گھر میں بھی؟"

سکینہ بی بی جو غور سے اس کو سن رہی تھیں بولیں۔

"صباحت کے اماں ابا"

"تو نانی، کیا یہ دوہرا معیار نہ ہوگا؟ کہ جب ہمیں ضرورت ہو تو وہ حاضر ہوں اور جب ان کو ہماری ضرورت ہو تو ہم ان کے پاس نہ ہوں؟"

"ہاں بات تو ٹھیک ہے پر مجھے اعتراض تمہارے جانے پر نہیں اس پر ہے کہ تم آتے ہی چلی گئی۔"

"نانی، ڈاکٹر ہوں مجھے یہ نہیں دیکھنا کہ میں نے دو دن کی ڈیوٹی کی ہے، یہ دیکھنا ہے کہ کسی کو میری ابھی ضرورت ہے۔" وہ اس کی بات سمجھ کر بولیں۔

"اچھا ٹھیک ہے، کیسی طبیعت تھی صباحت کی؟"

"شوگر بہت ہائی تھی، تھوڑی دیر تک جاؤں گی چیک کرنے۔" وہ سامنے دیوار پر لگی گھڑی کو دیکھ کر بولی۔

"تو ابھی جاؤ چیک کر کے آؤ کیسی طبیعت ہے اب۔"

سائرہ کو ان کی بات پر ہنسی آ گئی۔

"اچھا جا رہی ہوں آپ بھی کمال کرتی ہیں، ابھی آپ کو اعتراض تھا اور اب آپ خود کہہ رہی ہیں کہ جاؤ۔"

"تمہارے نانا کہا کرتے تھے، جب کوئی اچھی بات سیکھو تو فوراً اپنا لو۔"

سائرہ ان کی بات پر تائیدی انداز میں سر ہلاتی لاؤنج سے باہر چلی گئی اور نانی ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

☆☆

ثمین صداقت

ہم خستہ دلاں ہیں

مکمل ناول

'انسان کیا چیز ہے؟ مٹی سے بنا پتلا۔۔۔ یہ مٹی سے بنے پتلے۔۔۔ پیتل، لوہے، سونا، چاندی اور کاغذ سے بنے ٹکڑوں پر مر مٹتے ہیں۔۔۔ ان کی نظر میں سب سے حقیر شے مٹی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آخر میں ان کے ہاتھ مٹی ہی آتی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے۔'

نیوی بلیو شرٹ پہنے، اپنی ٹائی کو ڈھیلا کرتے صوفے پر بیٹھ کر دوسروں کو آگ لگانے کے لیے اس نے اپنا فلسفہ جھاڑا تھا۔ اس خوبصورت شخص نے جس کی آنکھوں میں جگنو تھے اور جس کے ذکر کے بغیر یہ کہانی ادھوری ہوتی۔ یہ شخص ان لوگوں میں سے تھا جو کچھ بھی ہو جائے طوفان آئے یا آندھی، کشتی آدھی ڈوب بھی جائے، وہ امید کا دامن نہیں چھوڑتے۔ جان دے دیں گے لیکن امید ام ہمم!

'کیسی عجیب بکواس ہے؟' وہ اتنا اونچا تو ضرور بڑبڑائی تھی کہ اس انسان کے کانوں میں بخوبی آواز پہنچی۔ اس نے ناک سے مکھی اڑائی۔ ہاں جلنے والے جلتے رہیں۔

''عزیز بھائی! کہیں یہ مٹی آپ ہی تو نہیں؟'

انعم نے اپنی سو سالہ عینک درست کرتے ستارہ کی بات کو نظر انداز کیا ساتھ اس کے فلسفے کا اچار ڈالا۔

'تم بھی مٹی، میں بھی مٹی، سامنے جلتی بھنتی لڑکی بھی مٹی۔'' سارہ نے کتاب سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا، جس کے جوتے ٹیبل پر اپنے فن کے نمونے پیش کر رہے تھے۔ اس کے دیکھنے پر عزیز نے دونوں بھنویں اٹھا کر اس کے دیکھنے کا جواز پوچھا۔

''تم آفس سے آئے ہو یا سرکس سے؟''

کتاب اٹھاتے اس نے اسے ناپسندگی سے دیکھا تھا۔ ''اور اپنے یہ دو نمبر مٹی فلسفے کی دکان اپنے گھر جا کے نہیں کھول سکتے؟ لیکن باہر جانے سے پہلے ٹیبل کو تم نے صاف نہ کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

عزیز نے منہ کے زاویے بگاڑتے صفائی کی دلدادہ بی بی کو دیکھا تھا۔



"واہ کیا زبردست انداز ے ہیں آپ کے۔ دوسرے والے پر تبصرہ محفوظ ہے، پہلا میں اس کے سرکس بھائی سے سچ بڑے شان دار طریقے سے ہار کر آرہا ہوں۔"

کالر جھاڑتے وہ اپنی ہار کی کہانی انعم کو سنانے لگا لیکن اس دوران بھی اس نے سفید جوڑے میں جاتی لڑکی کو دیکھ کر سوچا تھا کہ کوئی کیسے ہر وقت جل سکتا ہے۔

باہر نکل کر اس سفید جوڑے والی نے بھی سوچا تھا کہ کوئی کیسے ہر وقت خوش رہ سکتا ہے؟ کیا ہر وقت خوش رہنے کے لیے وہ کسی کیپسول کا استعمال کرتا ہے۔ گھر کے در و دیوار نے انہیں دیکھ کر سوچا تھا کہ کیسے لوگ اتنی جلدی بدل جاتے ہیں؟ کیا وقت وہ بیماری ہے جو انسان کو بدل دیتی ہے۔ خوشیوں کو نحیف کر دیتی ہے، غموں کو پھیلا دیتی ہے۔

☆☆



رات کھانے کی ٹیبل پر سب بیٹھے تھے۔ یہ تایا کا آرڈر تھا اور ایسا سارہ کے بابا کی وفات کے بعد ہونا شروع ہوا تھا۔ ورنہ دو سال پہلے تک ہر کوئی اپنے کمروں میں کھاتا یا جب دل چاہتا۔ اس وقت ٹیبل پر سارے اہل خانہ موجود تھے۔ تایا، تائی، چچی (چچا ملک سے باہر رہتے تھے)، تایا کا بیٹا ایاز اور چچا کی اولاد ولید اور انعم۔ سارہ کے بھائی خرم اور سارہ۔

عزیز (جس کی کہانی جلد معلوم ہو ہی جائے گی۔) وہ اب کوشش کرتا تھا اپنے گھر ہی کچھ بنا کے کھالے۔ لیکن نہیں تائی ایسے ہونے دیتیں؟

"تایا بتا رہے تھے عزیز! تم جاب کے ساتھ بزنس شروع کرنا چاہتے ہو کوئی؟"

خرم بھائی نے عزیز کی طرف دیکھا جس کا اس وقت سارا دھیان کھانے کی طرف تھا اور وہ اسی وجہ سے سب سے بڑا حامی تھا اس بات کا کہ سب اپنے کمروں میں کھانا کھائیں اور وہ اپنے گھر۔ بقول اس کے ایک تو دھیان کھانے سے ہٹ جاتا ہے کہ سب باتوں میں مشغول ہو جاتے ہیں دوسرا اتنے لوگ اکٹھے بیٹھیں گے تو کوئی نہ کوئی روز کا رونا ضرور سامنے آئے گا۔ "جی بھائی۔ سوچ رہا ہوں میری کمپنی کے ڈائریکٹر کی طرف سے آفر ہے۔۔۔ وہ کافی زور دے رہے ہیں کہ میں ان کے ساتھ پارٹنرشپ کرلوں۔ فلیپنگ پراپرٹی کا بزنس ہے۔ اس کے علاوہ ولید اور ایاز کو بھی اپنے ساتھ شامل کروں گا۔ بات کی ہے سر فیصل سے میں نے۔" وہ کھانا کھاتے عام انداز میں تفصیل سے بتا رہا تھا۔ بات کرتے ہوئے بھی اس کا سارا دھیان اپنی پلیٹ کی طرف تھا۔ ولید اور ایاز دونوں ہم عمر تھے اور عزیز سے تین سال چھوٹے۔ سب کھانا کھاتے عزیز اور خرم بھائی کی طرف متوجہ تھے سوائے اس کے جو پلیٹ میں چمچ چلا رہی تھی۔ وہ آگے ہونے والی گفتگو ابھی بتا سکتی تھی۔

"شروع کیسے کر رہے ہو؟ مطلب سرمایہ وغیرہ؟" خرم نے تایا کی طرف دیکھتے ایسے کہا جیسے لازمی اسی طرف سے پیسا آئے گا۔

"سیونگز ہیں میری اور باقی کچھ پیسے ولید کے لیے چچا بھیج رہے ہیں۔"

وہ احترام سے جواب دیتا کسی بھی طرح کھانے سے توجہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ سارے دن کی خواری کے بعد رات کے سات بجے کھانا نصیب ہوا تھا اور یہاں سوالوں کی فوج کھڑی ہوگئی تھی۔

"تایا بھی کافی ہیلپ کر دیں گے، مسئلہ کوئی نہیں ہوگا تمہارے لیے۔ مسئلے تو ان کے لیے ہوتے ہیں جن کے باپ نہ ہوں۔" سرد مہری سے جملہ پورا کرتے خرم بھائی وہ سارے کمرے کو خاموش کرا گئے تھے۔ تائی نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جو ایسے کھانے میں مصروف تھے جیسے خرم کے منہ سے پھول جھڑے ہوں۔ ولید اور ایاز نے پہلو بدلے۔ ایک تو خرم بھائی۔ "نہیں۔۔۔ میرے پاس پیسے نہ ہوتے تو میں کسی حال میں بھی اس چکر میں نہ پڑتا۔ الحمدللہ میری انکم اتنی ہے کہ اپنی ذمہ داری خود اٹھا سکوں۔" اسے برا تو بہت لگا کیونکہ تایا نے جہاں تک ہو سکا تھا خرم بھائی کی مدد کی تھی اور اب بھی کر رہے تھے۔۔۔ تایا نے کسی بات میں مداخلت نہیں کی۔

تائی نے ان کی طرف دوبارہ نگاہ کی لیکن انہیں معلوم تھا ان کا جواب کہ دو بھائیوں کی بحث ہے دونوں جوان خود نمٹ سکتے ہیں۔ باپ والے طعنے سے عزیز کی بھوک ختم ہوگئی۔ دل دنیا سے ہی اچاٹ ہو گیا۔ پھر بھی اس نے کھانے سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ کیا دنیا والوں کے طعنوں سے اپنا رات کا کھانا خراب کر لیتا عزیز؟

"ہمم۔۔۔ تم کرلو گے۔۔۔" سارہ نے چہرا اٹھا کر خرم کی طرف دیکھا۔ اب یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ عزیز کے لیے خوش ہیں یا پھر۔۔۔ خیر یہ خرم کو خود بھی معلوم نہیں تھا۔ تایا اپنی کرسی سے اٹھے اور تائی کو چائے کا کہتے چلے گئے۔ تائی اور چچی بھی اٹھ گئیں۔

"ان دو قلندروں کو تو کسی بھی قسم کا ایکسپیرینس ہے نا ہی عقل سمجھ...... مجھے لگتا ہے تم اکیلے ہی کر لیتے عزیز۔۔۔ یہ تمہارا سرمایہ ڈبو دیں گے۔" ٹشو سے ہاتھ

صاف کرتے دونوں لڑکوں کو اس قدر صاف طنز کی امید نہیں تھی۔

"خرم بھائی آپ کی بات سو آنے درست پر آپ ہماری سیلف اسٹیم پر بم باری کر رہے ہیں۔" ایاز نے قہقہہ لگاتے کسی طرح گفتگو کا رخ موڑنا چاہا۔

"خیر ہے۔ ڈوب بھی جائے تو۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پیسہ ہی ہے پھر آجائے گا۔" انعم کی کسی بات کا جواب دیتے وہ ہمیشہ کی طرح بات کو ہوا میں اڑاتا بولا تھا۔ سارہ نے اس کی طرف دیکھا۔ کالی قمیص شلوار میں بیٹھا شخص سب طنزوں سے بے نیاز۔

ہاں کچھ لوگوں کے لیے پیسہ خیر ہوتا ہے ڈوب بھی جائے تو خیر ہے اور کچھ لوگوں کے لیے۔

"تم بھی کچھ کرلو سارہ!" اب کے سب نے خاموشی سے خرم کی طرف دیکھا جو ماتھے پر ان گنت تیوریاں ڈالے سارہ کی طرف دیکھ رہے تھے جس کی پلیٹ میں کھانا ایسے پڑا تھا جیسے ایک چمچہ بھی منہ تک نہ گیا ہو۔ اس شخص نے بھی ان کی ٹون پر چمچہ پلیٹ میں واپس رکھا، جس کی توجہ کھانے سے ہٹ نہیں رہی تھی۔

"سارا دن کتابوں میں گھسی رہتی ہو۔۔ کب سے ٹیسٹ دے رہی ہو۔۔ مجال ہے کوئی بھی کلئیر ہوا ہو۔ ایسی بھی کیا نالائقی۔ ایسی بھی کیا کاہلی۔ دو سال ہونے والے ہیں ڈگری ختم ہوئے۔۔ عزیز بھی تمہارے ساتھ کا ہی ہے۔۔ اچھی جاب۔۔ نیا بزنس۔ تم پوسٹ گریجویشن کر کے بھی مکھیاں ہی مار رہی ہو۔ اور ٹیسٹ دینے کے لیے آنے جانے کا الگ رولا۔ میں تو تمہاری سستی سے بے حد بے زار ہوں۔" ان کی تقریر پر سب نے بے چینی سے اسے دیکھا۔ جو پہلا نوالہ منہ میں ڈال رہی تھی۔ کیا اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ تھی۔ کیا آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی؟"

خرم نیپکن ٹیبل پر پھینکنے کے انداز میں رکھتا اٹھ رہا تھا۔

"کل تم پیسوں کا کہہ رہی تھیں کہ پیسے چاہئیں تمہیں۔۔ ابھی پچھلے مہینے دیے تھے وہ کدھر گئے؟ ایک تو تم نے مجھے اے ٹی ایم ہی سمجھ لیا ہے۔۔ پکڑو یہ" ٹیبل پر کچھ نوٹ رکھتے وہ چلے گئے۔

"آپ سب مجھے ایسے دیکھ رہے ہیں۔۔ جیسے ڈرامے کی نئی قسط ہو۔" کھانا کھاتے اس نے ان چاروں کی طرف دیکھتے سب سے پہلے شخص کو دیکھنے سے اجتناب کیا تھا۔

"ہاں صحیح کہہ رہی ہو سارہ! پچھلے مہینے بھی یہی قسط لگی تھی۔ ایک ہی قسط کتنی دفعہ دکھانے کا ارادہ ہے۔" انعم نے ہنستے ہوئے ماحول کو صحیح کرنے کی بے کار کوشش کی۔ سارہ ہنس دی۔ "بندہ کب تک دوسروں کی باتوں پر روسکتا ہے۔"

"لیکن پھر بھی بھائی کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ تم ابو سے کہہ دیتیں تمہیں ضرورت تھی تو بلکہ ابو کو خود دینے چاہئیں بھول گئے ہوں گے۔"

ایاز نے ہمدردی سے اسے دیکھا تھا۔ سارہ نے ایک اور لقمہ لیتے ان کی ہمدردی کو دیکھا تھا۔ اسے ہمدردی نہیں چاہیے تھی۔

"میں کیوں تایا یا چچا سے لوں؟ میں وہاں سے لوں گی جہاں میرا حق ہے ایاز!" صاف آواز میں کہتی اس نے پہلی کرسی پر بیٹھے شخص کو غصے سے سرخ ہوتے ضرور دیکھا تھا۔

"چاہے یہ حق جیسے بھی ملے؟" اب کی دفعہ ولید نے بھی سوال داغا۔ اسے بھی اب اپنی اس کزن کی سمجھ نہیں آتی تھی۔

"ہاں جیسے بھی۔" وہ اپنی پلیٹ اٹھاتی کرسی دھکیل کر اٹھی۔ پیسے اٹھاتے اسے شرم، جھجک کچھ محسوس نہیں ہوا تھا۔ کچن تک جاتے اسے معلوم تھا، وہ پیچھے آئے گا۔

"ابھی کوئی فلسفہ نہ جھاڑنا پلیز......" اس کے بولنے سے پہلے اس نے بغیر مڑے ہاتھ اٹھا کر کہہ دیا تھا۔

"مجھے فلسفہ جھاڑنے کی ضرورت بھی نہیں تمہارے سامنے۔" غصے سے کہتے۔

"تم مجھ سے کہہ سکتی تھیں۔ میں۔" سارہ نے کہنی چھڑاتے اس کی بات کاٹی۔

"پتا ہے یہ کتنی بری فیلنگ ہے اپنے باپ کے علاوہ کسی سے کچھ مانگنا؟ کسی سے کہنا کہ مجھے یہ چاہیے؟ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ تم سمجھتے ہو یہ آسان ہے؟"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی نم آنکھوں سے بولی تھی۔ عزیز نے گہرا سانس لیتے اس کی طرف دیکھا جو دل کھول رہی تھی۔

"دنیا میں ہر ایک رشتہ احسان جتاتا ہے۔۔۔ ہر وقت احساس دلاتا ہے۔" پلیٹ دھوتے اس نے نمی کو بہنے دیا تھا۔ عزیز نے اس کی طرف دیکھا وہ ہمیشہ سے کیا اتنی ہی ضدی تھی؟

"تم اتنی ضدی کیوں ہو؟" والٹ نکالتے وہ اسے کہہ رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے میرا جواب۔۔۔ یہاں رکھ بھی جاؤ۔۔۔ تب بھی میں ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ چلو کل صفائی والی کی دعوت ہو جائے گی۔" پیسے کچن ٹیبل پر رکھتے اس نے اسے دیکھا جو اس کے دیکھنے پر کندھے اچکا رہی تھی۔

"میری بلا سے جو مرضی کرو۔" سارہ نے اس کے جواب پر رخ اپنے کام کی طرف کیا۔

"ہاں بہت پیسہ ہے تمہارے پاس۔۔۔ اچھی جاب۔۔۔ سب کچھ۔۔۔ جس چیز کی خواہش کی، سب مل گیا۔" باقی برتنوں کو پانی میں ڈالتے اس نے طنز کیا تھا۔

"ایویں نہیں آجاتا۔ محنت کرتا ہوں۔" ٹیبل سے ٹیک لگاتے اس نے اسے برتنوں کو صابن لگاتے دیکھا۔

"یہ صحیح ہے۔۔۔ محنت کر کے سب مل جاتا ہے تم لوگوں کو۔ کچھ لوگوں کو محنت کر کے بھی کچھ نہیں ملتا۔" اس کی بات پر عزیز کی ہنسی سنائی دی تھی اس نے مڑ کر اسے گھورا۔

"تم برتنوں پر صابن لگا رہی ہو یا ان کی مار لگا رہی ہو۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"عزیز بھائی! آپ پتلی گلی سے نکل جائیں۔ کبھی برتنوں کی جگہ آپ ہوں۔" انعم نے رکابیاں رکھتے کہا۔

"تم میری دوست تھیں سارہ! تم نے مجھ سے جلنا کیوں شروع کر دیا ہے؟" انعم اور ولید نے جو ابھی آیا تھا ان دونوں کو دیکھا۔ جن کی جنگ کی تیاری مکمل تھی۔

"تم۔۔۔" سارہ نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"اور کیا۔۔۔ جب سے جاب لگی ہے تب سے جل ہی رہی ہو اور رر۔" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے اسے اپنی آنکھیں بند کرنی پڑی تھیں۔۔۔ کیوں؟ کیونکہ سنک سے گلاس میں پانی بھر کر سارہ نے اس کے اوپر پھینک دیا تھا۔ انعم نے "میں نے وارن کیا تھا۔" کہتے ہاتھ تالی کے انداز میں اٹھائے۔

"نائس شاٹ!" ولید کا مشہور زمانہ ہنسی کا دورہ شروع ہو گیا تھا۔ عزیز نے بے یقینی سے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا۔

"تم سے زیادہ بکواس انسان میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ تم" وہ ابھی کچھ اور بولتی۔

"یا اللہ یہ کیا ہے؟" چچی کی آواز پر ان تینوں کی بولتی بند ہوئی۔ عزیز تو پہلے ہی صم بکم بنا کھڑا تھا۔ تائی بھی اندر آ گئیں۔

"یہ کیا۔۔۔ یہ کس نے کیا ہے؟" وہ سارے کچن میں پھیلے پانی کو دیکھتے حیرانی سے کہہ رہی تھیں۔ انعم اور ولید نے سارہ کی طرف انگلی اٹھائی۔

"سارہ۔۔۔ بیٹے یہ کیا حرکت ہے؟" رخشندہ نے عزیز کو دیکھا جو شرٹ کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ۔" سارہ نے پریشانی سے انہیں دیکھا۔ بس وہ ان کے سامنے بری نہیں بننا چاہتی تھی۔

''باجی یہ انعم نے کیا ہو گا۔ تم نے کیا ہے انعم؟''
چچی نے انعم کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا کہ وہ ہاں بولے۔ اس کی گردن ہاں میں بمشکل ہلی تائی کا کیا بھروسا جھاڑ دوا پر سب لگوا تیں۔
''نہیں چچی یہ سارہ نے کیا ہے۔'' عزیز سے اس بات کی توقع کسی کو نہیں تھی۔ اسے بھی سارہ سے یہ توقع نہیں تھی۔
''کیونکہ یہ بکواس کر رہا تھا۔'' سارہ بھی دوبدو بولی۔
''اس لیے تم نے مجھ پر گندا پانی پھینک دیا؟'' اس کی زبان کہاں چپ رہتی۔
''انتہائی بچکانہ فعل ہے۔'' تائی نے ناپسندگی سے سب کو دیکھا۔ ان کی نفاست پسند طبیعت پر بہت بھاری تھا یہ سب۔
''سوری'' وہ تائی کی طرف دیکھ کر کہتی باہر نکل گئی تھی۔ اس سے پہلے تیز تیز قدم اٹھاتا عزیز اس کے پاس سے گزرا تھا۔
''تم سچ میں ایسا سمجھتے ہو کہ میں تم سے جلتی ہوں؟'' اس کی آواز پر عزیز کے قدم مڑے بغیر تھمے تھے۔
''ہاں......'' یہ کہتے وہ گھر کا دروازہ عبور کر گیا۔ وہ اتنا اونچا تو نہیں بولا تھا پھر بھی سارہ کو کافی دیر اس کی آواز کی بازگشت سنائی دی تھی۔
در و دیوار نے ان دونوں کو دیکھا۔ حق ہاہ بدگمانیاں ہر رشتے کو کھانے کا فن جانتی ہیں۔
☆☆☆
''آپ لوگ برائے مہربانی ایک دوسرے سے صلح صفائی کر لیں۔۔ سرد جنگ تو دو سال سے جاری ہے مگر ابھی والے کارنامے کا کوئی حل نکال لیں۔''
ایاز نے دونوں کو باری باری دیکھ کر آدھا جملہ اونچا اور آدھا پست آواز میں کہا۔
''ہاں بالکل ویسے جیسے بچپن میں سارہ آپ نے سوری کی تھی۔۔ مجھے یاد ہے صحن میں سب کے سامنے آپ نے کان پکڑے تھے۔۔۔ کسی نے آپ کو یہ کرنے نہیں کہا تھا۔''
ولید اور ایاز کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ انعم کو تو خاک یاد ہوتا تھا پر ان سب کی امیوں نے اللہ جانے کیوں یہ واقعہ بچوں کو گھول کر پلایا تھا۔
''دیکھو عزیز اور سارہ کی لڑائی ہوتی تھی تو دونوں کان پکڑتے تھے۔'' بس اس کہانی کا سیاق و سباق ان دونوں کو ہی پتا تھا جنہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر نظریں چرائی تھیں۔
''ویسے آپ دونوں عجیب ہی ہیں۔ یا تو بندہ اتنا لڑے نہ یا پھر سوری ووری والا چکر نہ ڈالے۔ ہم تو ایک دوسرے کا سر بھی پھاڑ دیں تب بھی معافی نہ مانگیں۔'' سارہ نے ان تینوں کو دیکھا۔ ہاں وہ درست تھے۔ اللہ نے سارے جہاں میں کم عقل اسے ہی بنانا تھا۔
''اس دن بھی تم نے ہرٹ کیا تھا مجھے۔'' وہ اس کے پاس سے گزرنے لگی تو اس کی آواز آئی۔
''ہاں تائن الیون کے واقعے میں بھی میرا ہاتھ تھا۔'' جل کر اس کی طرف دیکھتے وہ وہاں سے چلی گئی تھی۔
باہر صحن میں بیٹھتے اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا تھا۔ ان لکیروں میں کہاں لکھا تھا کہ وہ ساری عمر بدقسمت ہی رہے گی۔ اوپر آسمان کی طرف نظریں کرتے اس نے آنکھیں بند کیں۔ پر ہوا کہیں نہیں تھی۔
''جب تک انسان اپنی غلطی نہ مان لے۔ سانس نہیں آتا اور انسان بھی تمہارے جیسا۔'' عزیز کی آواز کانوں میں گونجی تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ ایک ہاتھ میں لیپ ٹاپ پکڑے۔ ٹراوزر شرٹ میں کھڑا وہ آنکھیں چھوٹی کیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
''سوری!'' سارہ نے اپنے ہاتھوں کو دیکھتے سوری کہا تھا۔ عزیز کو لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ پھر مسکراہٹ نے ہونٹوں کا احاطہ کیا۔ اس کی آگے سے آواز نہیں آئی تو سارہ نے چہرہ اٹھا کر اسے غصے سے گھورا تھا۔

"اب تم بھی بول دو سوری۔"

"اوہ ہاں اس کی ضرورت نہیں تھی ویسے۔ ہاں لیکن چلو۔ میری طرف سے بھی معذرت۔" وہ کھل کر مسکراتا کہہ رہا تھا۔

"عزیز" اندر سے تایا کی آواز آئی تو وہ اسے دیکھتا چلا گیا۔ سارہ نے سامنے دیکھا۔ بچپن ابھی بھی زہ تھا۔ وہ اور عزیز ایک کلاس میں تھے ہمیشہ سے۔ لوگوں کے منہ آپ کبھی نہیں بند کر سکتے اس لیے اس ی کو بھی پتا تھا کہ عزیز اس کے تایا کا بیٹا نہیں ہے۔ یا کا بیٹا صرف ایاز ہے۔ کلاس میں لڑائی ہونے کے بعد اس نے ساری کلاس کے سامنے عزیز کو کہا ھا۔ "تمہارے تو پاپا بھی نہیں ہیں۔ تمہارا تو کوئی گھر ی نہیں ہے۔ آنٹی بتا رہی تھیں کہ تمہیں تو کوئی مارے گھر کے باہر چھوڑ گیا تھا۔ ہم نے تمہیں پالا ہے اور تم مجھ سے لڑتے ہو۔" پتا نہیں اس نے یہ ت کس کے منہ سے سنی تھی صبح کے وقت اور وہ ویسے ی بول دی۔ عزیز خاموشی سے اپنی بینچ پر چلا گیا تھا۔ س کے حلقہ احباب میں سب سے پہلے لے پالک ونے کا طعنہ سارہ نے اسے دیا تھا۔ وہ سارا وقت خاموش رہا تھا۔ چھٹی کے وقت سارہ کو تشویش ہوئی ب سب دوست گھر جانے لگے تو اسے معلوم ہوا زیز خاموش ہے۔ وہ اپنے بینچ سے نہیں اٹھ رہا۔

"گھر جانا ہے عزیز اٹھو۔" وہ پریشانی سے اس کا بازو ہلا رہی تھی۔ عزیز نے اپنا بیگ پکڑا اور کلاس سے باہر نکل گیا۔ سارہ سارے رستے اس کی طرف یکھتی رہی تھی۔

گھر میں صحن میں تایا ابو کھڑے تھے۔ وہ اپنا یگ پھینکتا ان کے گلے لگا تھا اور پھر سارے گھر نے یکھا تھا کہ وہ کیسے دھاڑے مار کر رویا تھا۔ سب پریشانی سے صحن میں اکٹھے ہو گئے اور وہ بچہ سسکیوں سے روتا رہا اس کی آواز ہر کان نے سنی تھی۔

"مجھے سب...... سب بچے کہتے ہیں کہ مجھے کوئی باہر پھینک گیا تھا۔ سب کہتے ہیں میرے امی ابو نہیں۔ جب مجھے کوئی گھر کے باہر پھینک کر گیا تو آپ نے کیوں اٹھایا ابو؟ مجھے کوئی لے جاتا تو لے جاتا۔ میں مر جاتا۔ آپ نے مجھے کیوں بچایا؟ میرے امی ابو نہیں تھے تو آپ لوگوں نے مجھے کیوں پالا ابو!" وہ روتے روتے جو بات کہہ رہا تھا تائی نے اپنے دل کو بند ہوتے سنا۔ وہ ان کا عزیز بیٹا تھا پھر دنیا کو وہ عزیز کیسے نہیں تھا۔

"کس؟ کس نے کہا ہے یہ تمہیں۔ ایک ایک کا نام بتاؤ مجھے۔" سارہ کے ہاتھ سے بیگ چھوٹا۔ تایا کے غصے سے کون نہیں ڈرتا تھا۔

"میرے کلاس فیلوز کہتے ہیں، ایاز اور خرم بھائی نے بھی کہا۔" اس نے سارہ کا نام نہیں لیا تھا۔ لیکن اگر ایاز اور خرم وہاں ہوتے تو ایک، ایک تھپڑ ان کا نصیب ضرور بنتا۔ تایا ابو اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے۔ پھر اس کی ٹیچرز کو فون کیا، اسکول وزٹ کیا۔ وہ جو کر سکتے تھے انہوں نے کیا۔ دنیا میں صرف ایک باپ آپ کے لیے کھڑا ہوتا ہے یا آپ خود۔ ان دو نفوس کے علاوہ کوئی نہیں آتا۔

گھر کے بچوں کو سارہ کے بابا نے سمجھایا تھا اور ایسا سمجھایا تھا کہ پھر کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ عزیز کو کچھ کہہ سکیں۔ وہ ان سب کا بڑا بھائی تھا۔ دنیا چاہے نہ بھولی ہو وہ گھر والے بھول گئے تھے کہ عزیز لے پالک ہے۔ وہ اس گھر کا بڑا بیٹا تھا۔ بس۔

سارہ نے اگلے دن صحن میں عزیز کے سامنے کان پکڑے تھے سوری کہتے ہوئے وہ روئی بھی تھی۔ خاموش بیٹھے عزیز نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کان پکڑے روتے ہوئے سوری کہہ رہی تھی۔ چچی اور تائی کو سمجھ نہیں آئی کہ کیوں؟ پر ان دو بچوں کو پتہ تھا کہ کیوں یہ ضروری تھا۔

اس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے سیسہ پلائی دیوار بن گئے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے تھے تو تھے بس۔ دوست، بہن بھائی سب۔

گھر پرانے زمانے کا تھا اس طرح بنا تھا کہ ہر کمرے کا دروازہ چاہے کچن ہو یا ٹی وی لاؤنج صحن

میں کھلتا تھا۔ صحن کے بیچ میں بڑے دو کھجور کے درخت تھے۔

سارہ نے تائی کو سامنے سے گزرتے کچن میں جاتے دیکھا۔ انہوں نے غور نہیں کیا تھا کہ وہ وہاں بیٹھی ہے۔ تائی، وہ اس کی ماں جیسی تھیں۔ جب سارہ چار سال کی تھی تب اس کی امی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے بعد اپنی ماں کو تائی میں ڈھونڈا تھا۔ تائی خود اتنی مصروف ہوتی تھیں کہ انہیں یہ دیکھنے کا موقع بہت کم ملا کہ وہ ہمیشہ انہیں کس محبت سے دیکھتی ہے۔ تائی گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر تھیں پھر عزیز اور ایاز دونوں اتنے شرارتی تھے کہ انہیں بہت کم وقت ملتا کچھ اور کرنے کا۔ گھر کا کام بھی زیادہ تر چچی نے ہی سنبھالا اور سارہ کو بھی۔ لیکن کوشش کے باوجود اسے ہمیشہ لگا کہ اسے نہیں پتا چل سکا کہ ماں کیسی ہوتی ہے؟

اس کی محبت کیسی ہوتی ہے؟ اس گھر کے تینوں مرد عجیب تھے، یہ اس سیارے کی وہ مخلوق تھے جو گلی میں چلتے بچے کو بھی محبت دیتے ہیں۔ ان کے لیے گھر کے سارے بچے برابر ہوتے ہیں۔ ہر بچہ سمجھتا ہے کہ وہی ان کی محبت کے عہدے پر پہلے نمبر پر براجمان ہوگا۔ اب اگر کوئی فریق سمجھتا ہے کہ اسے تو محبت نہیں ملی تو وہ احساس کمتری میں مبتلا ایسا انسان ہے جسے جتنی بھی محبت مل جائے اس کا محبت کا کٹورا چھید زدہ ہی رہے گا۔

اسی طرح اس کے بابا بھی ہر ایک کے بابا تھے۔ خرم بھائی اس سے سات سال بڑے تھے۔ وہ ہمیشہ بورڈنگ میں رہے۔ وہ اس گھر کے بڑے بیٹے تھے۔ سب سے لائق فائق۔ پانچویں جماعت میں خرم بھائی کا ایک دوست بورڈنگ گیا تو انہوں نے بھی گھر والوں سے کہا۔

خرم کو بھی لگتا تھا کہ ان کے معیار کے مطابق یہاں کوئی اسکول نہیں۔ بابا نے اسے بورڈنگ بھیج دیا۔ وہ ساری زندگی پہلے بورڈنگ میں رہے پھر پڑھ لکھ لیا تو باہر شفٹ ہو گئے۔ پہلے انہیں یہ چھوٹا قصبہ اپنے لائق نہیں لگتا تھا پھر یہ ملک۔ ان کی اپنی زندگی تھی۔ بابا کی وفات سے وہ ادھر ہی تھے۔

لیکن سارہ وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی کسی ایک چیز کے لیے بھی مورد الزام نہیں ٹھہراتی تھی۔ ہر شخص نے اس کے لیے اپنی طرف سے بہت کیا۔ یہ تو بس اس کی قسمت تھی۔ کتنی دیر وہ وہیں بیٹھی رہی۔

اس نے اپنی کتاب کھولی۔ کاش قسمت بھی اسی طرح کھل جایا کرے۔ پوسٹ گریجویشن کے بعد سے وہ گھر میں تھی کہ اس گھر میں ایک ہی قانون تھا، گورنمنٹ جاب کرو، پرائیویٹ میں نہیں جانا۔ ایک تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لوگ پاکستان میں بائیو ٹیکنالوجی کیوں پڑھتے ہیں۔ کوئی جاب آتی ہے کیا اس کی؟ لیکچرر شپ میں الگ زمین آسمان کا مقابلہ۔

''قسمت ہی خراب ہے'۔ یہ آج کل اس کا پسندیدہ جملہ تھا۔

''یہ بات سن سن کے ہمارے کان پک چکے ہیں۔ سارہ میڈم کی زبان کیوں نہیں تھکتی؟''

وہ تیار شیار بزنس سوٹ پہنے کہیں جانے کو تیار تھا۔

''سارہ نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کب اپنے گھر گیا، کب تیار ہو کر آیا۔ کیا وہ اتنی دیر سے گم صم بیٹھی تھی۔ اس نے حیرت سے اپنے آس پاس دیکھا۔ اسے معلوم کیوں نہ ہو سکا وقت گزرنے کا۔ وہ اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا تھا۔

''ہاں کیونکہ ساری خوش قسمتی تم لوگوں کے نصیب میں جو آ گئی ہے۔'' اس نے اپنے خیالات جھٹکتے اسے جواب دیا جو اس کے ہاتھ سے کتاب لے چکا تھا۔ سارہ نے اسے دیکھا، وہ اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے دل میں سوچا تھا کہ کوئی مانے گا کہ کچھ دیر پہلے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس بکھرے بالوں کے ساتھ کھڑا بندہ یہی تھا۔

''تعریف تو تمہارے منہ سے نہیں نکلے گی۔'' اس کی کتاب کو بند کرتے اس نے کہا جو بلیک بزنس سوٹ میں اچھا لگ رہا تھا یا بہت اچھا۔

یہ پتا ہے تم اسے تک رہے ہو۔ اب میں کیا تعریفوں کے پل باندھوں۔" وہ اس کے ہاتھ سے کتاب لیتے بولی۔ ساتھ بیٹھے شخص کو دیکھ کر کیا کرتا تھا؟۔ہاں اس شخص کو تعریف کی ضرورت نہیں تھی پھر بھی اس کی بات پر اس کی آنکھوں میں جگنوؤں کی فوج نے بسیرا کیا تھا۔

"چلو تعریف نہ کرو۔ دعا ہی کر لو میری بزنس ڈیل کامیاب جائے۔" وہ ناامید تھا نہ ہی اس کا اعتماد متزلزل۔ بس اسے اس لڑکی کو دعا کا کہنے کی عادت تھی۔

"اگر صفر فیصد بھی امکان ہوا تب بھی تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ تم لکی عزیز ہو۔" وہ اس کی بات پر دل کھول کر ہنسا تھا۔ چمکتی آنکھیں چھوٹے لائنین میں تبدیل ہوئیں۔

"میری طرح ان لکی تھوڑی ہو۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز دھیمی تھی اتنی دھیمی کہ اگر عزیز کی ساری حسیات اس کی طرف مبذول نہ ہوتیں تو۔ اس نے افسوس سے اسے دیکھا جس نے جیسے کوئی قسم کھائی تھی کہ نئے کپڑے نہیں لوں گی۔

"یہ ان لکی کیا ہوتا ہے؟" اس کے پاس وقت کم تھا پاس پڑا فون اس نے سیکنڈز میں سائیلنٹ کیا تھا۔

"پازیٹو رہ کر بھی ناکام ہونا، سو فیصد دے کر بھی خالی ہاتھ رہنا، ہر کر کے بھی گلے سڑے پھل کا بھی ہاتھ نہ آنا۔" اس کی بدقسمتی کی تعریف ختم ہوئی تو دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ عزیز کا فون پہلی دفعہ زور کی آواز سے ہلا۔

"کیا یہ بری بات ہے کہ اللہ پر یقین رکھا جائے کہ وہ سب ٹھیک کر دے گا، صبر کا پھل مل جائے گا، جس چیز کے لیے میں محنت کر رہی ہوں، وہ مجھے ضرور ملے گی" وہ اس کی طرف چہرہ اٹھائے سوال پوچھ رہی تھی۔ اس نے اپنا فون مزید پیچھے کھسکایا۔ کیا کام سارہ سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں؟

"اللہ پر یقین یہ نہیں ہوتا کہ جو تم چاہتی ہو، وہ نہیں مل جائے گا نہ ہی یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کی اینڈنگ تم جیسی چاہتی ہو، ویسے ہی ہوگی۔" سارہ کی آنکھوں میں آنسو کیوں تھے اسے نہیں معلوم۔

ان دونوں کی بات سنتے وہ تینوں دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ یہ دونوں گفتگو کرتے انسان کسی زمانے میں ان کے استاد ہوا کرتے تھے۔ مشوروں میں، اسباق میں۔ ان تینوں کو عادت تھی خاموشی سے بات سننے کی۔

"اللہ پر یقین یہ ہے کہ وہ مجھے جو دے گا، بہترین دے گا، وہ جس حالت میں رکھے گا وہی حالت ہمارے لیے بہتر ہوگی، وہ جو اینڈنگ کرے گا وہی اینڈنگ بیسٹ ہوگی۔" سارہ نے سر جھکا دیا۔ جو ہمیشہ کامیاب ہوتے ہوں، انہیں کیا پتا، ناکامی کا دکھ کیا ہوتا ہے۔

"آج محنت کے بعد بھی تمہاری میٹنگ کامیاب نہ ہوئی، پھر بھی تم یہی کہو گے؟" وہ جیسے چیلنج کر رہی تھی۔ تائی نے اس کی بات پر کچن کی کھڑکی سے باہر گھورا پتا نہیں یہ دونوں بہن بھائی کیوں ان کے عزیز کے بزنس کو ناکام کرنے کے پیچھے لگ گئے تھے۔

"میں نے اپنی پوری محنت کی ہے۔۔۔ مجھے فرق نہیں پڑتا کیونکہ محنت میری اور نتیجہ اللہ کا۔" وہ جو کہہ رہا تھا وہاں کھڑا ہر نفوس بتا سکتا تھا۔ عزیز نے اس کی طرف رخ موڑا اب اس کا چہرہ اس کے سامنے تھا۔

"میں تم سے یہ نہیں کہہ رہا کہ پازیٹو رہو، اچھا اچھا سوچو، اشتہار لگاؤ کہ سب ٹھیک ہے۔" وہ بولتے ہوئے رکا "تم ناامید ہو؟ افسردہ ہو؟" اس کے ایک دم سوال پوچھنے پر اس کا سر بے اختیار ہلا تھا۔

"ہر ایموشن کو محسوس کرنا نارمل ہونے کی نشانی ہوتی ہے۔ تمہیں کسی چیز پر غصہ ہے تو صحیح طریقے سے نکالو، منفی خیالات آ رہے ہیں تو ان کی پکار بھی سن لو، افسردہ ہو تو اس چیز کو قبول کرو۔"

اس کے ساتھ میں بس یہ چاہتا ہوں کہ تم اللہ پر

یقین رکھو۔ ماننے میں اور یقین رکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے نا۔ زبان سے مت کہو بس دل سے یقین رکھو کہ ایک دن تمہارے مستقبل کا سورج غروب ہوتے ہوتے طلوع ہو جائے گا۔ بادل گرجتے گرجتے برس جائیں گے۔ تم روتے روتے مسکرا دو گی' اس نے آنسوؤں کے درمیان مسکراہٹ کو آنے دیا۔ اب ساتھ والے گھر کا دروازہ کوئی زور سے بجا رہا تھا۔

"بھائی چلیں جائیں اس سے پہلے آپ کا دوست یہ دروازہ بھی توڑے۔" ایاز نے دیوار سے ہٹ کر سامنے آتے کہا۔ اب ایاز کا فون بھی بج رہا تھا۔ عزیز اپنا فون پکڑتا اٹھا اسے اپنے گھر سے سامان بھی لینا تھا۔ لیکن جانے والے نے گیٹ سے نکلتے پیچھے دیکھا تھا۔ سامنے بیٹھی لڑکی کیا ہمیشہ سے ایسی تھی؟ نہیں تو اسے تو لگتا تھا کل کی بات ہے جب وہ اس کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتی تھی۔ جسے فرائز کے علاوہ کچھ نہیں بنانا آتا تھا آلو بھی وہ اسے کاٹ کر دیتا تھا کیونکہ 'کھانا تو تم نے بھی ہے نا۔" وہ ہنس دیا۔

در و دیوار نے اپنی بوسیدہ کمر جھکا کر ان دو الگ الگ انسانوں کو دیکھا تھا جو پہلے مختلف ہو کر بھی ایک جیسے تھے اب بس وقت اور بدگمانیاں بیچ میں آ گئی تھیں۔

☆☆☆

اس کی میٹنگ کامیاب گئی تھی۔ کیسے نہ جاتی وہ عزیز تھا۔ سارہ نے کمرے سے نکل کر سامنے دیکھا۔ کوٹ ایک ہاتھ پر ڈالے، ڈھیلی ٹائی کے ساتھ وہ لدا پھندا کھڑا تھا۔ شاپرز سے سامان تھا کہ باہر نکلنے کو تیار۔ وہ صحن میں آ گئی۔

'میں نے سوچا تمہیں مبارکباد دے دوں' بھی اگلے دن دوبارہ طعنہ سننا پڑے' جملہ جیسا بھی تھا لیکن آواز، چہرہ، آنکھیں سب میں خوشی تھی اب وہ اتنا تو اسے جانتا تھا۔ وہ دل کھول کر مسکرایا۔ آنکھیں روشن ہوئیں۔

"پھر امی! کباب جل رہا ہے نا۔" اس کی طرف دیکھتے اس نے تائی کو کہا۔

"ہاں۔ جل رہا ہو گا سامنے والوں کے گھر میں۔ جب سے ان کی بہو آئی ہے، روز اسی طرح کی کسی نہ کسی چیز کی جلنے کی بو آ رہی ہوتی ہے۔"

تائی اپنی خوشی میں چیزیں کچن میں لے کر چلی گئیں۔ ان دونوں کی ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسی چھوٹ گئی۔ انعم کے پاس سے ایک چاکلیٹ کا ڈبہ اٹھاتے وہ سارہ کی طرف گیا تھا۔

"عزیز بھائی! یہ میری نہیں تھی؟" انعم اور ولید نے صدمے سے اس کی طرف دیکھا۔

"نیت اچھی رکھو گے تو زندگی میں ہمیشہ کامیاب رہو گے۔" انہیں کہتا وہ اس کی طرف مڑا جو لان کا کسی صدی کا سوٹ پہنے ہاتھ پیچھے کیے کھڑی تھی۔

"اپنی پرانی سہیلی کو دے رہا ہوں یہ جو اب بڑی مشکلوں سے نظر آتی ہے۔" سارہ نے نظریں نہیں جھکائیں۔ جواز ہی نہیں بنتا تھا۔

"شکریہ" ڈبہ پکڑتے اس نے یہ لفظ دل سے کہا تھا۔ وہ مسکرا کر کوٹ کندھے پر ڈالتا مڑ گیا۔ وہاں بیٹھے گھر کے تینوں بچوں نے دعا کی تھی کاش یہ دونوں ٹھیک ہو جائیں۔ سارہ ابھی تک کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔

اور اپنے گھر کی طرف قدم بڑھاتے عزیز نے سوچا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے سب ٹھیک کرنے کا!

گھر کے در اور دریچے آج چہکے نہیں لیکن انہیں اگلی صبح کی آوازیں خوب سنائی دی تھیں۔

☆☆☆

"بس بہت ہو گیا۔" خرم کی صرف اونچی آواز حیرانی کا باعث نہیں تھی لیکن تایا کے ہوتے ہوئے اس آواز پر سب کا دروازے پر نمودار ہونا لازمی تھا۔ ولید اور انعم کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے اس نے بھی سنی تھی دھاڑ۔ ساری چیزیں وہیں چھوڑ کر وہ تینوں صحن میں نکلے جہاں تایا کے کمرے کے سامنے تائی اور چچی کھڑی تھیں۔

"تم چاہتے ہو، میری بہن پر انگلیاں اٹھیں؟"

عزیز کے سینے پر ہاتھ مارتے خرم دوبارہ اونچی آواز میں بولا تھا۔ تایا نے پہلو بدلا۔

"میری بہن ہے وہ۔۔ مجھے پتا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ تم ہوتے کون ہو ہاں اسے پاگل کہنے والے۔۔ ہمت کیسے ہوئی۔" وہ دوبارہ طیش میں آگے بڑھے تو عزیز نے ان کا ہاتھ روکا۔

"آپ بات کو غلط رخ دے رہے ہیں۔۔ یہ بہت، بہت معمولی بات ہے۔ اب ہر دوسرا بندہ سائیکولوجسٹ کے پاس جاتا ہے۔۔ اس میں ایسا کچھ نہیں۔"

ابو سے سارہ کے سائیکولوجسٹ کے لیے بات کرتے اس نے پیچھے بہت دیر میں دیکھا تھا کہ خرم کھڑے ہیں۔ اس کے وہاں موجود ہونے پر بھی عزیز نے اپنی بات مکمل کی تھی اسے یقین تھا یہاں کسی کو اس بات پر اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن خرم بھائی کا چلانا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

"ایک تمہاری اس حرکت کی وجہ سے سارے خاندان میں میری بہن بدنام ہو جائے گی۔ مجھے پتا ہے۔ مجھے پرواہ ہے اس کی۔ ایک دفعہ خاندان میں یہ بات پھیل گئی کہ سارہ پاگلوں والا علاج کروا رہی ہے۔ کون رشتہ لے کر آئے گا اس کا؟ کرے گا کون شادی؟ بدنامی تو میری بہن کی ہوگی۔ تمہارا کیا جا رہا ہے۔" خرم کی بات پر جہاں عزیز کے ماتھے پر ان گنت بل پڑے تھے وہیں تایا بھی صوفے سے اٹھے۔ ولید اور انعم نے مجسمہ بنی سارہ کی طرف دیکھا۔

"خرم۔۔ اب بس کرو۔۔ بہت ہو گیا۔" تایا نے خرم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے اسے پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

"کیا بہت ہو گیا تایا؟ آپ نے اس کی بکواس سنی ہے؟" خرم نے سامنے کھڑے عزیز کی طرف اشارہ کرتے طیش میں کہا تھا۔

"میں نے صرف اتنا کہا ہے سارہ کو سائیکالوجسٹ کی ضرورت ہے۔ وہ بابا کی ڈیتھ کے ٹراما سے نہیں نکل پائی۔ اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے میں اپنی بیوی کو ضرور لے کر جاؤں گا۔ اس کے لیے مجھے آپ میں سے کسی سے اجازت نہیں چاہیے؟"

بیوی پر زور دیتے وہ ٹھنڈے لہجے میں بولا تھا۔ اگر خرم کی آواز میں طیش تھا تو عزیز کی آواز سرد تھی۔

"بیوی؟ کس کی بیوی کون سی بیوی؟ دو سال بعد منہ اٹھا کر کہتے ہو بیوی؟" خرم کا بس چلتا تو شرٹ کے کالر پکڑنے کے ساتھ دو تین مکے بھی برسا دیتا۔ ولید اور ایاز نے جلدی سے ان دونوں کو پیچھے کیا۔

"ان دو سالوں میں کسی نے ایک دفعہ بھی اس نکاح کا ذکر نہیں کیا۔ میرا باپ کیا گیا۔ میری بہن لاوارثوں کی طرح رہی۔" اگر اس لڑکی کو جس کی طرف خرم اشارہ کر رہا تھا، بولنے کا موقع دیا جاتا تو وہ ضرور کہتی کہ آپ کے ہونے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔

"میرے باپ نے تم پر احسان کیا جس کے خاندان نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ جس کا خاندان اس پر تھو تھو کرتا ہے۔ لیکن کر دیا احسان تو کرواتے رخصتی آپ لوگ۔ لیکن اس کی قسمت کیا کھل گئی اب میری بہن آپ لوگوں کو اس کے مقابلے کی نہیں لگتی۔" تایا کے ہاتھ کی مٹھی کھلتی تو خرم ایسے نہ کھڑا ہوتا۔ وہ تایا کا عزیز تھا وہ ایاز سے پہلے عزیز کے باپ تھے۔

"خرم اگر تمہارا باپ زندہ ہوتا تو وہ تمہیں ضرور بتاتا کہ عزیز کا خاندان کون ہے۔ اب یہ معاملہ یہیں ختم ہونا چاہیے۔" تایا نے غصے سے کہا۔ عزیز نے سرخ ہوتی آنکھوں سے سب دیکھا تھا۔ بس یہ خاندان کا طعنہ برداشت کرنا بڑا مشکل تھا۔

"خرم میں اپنے بیٹے کے بارے میں ایک لفظ نہ سنوں۔ حد ہو گئی ہم خاموش ہیں تو جو منہ میں آ رہا ہے بکے جا رہے ہو۔" تائی نے بڑی مشکلوں سے کوئی سخت بات کہنے سے اپنے آپ کو روکا تھا۔

"کیوں تائی عزیز کے لیے رشتے کون دیکھ رہا ہے؟ آپ نے کہا ہے رشتہ کروانے والی سے کہ عزیز کے لیے لڑکی دیکھے۔ آپ کو کیا لگا تھا پتہ نہیں چلے گا؟" تائی کو طنزیہ کہتے خرم نے سارہ کی اڑی رنگت نہیں دیکھی تھی۔

"رخشندہ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔" تایا نے حیرانگی سے اپنی بیوی کو دیکھا۔

"کیا خرافات بک رہے ہو؟ ایاز کے رشتے کی بات کی تھی میں عزیز کہاں سے آ گیا؟ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے خرم! اس کے علاوہ کوئی بات نہیں ہے۔" تائی نے انتہائی یہ افسوس سے دیکھا۔

"جی بھائی باجی نے میرے سامنے ایاز کے لیے رشتے والی سے بات کی تھی۔۔ عزیز کا تو سب کو پتا ہے۔" چچی بھی بولیں۔

"کیا پتا ہے چچی؟ آپ لوگوں نے سارہ کو اپنی بیٹی کبھی سمجھا ہی نہیں۔ ان دو سالوں میں آج تک بھی رخصتی کی بات کیوں نہیں ہوئی؟" خرم نے مزید راز افشاں کیے۔ چچی نے توبہ کرتے ہوئے سر ہلایا۔ دور کھڑی سارہ نے آنکھیں چھوٹی کیے اپنے بھائی کو دیکھا تھا۔ کچھ عجیب تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی بوجھ سے آزاد ہونے کی جلدی ہو۔

"تمہارا رویہ انتہائی بے ادب ہے خرم! لیکن اس بات پر مجھے ذرا بھی اعتراض نہیں ہے۔۔ سارہ ہماری بیٹی ہے۔" تایا نے صبر سے طیش میں کھڑے خرم کی طرف دیکھا۔ پھر عزیز کی طرف جو مٹھیاں بھینچیں کھڑا تھا۔ 'دونوں بچوں کو میں وقت دینا چاہتا تھا۔"

"تمہیں کوئی اعتراض ہے عزیز!" انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے پوچھا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر صحن میں مجسمے کو دیکھا۔ جس کا سارا خون نچوڑ گیا تھا۔ ایسے ہی لگتے ہوں گے وہ انسان جنہیں چیزوں سے تشبیہ دی جاتی ہو۔

"نہیں" اس کے پاس سامنے کھڑی لڑکی کے لیے اس سے اچھا حل کوئی نہیں تھا حالانکہ اس نے ایسے نہیں سوچا تھا۔ اس نے اس گفتگو کا آدھا حصہ بھی سوچا ہوتا تو وہ بات کبھی خرم کے سامنے نہ چھیڑتا۔ سب غلط راستے پر چلا گیا تھا۔

"پھر ٹھیک ہے۔ رخشندہ آپ تیاری۔" ان کے جملہ پورا ہونے سے اور خرم بھائی کے سکون سے صوفے پر بیٹھنے سے پہلے نمک کے مجسمے نے اپنی پوری جان لگا کر آواز نکالی تھی۔

"مجھے اعتراض ہے تایا!" کمرے کے دروازے کے باہر پہنچ کر اس کی آواز اونچی نہیں تھی پر مضبوط تھی۔

"مجھے اعتراض ہے۔ میں کوئی رخصتی یا کچھ بھی نہیں چاہتی۔ پلیز آپ سب میرے لیے اتنی بحث نہ کریں۔" سب کی نظریں اپنی طرف اٹھنے سے پہلے وہ بات مکمل کر چکی تھی۔ عزیز نے اس کی طرف دیکھا یہ دوسری دفعہ تھا۔ وہ دوسری دفعہ اس کے منہ پر انکار کر رہی تھی۔

"سارہ یہ کیا بدتمیزی ہے؟" سب سے پہلے تمیز کا درس دینے کے لیے خرم بھائی آئے تھے۔

"آپ نے کینیڈا جانا آپ چلیں جائیں اپنی زندگی ویسے ہی گزاریں۔ لیکن مجھے مجبور نہ کریں۔ تھوڑا سا سر اٹھا کر جینے دیں۔" خرم کو توقع نہیں تھی اس راز کے کھلنے کی تو ذرا نہیں۔ وہ یہ کہنے کے بعد رکی نہیں تھی۔ پیچھے خرم بھائی نے کیا کیا، عزیز کیوں اونچا بولا، تایا نے کیسے معاملہ سنبھالا اسے کچھ بھی سننے کا شوق نہیں رہا تھا۔ بس ایک آنسو تھے جن کی رفتار کم نہیں ہو رہی تھی۔ ایک قسمت تھی جس نے اسے کہاں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر ایک ہی بات کہی تھی کہ کاش اللہ تعالیٰ آپ اس دنیا میں بیٹی کا سربراہ صرف باپ کو بناتے۔

پرانی دیواروں نے گہرا سانس لیا۔ یہ تو ہونا تھا۔

☆☆☆

وہ سیدھا اپنے کمرے میں آئی تھی۔ دروازہ اور کھڑکی بند نہیں تھے۔ جہاں سے وہ دیکھ سکتی تھی خرم

بھائی گھر سے باہر جا رہے تھے۔ تایا کے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز تیز تھی جیسے کہہ رہی ہو قصہ ختم۔

چچی افسوس میں سر ہلاتی اپنے کمرے کی طرف آ رہی تھیں جنید کو بھی تو فون کر کے سب بتانا تھا کیا ہوا وہ گھر سے دور ہیں لیکن ان کا حق ہے ساری خبریں سننے کا۔

تینوں بچے کونے میں کھڑے تھے۔ اس نے عزیز کو گھر کے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا پھر وہ رکا اور پیچھے دیکھا۔ پیچھے وہ تھی جس سے عزیز کے ہزراوں شکوے ہرے ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا دونوں ہی اس وقت اس فاصلے کو عبور نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کونے میں کھڑے ان تینوں کو معلوم تھا جنگ تو ہو گی۔

وہ تیزی سے اس کے کمرے کی جانب آیا تھا اور وہ کون سا ڈر رہی تھی کہ کواڑ بند کرتی۔ ڈٹ کر کھڑی ہوئی۔ وہ تینوں پھر دیوار کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

"اگر تم آج میری سائیڈ لے لیتی تو کتنے مسئلے حل ہو جاتے۔ تمہیں نہیں پتا کتنا ضروری ہے اس وقت تمہارا سائیکولوجسٹ کے پاس جانا غم سے نکلنا۔ لیکن نہیں اس چھوٹے سے سر میں دماغ کہاں ہے۔" وہ چیخ نہیں رہا تھا لیکن غصہ ہر انداز سے ظاہر تھا۔

"اور میں تمہاری بات کیوں مانتی؟ ہاں دو سال بعد منہ اٹھا کر کہتے ہو بیوی۔ یاد ہے وہ نکاح جس کے بعد تم ہفتہ گھر سے غائب رہے تھے۔ کتنے فون کیے اور کسے کسے نہیں کیے۔ اب تم آ کر کہتے ہو کہ تمہاری بات مان لیتی۔" وہاں تو اس کی آواز مشکل سے نکلی تھی لیکن اس وقت وہ اپنے پرانے انداز میں بازو اوپر چڑھاتی بولی تھی۔ ان تینوں نے کھڑکی سے اندر جھانکا یہ منظر واہ۔ انہوں نے کتنا یاد کیا تھا ان دو پرانے دوستوں کو۔

"جان بوجھ کر نہیں اٹھایا تھا میں نے فون ہاں؟ تمہیں ہر وقت اپنا آپ ہی کیوں مظلوم لگتا ہے؟ چوری ہو گیا تھا فون کتنی دفعہ بکواس کروں ایک؟" وہ آنکھوں میں ہزراوں شکوے لیے کھڑا تھا۔ آنکھوں کی چمک ماند تھی یہ لڑکی کیوں اس کی بات پر اعتبار نہیں کرتی تھی۔

"تمہارا فون چوری ہوا تھا نا۔ سارے ملک کے فون تو غائب نہیں ہو گئے تھے۔ تم گھر فون کر سکتے تھے۔" دو سال۔ ہاں دو سال بعد وہ یہ واقعہ دوبارہ چھیڑ رہے تھے۔

"تم بتا سکتے تھے۔۔ تم کہہ سکتے تھے کہ تم آ رہے ہو۔" اب غصہ مفقود تھا بس نمی تھی۔ آواز میں آنکھوں میں۔ ہتھیلی میں۔

"میں نے جان بوجھ کر یہ نہیں کیا تھا سارہ!" وہ بے بسی سے بولا تھا۔

"مجھے نہیں پتا تم نے جان بوجھ کر کیا یا نہیں، تمہارا فون چوری ہوا یا نہیں (عزیز نے پہلو بدلا)۔ مجھے بس اتنا پتہ ہے کہ میرا باپ تمہیں پکارتے ہوئے اس دنیا سے چلا گیا۔ میں اس کے سامنے تھی اور وہ کہتے تھے عزیز کو بلاؤ۔" اس دنیا میں سب سے مشکل کسی اپنے کا آخری وقت یاد کرنا ہے۔۔ اپنا بھی وہ جو سارا خاندان ہو۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ آپ کی ٹانگوں میں جان نہیں رہتی۔

"میں بابا کو بالکل ٹھیک چھوڑ کر گیا تھا سارہ! میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بابا کی طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔" وہ اس کے پاس پنجوں کے بل بیٹھتا بولا تھا۔

"انہیں خرم سے زیادہ تم سے محبت تھی۔۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ تم نہیں آ رہے۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ تم ان سے ناراض ہو۔" اس کی آنکھوں سے آنسو قطرہ قطرہ بہے تھے۔

"میں ان کے سامنے تھی اور وہ کہتے تھے سارہ عزیز کو بلاؤ۔ میں نے تمہارے کس کس دوست کو فون نہیں کیا۔ میں ساری ساری رات جاگ کر تمہارا نمبر ڈائل کرتی تھی کہ شاید اب تم اٹھا لو۔ تم اس وقت نہیں نہیں تھے عزیز۔ اور اب تمہارا ہونا کوئی معنی نہیں

رکھتا۔" یہ کہنے کے باوجود وہ اس شخص کے پاس سے نہیں اٹھی تھی اس نے اپنے آنسو صاف نہیں کیے تھے۔

"تم نے ہمیشہ مجھے یہ سب کہا ہے۔ تم نے کبھی میرے جیسے کی کہانی کیوں نہیں سنی؟ میرا فون چوری ہوا تھا اور تمہیں لگتا ہے میں نے چور کو آرام سے اپنا فون دے دیا ہوگا؟ وہ فون جو میں نے اپنے سال کی تنخواہ سے لیا تھا۔" اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"میرے سر پر بندوق مارتے انہوں نے نہیں سوچا تھا کہ کوئی مجھے پکار رہا ہے۔ سارا دن ہسپتال میں رہنے کے بعد میں مزید بددماغ ہو گیا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر کسی کو فون نہیں کیا۔ چار دن دوست کے گھر رہا۔" وہ رکا۔ یہ ساری کہانی تائی سمیت گھر کا ہر فرد اسے سنا گیا تھا۔ اس کی دلچسپی صفر تھی لیکن وہ پھر بھی اسے سننا چاہتی تھی۔

"کتنے پریولیجڈ ہو نہ تم لڑ کے ناراض ہو تو گھر چھوڑ کر چلے جاؤ۔" وہ طنز کرنے سے باز نہیں آئی۔ وہ اسے نظرانداز کرتا دوبارہ بول رہا تھا۔

"اگر سب تمہارے لیے مشکل تھا تو میرے لیے آسان تھا کیا؟" وہ لمبا چوڑا مرد آنکھوں میں ڈھیروں آنسو لیے سوال پوچھ رہا تھا۔ سارہ کا جسم ساکت ہوا۔

"میرے دوست نے مجھے چھ بجے جگایا تھا۔ مجھے نہیں معلوم میں گھر کیسے آیا تھا سارے رستے یہی دعا مانگتے کہ سب جھوٹ ہو سب جھوٹ ہو۔۔ اللہ تعالیٰ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" اس کے آنسو فرش پر گر رہے تھے۔

"گھر آنے کے بعد۔" اس نے ہچکی لی تھی۔ اسے بولنے کی ضرورت نہیں تھی سارہ کو یاد تھا۔ سارہ نے اسے دیکھا تھا وہ دروازے میں بیگ سمیت بیٹھتا گیا تھا۔ انکار میں سر ہلاتے اپنے ہاتھوں کو جھٹکتے وہ صرف ایک ہی بات بول رہا تھا ایسا نہیں ہو سکتا۔ ساتھ کوئی دعا تھی جو وہ پڑھتا جا رہا تھا۔ کتنے لوگوں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ وہیں بیٹھا رہا۔

"بابا وہ تھے جنہوں نے مجھے لوگوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہونا سکھایا تھا۔ جنہوں نے مجھے طعنے دینے والے منہ بند کرنا سکھایا تھا۔ کہنے کو میں ابو کا بیٹا تھا لیکن قدم قدم ساتھ دینے والے بابا تھے۔ نصیحت کرنے والے بابا تھے۔ سب کو یہ بتانے والے کے عزیز اس گھر کا بڑا بیٹا ہے بابا تھے۔

پہلی دفعہ میں چار دن گھر سے باہر رہا۔ اور جب گھر آیا تو کیا اتنی بڑی سزا کا حق دار تھا میں؟" اس کا سوال جواب نہیں مانگتا تھا۔

"مجھے تم پر غصہ تھا۔ تمہارے انکار کی وجوہات پر غصہ تھا۔ تم نے اس دن بھی میرے خاندان پر سوال اٹھایا تھا۔ مجھے بابا پر غصہ تھا وہ سب کے سامنے کہتے تھے کہ انہیں عزیز سب سے زیادہ عزیز ہے اور حقیقت میں تم۔۔ تم ان کے لیے سب کچھ تھیں۔" سارہ کے ماتھے پر لاتعداد بل نمودار ہوئے۔

"تمہیں معلوم ہے انہوں نے نکاح کے وقت مجھے کیا کہا تھا؟ انہوں نے کہا تھا کہ عزیز اسی طرح سے اس گھر کا مکمل فرد بن سکتا ہے۔۔ انہیں پتہ تھا تمہارے اس خیال کا۔" اسے ایک دم شدید غصہ آیا تھا سامنے بیٹھے شخص پر۔

"تم اپنے کمپلیکس سے کیوں نہیں نکلتے؟ تم کیوں اتنے سالوں سے ایک ہی سوال پر اٹکے ہوئے ہو؟ خاندان خاندان؟ کبھی تم نے بھی اس گھر کو اپنا گھر سمجھا ہے؟ اور خود بھول گیا تم نے کیا کیا تھا سب کے سامنے؟" واقعہ یاد آنے پر وہ دوبارہ کھڑی ہوئی تھی۔

"اس وقت مجھے وہی ٹھیک لگا۔" وہ آگے کچھ بولتا سارہ نے بات کاٹ دی۔

"واہ۔ صحیح ہے۔۔ اب تم دفع ہو سکتے ہو۔" وہ اس کے سر پر کھڑی بدتمیزی کے ساتھ ہاتھ سے دروازے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ وہ اٹھا اور باہر کی طرف بڑھ گیا پیچھے رہنے والی سے بات کرنے

سے اچھا تھا وہ اپنے گھر کی صفائی کر لیتا۔ وہ تینوں سیکنڈ میں غائب ہوئے تھے۔ عزیز نے بغیر مڑے گھر کی چوکھٹ پار کی تھی۔ آج کا دن ہی منحوس تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے گھر میں داخل ہوا تو ہمیشہ کی طرح ہر طرف خاموشی تھی۔ چار سال کی عمر میں وہ اس گھر سے چپ چاپ ساتھ والے گھر بھیج دیا گیا تھا۔ والدین کو چاہیے جانے سے پہلے اولاد کو کچھ کہہ کے جائیں، کچھ بتا کے جائیں۔ یہ کچھ کہے بغیر وہ کیسے جا سکتے ہیں اس دنیا سے۔

عزیز گھر کا دروازہ بند کرتا برآمدے میں آ کر بیٹھ گیا۔ سارے اطراف دیکھتے اس نے سر جھکایا تھا۔ آنسو بہتے گئے، بہتے گئے۔ کتنی بڑی نعمت ہیں نا آنسو یہ نا ہوں تو دل غم سے پھٹ جائے۔

"جن جن کو میں والدین کا رتبہ دیتا ہوں اللہ آپ ان کو کیوں بلا لیتے ہیں۔ اگر بلانا ہوتا ہے تو اتنا وقت کیوں نہیں ہوتا کہ میں ان سے دو بات کہہ لوں۔ مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور لیکن یہ گلٹ مجھے جان سے مار دے گا۔ مجھے کیوں معلوم نہ ہو سکا کہ بابا کی طبیعت اتنی خراب ہے کہ بابا مجھے پکار رہے ہیں۔" وہ سر جھکائے اونچی آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔

وہ نیچے بیٹھا چھوٹا بچہ لگتا تھا وہی چار سال کا عزیز۔

"اگر حقیقی صبر مصیبت کی پہلی دستک پر ہوتا ہے تو وہ میں نے کیا تھا اللہ۔ میں نے آپ سے شکوہ نہیں کیا۔ میں نے آپ سے صرف مدد مانگی۔" اس کے آنسو ٹھوڑی سے نیچے بہہ رہے تھے۔

"آپ مجھے دوبارہ صبر دے دیں اللہ۔ پلیز۔"

وہ وہاں سے اٹھا اور بیڈ پر سیدھا لیٹ گیا۔ پنکھا بند تھا۔ حبس تھی مگر وہ ایک ہی بات دہرا رہا تھا۔ سارے غم دوبارہ ہرے ہو گئے تھے۔ سارے زخم دوبارہ ادھڑ گئے تھے۔ وہ دوبارہ چار سالہ تنہا عزیز بن گیا تھا۔ عزیز کو صرف بچپن کی چیخ و پکار یاد تھی۔ شاید اس کی ماں کی چیخیں تھیں جو اس کی دماغ میں کبھی دفن نہیں ہوئی تھیں وہ ہر وقت اس کے ساتھ تھیں۔ اس نے اپنا علاج خود کروایا تھا۔ معلوم تھا ان چیخوں پر کس طرح کا ردعمل دینا ہے۔ لیکن کبھی کبھار آپ کا دل نہیں کرتا ردعمل دینے کا۔ عزیز کے لیے وہ دن آج کا دن تھا۔

تیس سال پہلے چار سال کا عزیز اسی کمرے میں سکڑا سمٹا بیٹھا تھا، اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ابھی پرسوں تک تو سب ٹھیک تھا اس گھر میں۔ اس گھر کے در و دیوار نے بھی صرف خوشیاں ہی دیکھی تھیں۔ ساری عمر جن گھروں نے صرف خوشیاں دیکھی ہوں۔ وہ برے وقتوں میں کانپ جاتے ہیں۔ ان کے دل پھر کبھی زندہ نہیں ہوتے۔ وہ ہر خوشی میں غموں کی آہٹ پر کان لگائے رکھتے ہیں۔ ان کی ہر خوشی ادھوری رہتی ہے۔

وہ چار سالہ عزیز پرسوں تک اپنے باپ کی گود میں کھیل رہا تھا۔ اس کے ابو علی کھانا کھانے کے بعد واش روم کی طرف دوڑے تھے اس کی امی نفیسہ واش روم کے دروازے میں ہی بیٹھتی گئی تھیں اس کے ابو کو خون کی الٹی آئی تھی۔ نفیسہ بھاگتی ہوئی ساتھ والے گھر پر پہنچی تھیں اس وقت سارے مرد گھر پر تھے۔ وہ سب دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ رخشندہ بیگم نفیسہ کو سنبھال رہی تھیں۔ کوئی ایمبولنس کو فون کر رہا تھا تو کوئی علی کو اٹھا رہا تھا۔ پانچ سال ہوئے تھے نفیسہ اور علی کو اس محلے میں آئے۔ وہ کہاں سے آئے تھے یہ کسی کو معلوم نہیں تھا بس رخشندہ کو یہی پتہ تھا کہ علی کے والدین نہیں تھے، بھائی بہن کو پہلے ان کی شادی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جب انہوں نے خود لڑکی پسند کی تو دونوں بھائی اور اکلوتی بہن کو لگا یہ شادی کا بوجھ انہیں اٹھانا نہ پڑ جائے۔

انہوں نے خوب رولے ڈالے ہر طرح سے کوشش کی یہ کنوارہ ہی رہے تاکہ کمائی سب مل کر کھاتے رہیں۔ لیکن علی نے دماغ چلایا شادی کی اور اس محلے میں آ کر رہنا شروع کر دیا۔ ضروری نہیں ہوتا بے غرض بہن بھائی ساری عمر قربانیاں ہی دیتے

رہیں ان کا بھی حق ہوتا ہے زندگی پر۔ نفیسہ نے اپنے والدہ کو منانے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے بھائیوں کی وجہ سے نہیں مانی خاندان سے باہر شادی ناممکن۔ آخر میں وہ شادی پر اسی لیے راضی ہوئے کہ نفیسہ، ان سے کوئی تعلق نہیں رکھے گی اور جائیداد سے بھی عاق ہے۔ نفیسہ اور علی نے اپنے سب خاندانی تنازعات سے پرے اپنی الگ دنیا بسائی تھی۔ وہ خوش تھے، مطمئن تھے۔ لیکن ایک قیامت ان کی منتظر تھی۔ خوشیوں کے دن اتنے ہی کم ہوتے ہیں۔ غموں کو آنے کی ہمیشہ جلدی ہی ہوتی ہے۔

عزیز کے ابو، جو اسے کندھے پر بیٹھائے محلے میں پھرتے تھے انہیں اجازت ہوتی تو اپنی جاب پر بھی اپنے بیٹے کو ساتھ لے جاتے۔ وہ آئی سی یو میں پوری ایک رات داخل رہے۔ نفیسہ نے باری باری سب کو فون کیا، اپنے گھر والوں کو علی کے گھر والوں کو لیکن وہ نہیں آئے۔ سارہ کی امی کی طبیعت خراب تھی اس لیے بابا بھی گھر ہی تھے۔ ہاسپٹل میں ساری رات رخشندہ، نفیسہ کے ساتھ رہیں اور اکبر سارے ہسپتال کے عملے کے پیچھے پھرتے رہے۔ ہسپتال میں جا کر صرف ایک ہی دعا دل سے نکلتی ہے، اللہ اس سرد بے حس جگہ پر کسی کو نہ لائے۔

کسی کے گھر سے کوئی نہیں آیا اور علی اس دنیا سے بہت دور چلے گئے۔ جگر کی بیماریاں جگر کے گوشوں سے بہت دور کر دیتی ہیں۔ نفیسہ نے اپنی اولاد سے بھی زیادہ شاید اپنے شوہر سے محبت کی تھی۔ ان کے جنت جیسے گھر میں ایک نہیں دو جنازے آئے تھے۔

عزیز نے بے چینی سے ان دو سفید لباس میں لپٹے لوگوں کو دیکھا تھا۔ وہ بار بار ان کے چہروں پر ہاتھ لگاتا تھا۔ وہ بار بار ان کے نام پکارتا تھا۔ کبھی وہ بھاگ کر اپنا کوئی کھیل کھیلنے لگتا پھر وہ دوبارہ آتا اور ان دو سفید کپڑوں میں لپٹے اپنے والدین کو دعوت دیتا کہ آؤ کھیلیں۔ پھر آخر میں چیخیں مار مار کر رویا تھا کہ یہ کیوں نہیں جاگ رہے۔ وہ پاؤں رگڑ رگڑ کر رویا تھا اور کاش رونے سے اس دنیا سے رخصت ہوئے لوگ واپس آسکتے۔ کاش پکارنے پر وہ جواب دے سکتے۔ ایسا ہوتا تو دنیا کا کوئی غم، غم نہ ہوتا آزمائش آزمائش نہ ہوتی! صبر ایسے آسان ہوتا جیسے چشمے سے بہتا پانی۔

چچی اسے اپنے گھر سارہ ایاز اور خرم کے پاس چھوڑ آئی تھیں کہ شاید بہل جائے۔ اور وہ بہل گیا تھا۔ اس سارے وقت میں بے حس بن کر جو لوگ بیٹھے رہے وہ ان دو جانے والوں کے گھر والے تھے۔ بے حس ہونا، دل پر دے پڑے ہونے کے مترادف ہے۔ وہ ایسے بیٹھے تھے کہ کام ختم ہو اور وہ جائیں۔ اس سارا وقت کفن دفن اور باقی انتظامات اکبر، سجاد (سارہ کے بابا) اور جنید نے سنبھالے تھے۔ کچھ لوگوں کی تربیت ان کے والدین بہترین کر کے جاتے ہیں۔ ایسی تربیت کہ وہ نظر آتی ہے۔ ان تینوں بھائیوں کی تربیت نظر آتی تھی۔

جنازے سے اگلے دن عزیز سارے گھر میں پھرتا رہا۔ لیکن اس کے ابو امی کہیں نہیں تھے۔ کچن میں وہ روتا ہوا گیا تھا وہاں اس کی نام کی کوئی تائی یا چچی ناشتہ بنا رہی تھیں۔ اس کے رونے کی آواز پر مڑی اور کھینچ کر تھپڑ سے اس کا منہ سرخ کر دیا۔ یہ سب اتنا وحشت ناک تھا کہ رخشندہ اور نائلہ (چھوٹی چچی) کے پاؤں زنجیر ہوئے۔ عزیز پھٹی آنکھوں سے رخشندہ کی ٹانگوں سے آکر لپٹا تھا اسے سمجھ نہیں آیا تھا یہ کیا ہوا ہے۔ تائی نے ایاز کو گود سے اتار کر عزیز کو سینے سے لگا لیا تھا۔ وہ ہچکیوں سے روتا بے چین تھا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا اس کی سوچ سے بالاتر تھا۔

تائی اور چچی نے ساری بات اپنے شوہروں کو کہہ سنائی اور معلوم ہوا کہ علی کے بہن بھائی اس گھر کے پیپرز ڈھونڈ رہے ہیں۔ پیپرز کل ہی علی کے کسی دوست نے تایا کو دے دیے تھے۔ ان سب نے فیصلہ یہ کیا کہ جھوٹ بولا جائے۔ عزیز اپنے کمرے کے دروازے سے چپک کر بیٹھا تھا، باہر آوازیں تھیں کہ بند ہی نہیں ہو رہی تھیں۔

تھا۔ سمی کا بڑا بھائی پاگلوں کی طرح بول رہا تھا۔

"یہ گھر کرائے کا ہی ہے یہ پیپرز پڑے ہیں غور سے پڑھ لیں۔" وہ جعلی دستاویزات تھیں لیکن بنوائی تایا نے تھیں تو کوئی پکڑ کے دیکھاتا۔ وہ سارے بہن بھائی عزیز کو چھوڑ کر رفو چکر ہو گئے۔

"اس کے باپ نے سب خود کھا لیا۔ اب اپنا بیٹا بھی آ کر خود سنبھالے۔ مرے یا جیے ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" وہ سب اسی طرح کی بولی بولتے چلے گئے۔ تایا کو نہیں پتا تھا انہوں نے ٹھیک کیا یا نہیں لیکن وہ علی جیسے اچھے بے غرض بندے کی اولاد رول نہیں سکتے تھے۔ عزیز کے گھر کو تالا لگ گیا اور وہ ساتھ والے گھر آ گیا۔

قیامت صرف ایک ہی ہوتی ہے اپنے کسی کا اس دنیا سے چلے جانا۔ رات سب اپنے بستروں پر لیٹے ہی تھے کہ خرم اور سجاد کی چیخوں سے سارے لوگ ان کے کمرے کی طرف دوڑے۔ سارہ کی امی کو بھی بہت جلدی تھی جانے کی۔

عزیز نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ یہ چیخیں پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی تھیں۔ یہ یہاں بھی آ گئیں۔ وہ کچن میں کانوں پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا جب اس نے، اپنی ہم عمر لڑکی کو دیکھا تھا وہ خوفزدہ آنکھوں سے اطراف میں دیکھ رہی تھی۔ یہ سب کیوں رو رہے ہیں اس نے عزیز سے پوچھا تھا۔

"اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لو آواز نہیں آئے گی۔" وہ آدھے ادھورے الفاظ میں اسے یہی کہہ پایا تھا۔ وہ دونوں کانوں پر ہاتھ رکھے آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے۔ پر کاش اس طرح انسان قیامت کو روک سکتے۔

سوگ کے دن ختم ہوئے تھے تو گھر والے روٹین پر آنے کی کوشش کرنے لگے۔ سب گھر والے مل کر سجاد اور بچوں کو سنبھالنے لگے۔

اللہ کہتا ہے کہ وہ استطاعت سے زیادہ نہیں آزماتا تو اس سے زیادہ سچا کوئی نہیں۔ تائی اور تایا

قابل رشک تھی۔ ایاز سے پہلے عزیز۔ عزیز سے پہلے کوئی نہیں۔ تائی جو سارہ اور خرم کو بھی اتنی محبت نہیں دے سکی تھیں جو انہوں نے عزیز کو دی۔

عزیز نے گھر کے ہر فرد کو ان کے القابات سے بلانا شروع کیا تھا۔ اسے معلوم تھا محبت کیسے لی جاتی ہے۔ ایاز ابو امی بولتا تھا تو بس تایا تائی ابو امی۔ سارہ خرم بابا بولتے تھے تو سجاد بابا۔ چچی اور جنید چچا ہی رہے کیوں۔ کیونکہ اس کے اپنے قانون تھے۔ یہ کہنا غلط ہو گا کہ عزیز نے اس گھر کے افراد کے دل میں جگہ بنانے کے لیے محنت نہیں کی لیکن دل تو اللہ کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ اس کی محنت اور صبر کا پھل اللہ نے دیا تھا۔ وہ یہ مانتا تھا۔

وہ صرف ایک دن نہیں تھا جب وہ رویا ہو کہ کسی بچے نے اسے لے پالک ہونے کا طعنہ دیا۔ وہ کئی دفعہ رویا تھا۔ کبھی چھپ کے اور کبھی گھر کے کسی فرد کے سامنے۔ وہ بابا تھے جنہوں نے ایک دن اسے کالر سے پکڑ کر کھڑا کیا تھا۔

"ہیں لڑکے! تم نے بڑا کب ہونا ہے؟ کب تک رو گے کہ خاندان ایسا ویسا تھا؟ ہاں تھا تمہارا خاندان وہ، اب کتنا ناٹک کرنا ہے؟ اگلی دفعہ تم جواب دے کر نہ آئے تو میرے بیٹے نہیں ہو گے۔ ساتھ والے گھر میں خود چھوڑ کر آؤں گا تمہیں۔"

بابا اسے ہکا بکا چھوڑ اپنے کمرے کی طرف بڑبڑاتے جا رہے تھے۔ "بڑا ہی نہیں ہو رہا۔ ہر وقت کا رونا۔ رونے سے کون سے مسئلے حل ہوتے ہیں۔ ایک دن رو لیا دو دن رو لیا۔ مسائل کے حل کے لیے کیا تمہارے فرشتے آئیں گے۔" وہ دن تھا جب اس نے ہر وقت کا اپنے اوپر ترس کھانا بند کیا تھا۔ لوگوں کے منہ اس نے خود بند کروائے تھے۔

"ہاں نہیں پتا میرے خاندان کا۔ تمہیں تمہارے خاندان کا پتا ہے؟ وہ حسین خاندان جس میں کل تمہارے چاچا نے اپنے بڑے بھائی کا سر پھاڑا۔ مبارک ہو تمہیں تمہارا خاندان۔" وہ ایسے

ایسے جواب دیتا کہ اگلا کچھ کہہ نہ پاتا۔ اسے لوگوں کی پرواہ نہیں تھی اسے درد صرف اپنوں کی باتوں پر ہوتا تھا۔ اپنے ہی دل کو چھری سے کاٹنے کا ہنر جانتے ہیں۔

خرم بورڈنگ چلا گیا، پیچھے سارہ اور عزیز کی دوستی مثالی تھی۔ مثالی دوستی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آپ ہمیشہ ہنسی خوشی ساتھ رہو۔ اصل دوستی کا مطلب ہے ایک دوسرے کو سمجھنا، اصلاح کرنا، لڑ جھگڑ لینا بھی، مشکل سے مشکل گفتگو آسانی سے کر لینا۔ اور جن کے غم ایک جیسے ہوں وہ ایک ہو ہی جاتے ہیں۔ کالج تک ایک ہی ادارے میں رہے، پھر سارہ کا اچھے نمبروں کے باوجود ایم کیٹ کلیئر نہ ہو پایا اور عزیز اپنے ایف ایس سی میں کم نمبروں کے باوجود اپنی پسند کے سبجیکٹ اور ادارے میں داخلہ لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اس نے آنکھیں کھول کر آس پاس دیکھا شام صحن میں اترنے والی تھی۔ ماضی کو یاد رکھتے وقت کا حساب کتاب اس نے رکھنا بہت پہلے چھوڑ دیا تھا۔ پنکھا ابھی بھی بند تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا وہ سارہ کی سوچ جتنا امیر ہوتا تو اپنے گھر میں، ایسے پنکھے بنیاں ضرور لگاتا، جو ہاتھ کے اشارے سے چل جائیں۔ وہ سر جھٹکتا اٹھا۔ کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف نگاہ کی۔

وہ ایف ایس سی کے بعد ہی اس گھر میں شفٹ ہو گیا تھا۔ اس نے اس گھر کی ایک چیز بھی نہیں بدلی تھی۔ کچھ چیزیں جیسی ہوں ویسی ہی کتنی اچھی لگتی ہیں۔ چیزیں بھی وہ جن کا آپ کو معلوم ہو کبھی ان پر آپ کے والدین بیٹھے تھے کبھی انہوں نے اس فلانی چیز کو چھوا ہوگا۔ کبھی یہاں کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے بات کی ہوگی۔ وہ واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ سات بجے کھانا کھانے جانا تھا۔

فریش ہو کر باہر نکلا تو اسے باہر آہٹ محسوس ہوئی تھی۔ اس آہٹ سے اس کے جسم میں کرنٹ سا دوڑا۔ اس نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے اپنے کمرے کا جائزہ لیا۔ بیڈ سے لے کر صوفے تک اس کے کپڑے بکھرے ہوئے تھے حتیٰ کہ ڈریسنگ ٹیبل پر جرابیں بھی پڑی نظر آ رہی تھیں۔ اس گھر کی دس عدد چابیاں ساتھ والے گھر کے ہر فرد کے پاس تھیں اور اگر امی بھی اس کے گھر آئی ہیں تو اس کی خیر نہیں۔ (آپ کیا سمجھے تھے کوئی چور آیا ہے؟ کس چور کا دماغ خراب تھا کہ وہ یہاں تو نکلس سال پرانی بیچارے غریب عزیز کی چار پانچ اٹیکس لینے آتا۔)

وہ تیر کی تیزی سے باہر نکلا تھا اور سامنے ہی ایک دوسرے کو آہستہ بولنے کا اشارہ کرتے، وہ سب کھڑے تھے جو اس کے لوگ تھے۔ جنہیں اللہ نے اس کے نصیب میں لکھا تھا۔

''عزیز بھائی!'' ایاز نے مایوسی سے اسے دیکھا تھا۔

''ارے عزیز بیٹا!'' تائی نے افسوس سے سر پر ہاتھ مارا۔ اور باقی دو لوگ جو کیک پر موم بتی جلانے میں ہلکان ہو رہے تھے انہوں نے گہرا سانس لے کر ماچس ہی نیچے پھینک دی۔

''عزیز تمہیں کتنا شوق ہے اپنا ہر سرپرائز برباد کرنے کا۔'' سارہ جو ہاتھ میں کیک پکڑے کھڑی تھی، اس نے اسے گھورا ہر دفعہ یہ انسان یہی کرتا تھا۔ بےحس بےروح۔ اور عزیز قہقہہ مار کر ہنسا تھا۔ آج اس کی سالگرہ تھی۔ اس کی چمکیلی آنکھیں مزید چمک اٹھی تھیں۔ کچھ لوگوں کی آنکھیں اتنی کیسے چمکتی ہیں؟ اتنے جگنو کہاں سے آتے ہیں؟ کیا بازار میں ملتے ہیں؟

''آپ لوگ جتنا شور مچا رہے تھے پڑوسی بھی کیک کھانے آ جاتے۔'' وہ تائی کو گلے لگاتا اپنے کمرے سے ذرا پیچھے لے کر جا رہا تھا۔ آنکھ سے اس نے سارہ کو اشارہ کیا تھا کمرے کا دروازہ بند کرو مگر اسے سمجھ نہیں آیا۔ لیکن جیسے ہی وہ آگے آئی اس نے بھی تیر کی تیزی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا تیر تائی کی تیز نظروں سے نیچے گر گیا تھا وہ کمرے کا جائزہ لے چکی تھیں۔

ہائے عزیز، کمرے کا کیا حال کیا ہوا ہے!
صفائی والی آتی تو ہے۔۔اور یہ گرد کیوں ہے اتنی۔" مغرب کا وقت گزر چکا تھا لیکن تائی کو سب نظر آرہا تھا۔

عزیز نے بے چارگی سے سامنے کھڑی عوام کو دیکھا تھا جو کیک کو میز پر رکھ کر دروازے کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔

"کدھر جا رہے ہو؟ کمرہ کون صاف کرے گا۔میرے اندر طاقت ہے بھلا؟" تائی کی نفاست پسند طبیعت انگڑائی لے کر جاگ گئی تھی۔

"تائی کھانے کا وقت ہونے والا ہے۔بعد میں کرلیں گے۔" انعم منمنائی۔

"تم لوگوں کی بعد کبھی نہیں آتی چلو ایک جھاڑو پکڑے ایک۔" ان سب نے کھا جانے والی نظروں سے عزیز کو دیکھا تھا جس کی آنکھیں رات میں بھی جگمگا رہی تھیں۔اس نے دونوں ہاتھ بے چارگی سے کھڑے کیے۔

"اور سارہ اب تمہیں بھی خیال رکھنا چاہیے۔تمہارا بھی گھر ہے۔" آج کی عزیز کی بات کا اثر تھا کہ تائی کی زبان سے یہ جملے نکلے۔

"ہاں امی! اب بس سارہ ہی کو کرنا چاہیے یہ سب۔" ایاز نے ڈسٹنگ کا کپڑا سارہ کے پاس جا کر جھاڑتے جملہ کسا۔

"صحیح کہہ رہی ہیں تائی۔سارہ پر ڈالیں ذمہ داری۔" کپڑے بالٹی میں ڈالتے انعم اور ولید نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

"آپ سب کی صفائی نہ کردوں میں۔" وہ پیر پٹخ کر گھر چلی جاتی اگر آگے تائی نہ ہوتیں۔اس نے کہتے عزیز کو دیکھا تھا، جو گیلے بالوں میں ٹراؤزر شرٹ پہنے فریج میں کیک ایسے رکھ رہا تھا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

کیک سب کو بھول چکا تھا کیونکہ جب تک گھر صاف نہیں ہوگا، تائی کسی کو ایک نوالہ نہ کھانے دیتیں۔

پھر دیر بعد ساتھ والے گھر میں سب ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے کیک کاٹ رہے تھے۔ان کے مسکراتے چہرے دیکھ کر دنیا کو لگتا تھا جیسے ان صبر کرتے انسانوں پر کبھی کوئی قیامت آئی ہی نہ ہو۔

☆☆☆

گھر میں ہلچل مچی ہوئی تھی کیونکہ خرم کی آج کینیڈا کی فلائٹ تھی۔بقول اس کے وہ یہاں نہیں رہ سکتا تھا۔ایک تو اس کے بیٹے کو یہاں کی سموگ زدہ ہوا پسند نہیں آرہی اور اس کی بیگم ساری زندگی اکیلی رہی ہے اسے اس چڑیا گھر میں گھٹن محسوس ہوتی ہے۔

"اگر یہاں سے جانے کے لیے بھائی بھابی کو بہانا بنانا پڑتا کہ ڈائنا سار آگئے ہیں تو وہ بھی بنا لیتے۔" ولید کے کہنے پر دوپہر کا کھانا کھاتے ان چاروں کو ہنسی کا دورہ پڑا تھا۔

"ابے آہستہ بول۔" ایاز نے تینوں کو کان آگے کرنا کا اشارہ کیا۔"اور کل بھائی یہ بھی کہہ رہے تھے تایا یہاں اتنی ڈسٹ ہے میرا بیٹا اور بیگم دو سال سے صحیح سے سانس بھی نہیں لے سکے۔اگر یہی رہیں تو آکسیجن ماسک خریدنے پڑیں گے۔" ایاز کے جملے پر چاروں جڑے سر دوبارہ تالی مار کر ہنسے تھے۔

"بھابی ایک دن کہہ رہی تھیں میں بمشکل رات کو گاگلز اتارتی ہوں کیونکہ یہاں کا سن افف توبہ۔۔آپ کینیڈا بھی آئیں نا۔پھر آپ کو پتا چلے گا، پانی، ہوا، سورج اصل میں ہیں کیا۔" انعم کی بات پر ان سب کا قہقہہ گونجا تھا۔

"ہوگیا مذاق ختم؟" اور خرم کی آواز پر ان سب کی ہنسی کو بریک لگا تھا۔

"تم جیسے پیٹھ پیچھے دوسروں کا مذاق اڑانے والے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔" خرم کی آواز میں اتنی کاٹ تھی کہ وہ سب سن بیٹھے رہے۔

"نہیں بھائی، اگر ہم پاکستان میں رہ کر سانس لے رہے ہیں تو ہم یقیناً کامیاب بھی ہوسکتے ہیں۔" ایاز اپنی پلیٹ اٹھاتا جملہ مار کر نکلا تھا۔

''ہاہ۔۔کامیاب۔'' وہ استہزائیہ ہنسے۔ ولید اور انعم بھی رفو چکر ہوئے۔ سارہ اٹھنے لگی تو خرم نے اسے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ دیوار کے ساتھ اپنی پلیٹیں پکڑے کھڑے تینوں نفوس نے کان اندر کی لگائے۔۔

''تم کیا چاہتی ہو۔'' سارہ نے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔

''عزیز کے ساتھ رہنا یا میرے ساتھ چلنا ہے تو بتاؤ۔'' خرم ایسے پوچھ رہا تھا جیسے دو گھنٹے میں اس نے کینیڈا نہیں سوات جانے کے لیے نکلنا ہو۔

''دیکھو جو تمہارے دل میں ہے صاف صاف کہو۔'' وہ اس سے سوال پوچھ کر جواب کا موقع نہیں دے رہا تھا۔

''عزیز اچھا لڑکا ہے۔'' کل تک جس کے خاندان پر انگلی اٹھ رہی تھی اب وہ اچھا ہو گیا تھا۔

''بابا نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہوگا۔ کیونکہ مجھ سے تو انہوں نے فون پر بھی پوچھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔'' سارہ نے بولنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ننانوے دفعہ بھائی سننے نہیں اپنی سنانے آتے ہیں۔

''تمہارے نکاح کے بعد فون کر کے اتنا کہا تھا کہ میں نے، اپنی بیٹی محفوظ ہاتھوں میں دے دی ہے۔'' ان کے پاس شاید کہنے کو بہت کچھ تھا۔

''اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں کبھی تمہاری شادی عزیز سے نہ کرواتا۔ ٹھیک ہے اچھا ہے۔ مگر اس کا ارادہ ساری عمر کنویں کا مینڈک بنے رہنے کا ہی ہے۔ یہیں بزنس کرتا ہے اسی کالونی میں رہتا ہے۔ بندے کی اوقات نہ بھی ہو تب بھی خواب تو بڑے دیکھنے چاہیے نا۔'' سارہ نے بمشکل اپنے آپ کو کچھ کہنے سے روکا تھا۔

''دوسرا جو کماتا ہے اس گھر پر لٹا دیتا ہے۔ اسے سمجھانا کہ کچھ عقل سے کام لے۔ تمہارا سوچے۔ اس ملک میں کیا رکھا ہے۔ میں مدد کر دوں گا باہر سیٹل ہونے میں۔ لیکن نہیں جی باہر بھی جائے گا تو پورے خاندان کو پورے ٹبر کو لے کر۔'' وہ ایسے بولنے تھے کہ سارہ کو ٹوکنا پڑا۔

''اس کی زندگی ہے بھائی وہ جو مرضی کرے۔'' خرم نے ماتھے پر لاتعداد بل ڈال کر اسے دیکھا۔

''زندگی ہے مذاق تھوڑی ہے۔ اور کتنے سال اس گھر میں رہنا ہے۔ بابا کو مجھے نکالنے کی تو بڑی جلدی تھی۔'' کبھی کبھی انسان کے منہ سے اصل بات نکل ہی جاتی ہے۔ سارہ نے کرسی سے ٹیک لگا لی۔ دیوار کے ساتھ کھڑے تینوں نفوس نیچے چوکڑی مار کر بیٹھ گئے۔ آج خرم بھائی بولیں گے۔

''میں نے بھی اپنی ماں کھوئی تھی۔ لیکن اس گھر میں ہر ایک کو تمہاری فکر تھی۔ ہر ایک اس عزیز کے پیچھے بھاگتا تھا۔ میں کیا بہت بڑا تھا۔ صرف گیارہ سال کا۔'' وہ آنکھیں جھکائے بول رہے تھے۔ بھڑاس نکال رہے تھے۔ انسان کی عمر جتنی بھی ہو جائے لیکن اندر کے غم اسے بڑا ہونے ہی نہیں دیتے۔

''تائی عزیز کو سنبھالتی تھیں، چچی تمہیں اور بابا انہیں تو اپنے غم سے فرصت نہیں تھی۔'' ان کا دل شکووں سے بھرا ہوا تھا۔

''پھر پانچویں جماعت میں تھا میں جب پکڑ کر مجھے بورڈنگ میں کروا دیا۔ گھر آتا تھا تو ہر طرف عزیز، سارہ۔ ولید انعم، ایاز۔ کسی کو خرم یاد ہی نہیں ہوتا تھا۔'' وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح شکووں کی پٹاری کھولے بیٹھے تھے۔

''ساری عمر بورڈنگ میں گھسائے رکھا۔ رشتوں سے پہلے خود دور کیا۔۔ جب جب میں تم سب کو ایک ساتھ دیکھتا ہوں کیا مجھے دکھ نہیں ہوتا؟ کیا میرا دل نہیں کرتا کہ تم سب میرے ساتھ بھی اسی طرح رہو۔ اسی طرح ہنسی مذاق کرو۔ باتیں شیئر کرو۔ لیکن تم سب مجھے دیکھ کر خاموش ہو جاتے ہو۔ اور عزیز جو اس خاندان کا فرد ہی نہیں اس کے ساتھ کیسے ایک بن کر رہتے ہو۔ کیا میں محسوس نہیں کرتا؟ تم سب ایک ہو بس ایک خرم سب سے تنہا ہے۔'' ان کی آنکھوں کی سرخی بڑھ گئی تھی۔

"جب کسی کو میرا خیال نہیں آیا تو میں کیوں اب کسی کا خیال رکھوں؟ بابا کے لیے عزیز تھا۔ تایا کے لیے عزیز رہا۔ میرا کوئی نہیں اس گھر میں۔" وہ رکے۔

"میں تمہارا بھائی ہوں سارہ! مجھے تمہاری فکر ہے مگر میں یہاں اب سروائیو نہیں کر سکتا۔ اس گھر میں میرا دم گھٹتا ہے۔ تمہیں کیا معلوم کتنا مشکل تھا بابا کے بعد سارے انتظامات دیکھنا۔ یہ سب لوگ جو تمہیں اپنے لگتے ہیں۔ میرے لیے دشمن جیسے ہیں۔ کہنے کو سب بھائیوں کو ایسے دیکھتے ہیں جیسے ہم سے بڑا ظالم کوئی نہیں لیکن کیا، کبھی کسی نے ہمیں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ تم تو گھر میں رہتی ہو۔ پیسے بھی مل رہے ہیں۔ ساری زندگی تو میری خراب ہوئی نا۔" وہ اس کی طرف بے چارگی سے دیکھ رہے تھے۔ سارہ نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

"تمہارے لیے تو یہاں سب ہیں۔ میرے لیے یہاں کوئی نہیں ہے۔ اس لیے میرا جانا ہی بہتر ہے۔" وہ گھڑی دیکھتے اٹھے۔

"مجھے امید ہے تمہیں مجھ سے کوئی شکوہ نہیں ہو گا۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ صرف ایک باپ کا سر پر ہاتھ رکھنا ایسے ہوتا ہے کہ دھوپ سے جھلستے انسان کو سکون آ جاتا ہے۔ صرف ایک باپ کا سر پر ہاتھ رکھنا انسان کو مضبوط بنا دیتا ہے۔ اسے خرم کے ہاتھ سے کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں باپ جیسی طاقت نہیں ہوتی۔

"تمہیں جب میری ضرورت ہو مجھے فون کر سکتی ہو۔ میں آ جاؤں گا۔" خرم سے کوئی کہتا کہ یہ بات جب باپ کہتا ہے "میں ہوں" تو ہم آنکھیں بند کر کے یقین کرتے ہیں۔ جب کوئی اور کہے تو یقین نہیں آتا۔

وہ وہاں سے چلا گیا سارہ بیٹھی رہی۔ وہ اسے صرف سنانے آئے تھے۔ اپنی کہنے آئے تھے اگر سارہ کو بولنے کا موقع ملتا تو وہ، اتنا انہیں ضرور یاد کرواتی کہ پانچویں جماعت میں بھی بھائی نے کیسا بلیک میل کیا تھا بابا کو کہ بورڈنگ میں ہی پڑھنا ہے۔ پھر ملک سے باہر جانے کے لیے انہوں نے کس قدر زور لگایا تھا۔

وہ تینوں اپنی پلیٹوں سمیت واپس ٹیبل پر آ کر بیٹھے تھے۔

"کیا ہوتا سارہ، اگر تم بھائی کو کہہ دیتیں کہ آپ کو بھی ساتھ لے جائیں۔ کم از کم ہمیں برانڈڈ چاکلیٹس تو کھانے کو ملتیں۔" ولید افسردگی سے ٹیبل پر سر رکھتا کہہ رہا تھا۔

"ہاں نہیں تو اور کیا۔ برانڈڈ میک اپ بھی۔" انجم نے بھی منہ بسورا۔

"ہم شوخی ہی مار لیتے کہ ہمارے بھی رشتہ دار کینیڈا رہتے ہیں۔ ہاں بھلا۔ کنویں کے مینڈک نے تمہیں کیا دینا ہے۔" ایاز کی بات پر دوبارہ ان سب کا قہقہہ گونجا تھا۔

"سب کچھ تو وہ گھر پر لٹا دیتا ہیں۔ غریب عزیز بھائی۔" ولید کا صدمہ کافی گہرا تھا۔

"باہر جا کے تم بھی ہمیں دیکھ کر بتاتی باہر کے پانی، سورج ہوا کا۔" اب وہ چاروں دوبارہ اکٹھے ہنسے تھے۔

☆☆☆

خرم چلا گیا۔ یہ کہنا غلط ہو گا کہ کسی کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ ہر انسان کی اپنی جگہ ہوتی ہے۔ خرم کے جانے سے ان کی جگہ خالی ہوئی تھی۔

رات کا کھانا خاموشی میں کھایا گیا۔ خرم کو لگتا تھا اس گھر کے کسی فرد کو اس سے محبت نہیں۔ لیکن اس نے بھی اپنے آنے پر ان کے چہروں پر بکھری خوشی نہیں دیکھی تھی۔ شاید وہ اب، اپنے جانے پر افسردگی دیکھ لیتا تو اسے یقین آ جاتا کہ ان سب کو فرق پڑتا ہے۔

کھانے کے بعد سارہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ صبح خرم کی باتیں تلخ تھیں۔ اسے اپنے بابا کی شدت سے یاد آئی۔ جب بھی ان دونوں بہن بھائی کی آپس میں تلخ کلامی ہوتی تھی، وہ بھاگتی اپنے باپ کے

کمرے میں آئی تھی۔ بابا کسی کو بھی نہیں ڈانٹتے تھے بس وہ سن لیتے تھے۔ ہنستے تھے۔ ان کا سننا اور ہنسنا ہی کافی ہوتا تھا۔

وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کے پاس بہت سے لوگ تھے، جنہیں وہ بتا سکتی تھی کہ خرم کی باتوں نے کیسے دل دکھایا ہے مگر کیسے کوئی اپنے بھائی کی تلخ باتیں اچھالے۔

دروازے پر دستک ہوئی تو سارہ نے چہرہ اٹھایا انعم دروازے میں کھڑی تھی۔ اس نے دوبارہ چہرہ جھکا لیا۔

''آ جاؤں؟'' وہ دروازے میں کھڑی پوچھ رہی تھی۔

''نہیں'' سارہ نے جواب دیا۔

''اوکے۔'' وہ یہ کہتی اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ دونوں آہستہ سے ہنس دیں۔ انعم نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے سارے پاکستانی ڈراموں کی پٹاری کھول لی تھی۔

''کیا آپ کو نہیں لگتا سارہ!'' انعم نے اٹک اٹک کر کہنا شروع کیا۔

''کہ...... اپنا درد کہہ دینا چاہیے...... عزیز بھائی کا مشورہ بہترین ہے۔۔ گریف کو پروسیس کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔'' وہ پہلی دفعہ اس طرح کی کوئی بات کر رہی تھی۔ سارہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔

''اپنوں سے بات کر لینے میں بھی کوئی برائی نہیں ہوتی۔''

''مجھے ہمیشہ سے لگتا ہے آپ کی خوشی دوسروں کی خوشی ہو سکتی ہے لیکن آپ کا درد صرف آپ کا درد ہوتا ہے۔ درد کا کوئی ٹرانسفر سسٹم نہیں ہے۔ یہ آپ کے دل تک محدود رہتا ہے۔ یہ بس آپ کو اندر سے ختم کرتا ہے۔'' وہ اتنا آہستہ بول رہی تھی کہ انعم کو آدھی بات سنائی ہی نہیں دی تھی۔

''آپ دونوں اندر سے ختم ہو رہے ہیں۔'' اس کی بات پر سارہ نے انعم کے چہرے کو دیکھا تھا۔

''اپنے مسئلے حل کر لیں پھر شاید یہ وقت دوبارہ نہ آئے۔'' وہ اس سے چار سال چھوٹی تھی۔ پھر بھی پتے کی بات بتا رہی تھی۔

''اس نے اچھا نہیں کیا تھا۔''

''تو جا کر ابھی کہہ دیں انہیں، لڑیں، بات کریں۔ لیکن ایسے خاموشی سے ہر چیز ختم نہ کریں۔'' انعم نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے تھے۔

''تایا سے کہہ رہے تھے عزیز بھائی کہ سارہ یہ رشتہ نہیں چاہتی تو طلاق دے دیتے ہیں وہ۔'' اس کی بات پر سارہ نے ایک دم سر اٹھایا۔

''ہاں کہہ رہے تھے کہ سارہ کے لیے اچھا رشتہ ڈھونڈیں۔۔۔ اور بس اس رشتے کو ختم۔'' سارہ اس کی بات ختم ہونے سے پہلے اٹھی تھی۔ آدھے گھر نے اسے ساتھ والے گھر جاتے دیکھا تھا اور پیچھے بیٹھی انعم آواز دیتی رہ گئی۔ ''باجی جوتے تو پہنتی جائیں۔''

اب وہ تینوں ساتھ والے گھر کی دیوار سے کان لگائے کھڑے تھے۔ جہاں دروازہ دھڑ ادھڑ پیٹا جا رہا تھا۔

عزیز دس پندرہ منٹ پہلے ہی اپنے گھر آیا تھا۔ کچن میں چائے بننے کے لیے رکھی پھر باہر تار پر لٹکے کپڑے اتارنے لگا اسی اثنا میں دروازہ بجایا نہیں توڑا جا رہا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے آ رہا ہوں ایسی کیا قیامت آ گئی ہے۔'' ایک ہاتھ پر کپڑے لٹکائے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

''تم۔ امی تو نہیں آ گئیں؟'' اس نے سارہ کو دیکھنے کے بعد اس کے پیچھے جھانکا۔ ابھی اپنا کمرہ صاف کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تائی کو نہ پا کر اس نے شکر کا سانس لیا پھر سامنے لال چہرے کے ساتھ کھڑی سارہ کو دیکھا۔

''نیا دروازہ تمہارا بھائی لگوا کے دے گا؟'' اب وہ اسے نظر انداز کیے، اپنے دروازے کو ہاتھ لگا کر دیکھ رہا تھا۔ ستائیس سال عمر تھی دروازے کی۔ عام بات تھوڑی ہے۔

''تم نے تایا سے کیا کہا ہے؟'' وہ اسے پیچھے

کی فکر نہیں اس کی۔ وہ ابھی تک اپنا دروازہ پکڑے کھڑا تھا۔

"خرم بھائی سے پیسے لوں گا میں۔" دروازے پر آنچ بھی نہیں آئی تھی لیکن وہ طعنہ مارنے سے باز کیسے آتا۔

"تم نے تایا سے کیا کہا ہے؟" وہ بازو باندھے اونچی آواز میں بولی تھی۔ عزیز کے ماتھے پر بل پڑے وہ دروازہ بند کرتا آگے آیا، جہاں وہ لڑنے مارنے کے لیے تیار تھی۔

"کیا کہا ہے میں نے۔" ایک ہاتھ میں کپڑے پکڑے دوسرے ہاتھ کو کمر پر رکھتے اس نے ابرو اچکا کے پوچھا۔ اس کی بدلحاظی پر آنکھوں کی چمک ماند پڑی۔

"تم نے تایا سے کہا کہ میں طلاق لینا چاہتی ہوں؟" عزیز کا تو منہ کھلا ہی دیوار کے ساتھ چلتی الحم کی بھی سٹی گم ہوئی۔ ولید اور ایاز نے اسے گھورا۔

"ایسے نہیں کہا تھا میں نے۔ اسکرپٹ سے ایک لائن بھی تبدیل نہیں کی میں نے۔" وہ ان دونوں کو صفائیاں دے رہی تھی اور دوسری طرف عزیز نے صحن میں پڑی کرسی پر کپڑے پھینکے۔

"رات کے وقت تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟" اسے یقین نہیں آیا تھا رات کے آٹھ بجے وہ اس پر الزام تراشی کرنے آئی تھی۔

"کیا تم کبھی بدل سکتے ہو عزیز؟ اس دن بھی تم نے گھر کے ایک ایک فرد کے سامنے الزام لگایا تھا۔ اور اب بھی تم یہی کر رہے ہو۔" اس بات پر عزیز کا دماغ گھوما تھا۔

"میں نے تم پر کب الزام لگایا ہے؟ اس دن صرف ایک وہی راستہ تھا نکاح روکنے کا۔ اور کیا جھوٹ بولا تھا میں نے؟ تم عادل کو پسند نہیں کرتی تھی کیا؟ تم نے مجھے خود بتایا تھا کہ عادل پرپوزل بھیجنے کا کہہ رہا ہے کہا تھا یا نہیں؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھے استفسار کر رہا تھا۔

"ایک دوست کی حیثیت سے تم سے شیئر کیا تھا یہ نہیں کہا تھا کہ پورے محلے کے سامنے اعلان کر دو۔" وہ بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی تھی۔

"میں نے تم سے ایک دفعہ نہیں کہا تھا کہ میں اسے پسند کرتی ہوں۔ میں نے صرف اتنا بتایا تھا کہ اس نے پرپوز کیا ہے بس۔" اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہو رہا تھا۔

"میرے بیمار باپ کے سامنے تم نے مجھ پر الزام لگایا تھا۔" ایک قطرے آنسو نے رسوا کر دیا۔

"چچا مولوی کو لے کر آ گئے تھے۔ تم کھڑی میرے خاندان پر انگلی اٹھا رہی تھی۔ میرے پاس اس ایک آپشن کے علاوہ کوئی رستہ نہیں تھا نکاح رکوانے کا۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ شاید اب بدگمانی چھٹ جائے۔ بدگمانی سے پرے دو سال کا منظر بڑا واضح تھا۔

سجاد اپنے بستر پر لیٹے تھے دو تین دن سے بخار ہی نہیں اتر رہا تھا۔ تین دن پہلے بالکل ٹھیک تھے اب بخار تھا کہ جان ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔ انہوں نے دونوں بھائیوں کو کمرے میں بلایا اور صاف صاف کہا کہ عزیز اور سارہ کی شادی انہوں نے بہت پہلے سے سوچی ہوئی تھی اب کم از کم نکاح ہو جانا چاہیے۔ جب ان کی طبیعت بہتر ہو جائے گی باقی فنکشنز تب رکھ لیں گے۔ تینوں بھائیوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اعتراض تھا تو دو نفوس کو۔

"بابا۔ کبھی نہیں۔" سجاد نے پہلے سارہ کو بلایا تھا اور اس کا جواب صاف تھا۔

"میرے بیٹے۔ عزیز میں ایک بھی خامی ہو تو مجھے بتاؤ۔" انہیں پہلے تو یقین نہیں آیا کہ صاف انکار کیسے ہو گیا۔

"کوئی خامی نہیں ہے۔" سارہ کے دماغ میں فوراً عادل آیا تھا۔ اسے اپنے سینئر سے ذرا سی بھی دلی وابستگی نہیں تھی۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کے پرپوز کرنے کے بعد وہ خوش تھی۔ کل ہی اس نے عزیز کو بھی اس سارے معاملے کے بارے میں بتایا تھا۔ اس کا ارادہ جلدی اپنے گھر والوں کو لے کر

آنے کا تھا۔ اور یہاں بابا۔

"سارہ بیٹے! عزیز میرا بڑا پیارا بچہ ہے۔ اس نے ساری عمر خاندان کے طعنے سنے ہیں۔ اگر تمہاری اس سے شادی ہو جاتی ہے تو سب لوگوں کے منہ ساری زندگی کے لیے بند ہو جائیں گے۔ کہیں نئی جگہ رشتہ ہوگا وہاں بچے کو دوبارہ کئی باتیں سننی پڑیں گی۔ میرا عزیز بہت مضبوط ہے۔ لیکن انسان صفائیاں دے دے کے بھی تھک جاتا ہے نا۔ میں چاہتا ہوں وہ خوش رہے۔ اور مجھے یقین ہے اس کے ساتھ تم ایک اچھی زندگی گزارو گی۔" اس کے دماغ میں بار بار عادل کا ہی خیال آ رہا تھا کہ اگر وہ بابا کو بتا دے ابھی۔ لیکن ان کی باتوں کے بعد وہ ایک دم خاموش ہو گئی تھی۔ کیا کرنا چاہیے؟ دماغ میں کلک ہوا تھا عزیز سے بات کرتی ہوں۔

سجاد اسے خاموش دیکھ کر خود ہی خوش ہو گئے تھے۔ یہ صبح آٹھ بجے کا وقت تھا۔ سارہ اپنے حساب کتاب میں مگن تھی جب چچا کمرے میں آئے تو وہ اٹھ کر صحن میں چلی گئی۔ عزیز ابھی تک اپنے گھر سے نہیں آیا تھا۔ وہ کمرے میں چلی گئی اور پھر بیڑا غرق ہو نیند کا، وہ ایسے سوئی کہ ایک بجے انعم نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا تھا۔

"اٹھیں سارہ۔۔۔۔ باہر آپ کے آناً فاناً نکاح کی تیاری ہو رہی ہے اور آپ گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہی ہیں۔" انعم بولی تو بم پھاڑتی ہی چلی گئی۔ ابھی تائی کو خیال آیا تھا کہ مولوی تو آ رہا ہے لڑکی کو بھی تیار کر دیتے ہیں۔

"کیا؟" اس کا منہ کھل گیا یہ کیا بول رہی ہے۔

"ہاں۔ عزیز بھائی سے۔ بابا مولوی ڈھونڈ رہے ہیں۔ باقی سب راضی ہیں۔" اپنی لے میں بولتے اب اس نے سارہ کی پریشان شکل دیکھی تھی۔

"آپ سے صبح تایا نے پوچھا تو تھا اور آپ نے ہاں بھی کی تھی۔" اب کے سارہ فوراً بستر سے اٹھی تھی۔ مشرقی لڑکی کی خاموشی ہاں ہوتی ہے جملے کی تو ایسی کی تیسی۔ وہ پاؤں میں چپل پہنتی بابا کے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔

"بابا! آپ ایسے کیسے۔" کمرے میں جا کر وہ جملہ پورا نہیں کر سکی تھی۔ وہاں سارا گھر موجود تھا سوائے چچا کے۔ وہ مولوی کی تلاش میں جو نکلے تھے۔

"ہاں آؤ سارہ!" بابا نے اسے اپنے پاس بٹھایا۔ اس نے ان کی دوسری طرف بیٹھے عزیز پر بھی نظر ڈالی جو غائب دماغی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں سے سوال بھی پوچھ رہا تھا یہ کیا ہو رہا ہے بھئی؟

"عزیز کو بھی کوئی اعتراض نہیں۔ کیوں عزیز صحیح کہہ رہا ہوں نا میں۔" اب وہ اس سے سوال پوچھ رہے تھے۔ جو ایک ہاتھ سے اپنی گردن کو دباتے ایسے سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا جیسے سانس نہ آ رہا ہو۔ نچلا لب دانتوں میں دبائے وہ بے چین نظر آتا تھا ابھی کل ہی تو وہ اسے، عادل کے پرپوز کرنے پر مبارک باد دے رہا تھا۔

"بابا، بخار اتر جائے پھر یہ سب کر لیں گے نا۔" عزیز بولنے کے ساتھ سارہ کو آنکھ کے اشارہ سے کہہ رہا تھا کچھ کرو۔

"ہاں ہاں پھر دھوم دھام سے کریں گے ابھی تو بس دل کی خواہش ہے کہ نکاح ہو جائے۔" وہ تین دن سے بخار میں مبتلا تھے لیکن ابھی ان کا خوشی سے بھرپور چہرہ جوانی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔

بابا کے جواب پر عزیز نے دوبارہ سارہ کو دیکھا۔ دونوں کی بس رونے کی کسر باقی تھی۔ سارہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے۔

"بھائی۔۔۔ جنید کو مولوی مل گیا ہے وہ آ رہا ہیں بس۔" چچی کی آواز پر جہاں باقی سب خوش ہوئے تھے، وہیں ان دونوں نے آنکھیں پھاڑ کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"چلو اٹھو دونوں تیار ہو جاؤ۔ ٹھیک ہے گھر میں ہے لیکن سب کو۔" تائی کچھ کہہ رہی تھیں لیکن سارہ کی زبان چلنا شروع ہو گئی تھی۔

"بابا، میں عزیز سے شادی نہیں کر سکتی۔" عزیز نے اتنے صاف انکار کا بھی تصور نہیں کیا تھا لیکن چلو شاید کچھ بن جائے، سوچتے سانس لیا تھا اور باقی سب ہیں کر کے اسے دیکھ رہے تھے۔ تایا نے ماتھے پر بل ڈال کر سارہ کو دیکھا جبکہ بابا شاک کے عالم میں سانس لینا تک بھول گئے۔ سارے گھر کے سامنے وہ صبح سے کہہ رہے تھے کہ میری بیٹی نے ایک دفعہ مجھے نا نہیں کیا۔ اللہ ہر کسی کو ایسی اولاد دے۔ اور اب۔

"آپ کو معلوم ہے بابا، کتنے نقصانات ہیں کزن میرجز کے۔ ساٹھ فیصد کزن میرج ہوتی ہیں اس ملک میں، اس وجہ سے لاتعداد جینیٹک پیچیدگیاں ہوتی ہیں، بچوں میں تھیلے سیمیا وغیرہ وغیرہ جیسے امراض کا تناسب بڑھ رہا ہے، بچے جلدی کم عمری میں مر جاتے ہیں، ایموشنل پروبلمز الگ ہوتی ہیں۔ مطلب کزن میریج کرنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے۔ آپ میری بات۔" اس کی تقریر درمیان میں ہی رہ گئی تھی کیونکہ تائی نے اسے غصے سے ٹوکا تھا۔ سارہ نے تھوک نگل کر چہرہ اوپر اٹھایا۔ عزیز اس کی تقریر پر حیرانی اسے دیکھ رہا تھا۔ واہ کیا ڈھونڈ کے جواز نکالا ہے۔

"تمہیں پتا ہے تم کیا بول رہی ہو، عزیز کون سا تمہارا کزن ہے؟" تائی نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔ سارہ نے اپنا سر دبایا۔ اللہ۔

"پھر۔۔۔ بھی۔۔۔ مسئلے ہو سکتے ہیں نا۔۔۔ اس کے گھر۔" کوئی جملہ نہیں بن رہا تھا۔ پھر اسے اپنی طرف سے ایک معقول جواز ملا تھا۔

"بابا، عزیز کے گھر والوں کا بھی نہیں پتہ نا۔ اتنے عجیب جاہل ہیں وہ، کیا پتہ وہ آ جائیں کہیں سے اور تماشہ کریں اور۔" اس کا دماغ نہیں چل رہا تھا صرف زبان چل رہی تھی۔ بابا کا 'بس بہت ہو گیا' اتنا اونچا تھا کہ وہ کانپ گئی۔ باہر سے جنید کی آواز آ رہی تھی۔ مولوی آ گیا تھا۔ اس نے عزیز کی طرف دیکھا جو غصے سے سرخ چہرہ لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ الفاظ ہوتے ہیں جو ہمیشہ برچھی کی طرح لگتے ہیں۔ آپ جتنے بھی بڑے ہو جاؤ۔ وہ الفاظ ہمیشہ درد کرتے ہیں۔

"بابا، یہ عادل کو پسند کرتی ہے۔" عزیز بولا نہیں تھا اس نے بم پھاڑا تھا۔ ہر کوئی اپنی جگہ جم گیا۔ سارہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"کون عادل؟" سجاد نے دونوں کو باری باری دیکھا۔ ان کا سارا خون نچڑ گیا تھا۔

"سینئر ہے۔ وہ رشتہ بھیجے گا۔ اس نے کہا ہے وہ۔"

"اور جو میں کہہ رہا ہوں وہ تم دونوں کو سنائی نہیں دیتا؟" عزیز کی بات کاٹ کر سجاد صاحب دھاڑے تھے۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے سارہ؟ تم پسند کرتی ہو کسی کو؟ پہلے کیوں نہیں بتایا تھا مجھے۔ صبح کیوں چپ کر کے چلی گئی تھیں؟" وہ سیدھے بیٹھے پوچھ رہے تھے۔ سارہ نے سب کی طرف دیکھا ہر کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلی لڑکی تھی جو اپنے خاندان میں یونیورسٹی گئی یہ بات آگے آنے والی بہنوں کے لیے لاکھوں مسائل کے دروازے کھول سکتی ہے۔ عادل سے تو اسے ذرا سی دلی وابستگی بھی نہیں تھی لیکن اس عزیز کو وہ کبھی معاف نہیں کرے گی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے بابا! عزیز کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کا فیصلہ مجھے منظور ہے۔" اس نے اپنے باپ کا ہاتھ پکڑتے کہا تھا۔ بس ان آنکھوں میں بے یقینی نہ آئے بس یہ ہاتھ سلامت رہیں۔ ان پر تو ہزار عادل قربان۔

"تمہیں کوئی مسئلہ ہے؟" وہ اب عزیز سے پوچھ رہے تھے۔ عزیز نے انکار میں گردن ہلائی۔ وہ بھی اس لڑکی کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ خاندان کا طعنہ بڑا بھاری ہوتا ہے۔

ڈھیروں بدگمانیاں چھپائے اسی حلیے میں وہ دونوں نکاح کے بندھن میں بندھ گئے تھے۔ باقی سب خوش تھے یا ظاہر کر رہے تھے، ہنستے مسکراتے

ایک دوسرے کو مٹھائی کھلا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد عزیز وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ اپنے گھر میں آتے دروازوں کو ٹھوکر مارتے اس نے ایک بیگ میں سامان ڈالا تھا۔ ابھی فی الحال — وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ عجیب فیصلہ سر پر دے مارا تھا۔ فیصلے سے زیادہ اسے سارہ کی باتوں نے افسردہ کیا تھا۔ جلد بازی میں سچ ہی نکلا ہوگا۔ وہ اس کے خاندان کے بارے میں یہ سوچتی تھی۔ وہ سامان لیے اسد کے گھر چلا گیا تھا۔ کچھ دنوں کے لیے۔ کچھ دنوں میں کچھ بدلتا ہے کیا؟

دوسری طرف سارہ نے اپنے کمرے میں جا کر دوپٹا اتار کر بیڈ پر پھینکا تھا۔ یہ کیا ہوا تھا؟ عزیز اور وہ اچھے دوست تھے لیکن دوست ہوتے ہوئے بھی ان کی آپسی جنگ دیکھنے لائق ہوتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ چیختے چنگھاڑتے تھے بس وہ دونوں مختلف تھے۔ کپڑوں کی پسند سے لے کر کھانے پینے تک، رنگوں کی پسند، شوق، خیالات وغیرہ سب مختلف۔ لائف پارٹنر کیا بلا ہے یہ تو اس نے آج تک سوچا نہیں تھا لیکن اسے غصہ اس زبردستی اور عزیز کی بکواس پر آرہا تھا۔

رات بابا کا بخار تیز ہو گیا تھا وہ ساری رات پٹیاں رکھتی رہی۔ چچا تایا باری باری رات کو آتے رہے۔ ولید، نعم، ایاز بھی پانی لا کر دیتے اور کبھی اس کے ہاتھ سے کپڑا پکڑ کر خود پٹیاں کرنے لگتے۔

صبح تک ان کا بخار اتر گیا تھا اور آنکھیں کھولتے ساتھ انہیں نے جو پہلا جملہ بولا تھا وہ یہی تھا

"عزیز نہیں آیا؟" سارہ کا حلق تک کڑوا ہوا۔

"بابا آپ کے عزیز کا فون بند ہے۔" بابا اس کی شکل دیکھ کر ہنس دیے۔ دوپہر بخار پھر تیز ہو گیا تھا۔ گھر کا ہر فرد انہیں ہاسپٹل لے کے جانے کی جدوجہد کرتا رہا مگر وہ نہیں گئے۔

"نہیں یار بس ہسپتال نہیں جانا۔۔ یہیں بلا لو شفیق کو۔" ڈاکٹر گھر آتا رہا اتنا کوئی مسئلے کی بات نہیں تھی۔ لیکن جب تیسرے دن بھی بخار تیز ہی رہا تو دونوں بھائی زبردستی ہاسپٹل لے گئے۔ ہاسپٹل میں ٹیسٹ ہوتے رہے۔ واپسی پر سب سے پہلا سوال ان کا پھر یہی تھا۔

"عزیز نہیں آیا؟ اسے فون کرو۔" سارہ نے اب بے چینی سے اس کا نمبر ملانا شروع کیا تھا پتا نہیں دل کیوں اتنا خراب ہو رہا تھا۔ بے چینی ہی بے چینی تھی اور اتنی افسردگی کیوں تھی ہر چیز پر۔ ستمبر تھا دسمبر تھوڑی۔ لیکن ہر چیز اداسی کی لپیٹ میں تھی۔ ایاز اور ولید اس کے دوستوں کے گھر گئے تھے مگر اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ اب سب گھر والے واقعی پریشان ہوئے تھے۔ وہ زندگی میں کبھی گھر سے اس طرح غائب نہیں رہا تھا۔

دوسری طرف عزیز اسد کے گھر آرام سے فون گنوا کر رہ رہا تھا۔ سال کی محنت کا فون تھا۔ سارے ستارے ایک دم ہی گردش میں آنے تھے۔ گھر کے حالات سے بے خبر وہ اسد کے ساتھ سارا دن کچھ نہ کچھ پڑھتا یا گیمز کھیلتا۔ لیکن ایک بے چینی تھی کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ وہ کبھی بھی فارغ نہیں رہا تھا شاید اس لیے اتنی بے چینی تھی۔ ایک دفعہ اس نے سوچا کہ گھر فون کرتا ہوں۔ لیکن اسے معلوم تھا گھر والوں کی آواز سن لی تو ایک سیکنڈ گھر سے باہر رہنا محال ہو جائے گا۔ ایک دفعہ ہی سب دیکھ لوں گا کہہ کر وہ دوبارہ سے کتاب پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

یہاں سارہ کو بھول چکا تھا وہ اس سے ناراض ہے۔ اسے صرف یہ معلوم تھا کہ عزیز کا فون بند ہے۔ وہ ساری رات اس کا نمبر ڈائل کرتی رہی تھی۔ اس کے کمرے میں زمین پر صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھا ولید سوشل اکاؤنٹس پر اس کے دوستوں کو میسج کر رہا تھا۔ اگلے دن ناشتے پر دوبارہ بابا کے وہی سوال تھے عزیز کدھر ہے؟ عزیز فون کیوں نہیں اٹھا رہا۔ سارہ کو ان پر غصہ آیا سارا گھر بابا کے لیے پریشان تھا اور انہیں صرف عزیز کی فکر تھی۔ وہ ناشتہ رکھ کر اپنے

کمرے میں آئی۔
پھر وہ ناشتے کے لیے بھی باہر نہیں نکلی تھی۔ بابا نے بلایا تب بھی نہیں گئی۔ انعم آئی لیکن اس کا موڈ دیکھ کر الٹے قدموں واپس لوٹی تھی۔

گیارہ بجے چچی نے اسے جگایا تھا بابا کو ہاسپٹل لے کر جا رہے تھے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ صبح بخار بھی ٹھیک تھا اب ہاسپٹل کیوں۔ وہ ننگے پیر باہر گئی تھی اس کے بابا بے ہوش تھے۔ چچا تایا ولید ایاز مل کر بابا کو پکڑے کار میں بٹھا رہے تھے۔ ولید بھاگ کر ساتھ والے گھر گیا اور فوراً ہی واپس آیا تھا۔

"بھائی ابھی بھی گھر نہیں ہیں۔" وہ پریشانی سے اپنے باپ کو بتا رہا تھا۔ سارہ سن ہی سب دیکھ رہی تھی۔ اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی اپنے باپ کے پاس جانے کی۔ ابھی صبح تو وہ اسے بلا رہے تھے اب کیوں نہیں بلا رہے۔ وہ وہیں اپنے کمرے کے دروازے میں بیٹھتی گئی۔ اندر سے آواز آئی تھی کانوں پر ہاتھ رکھ لو آواز نہیں آئے گی۔۔۔ لیکن اس کے بابا کو تو عزیز کی آواز چاہیے تھی۔ وہ اٹھ کر فون تک گئی تھی۔ فون پکڑ کر اس نے دوبارہ اس کا نمبر ملایا تھا۔ فون بند تھا۔ فون کو بیڈ پر پھینکتے وہ زمین پر بیٹھ گئی تھی۔

"اللہ تعالیٰ ساری آزمائشیں منظور بس یہ نہیں۔ بس بابا کو کچھ نہ ہو" زبان سے دعا نکل رہی تھی۔ دعا جو کہتے ہیں عرش تک پہنچتی ہے۔ دعا جس سے نصیب بدلتے ہیں۔ سرد ہسپتال میں عصر کے وقت سجاد کو ہوش آیا تھا۔ سارہ بے چینی سے آگے بڑھی اور اس کے باپ نے ایک ہی سوال پوچھا تھا۔ "عزیز؟" وہ یک ٹک اپنے باپ کو دیکھتی رہی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"میں نے کہیں یتیم کو ناراض تو نہیں کر دیا؟ اگر میں نے یتیم کے ساتھ زیادتی کر دی میرا اللہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا سارہ۔" سارہ کے آنکھوں سے آنسو قطار کی صورت بہنا شروع ہوئے تھے۔

"عزیز میرے بیٹے سے بڑھ کر ہے۔ اس نے کبھی میری کسی بات سے نہ نہیں کی دیکھو ابھی بھی میں نے کہا سارہ سے شادی کر لو اس نے کہا جو آپ کا حکم بابا۔ میں نے اس سے بچپن میں کہا تھا تمہیں بھی خرم کی طرح بورڈنگ جانا ہے۔ اس نے کہا جو مرضی مانگ لیں بس اپنے سے دور نہ بھیجیں۔" ان کی آنکھوں میں عزیز کے لیے محبت ہی محبت تھی۔ سارہ کو کبھی اس محبت سے نفرت نہیں ہوئی تھی۔ آج بھی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے ــــ باپ کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"میں نے اسے کہا اس ملک میں کچھ نہیں باہر چلے جاؤ۔ اس نے کہا نہیں آپ سے دور نہیں۔ اگر میں اس سے کہوں جان دے دو تو وہ سوچے گا بھی نہیں۔ وہ میرا عزیز ہے۔" ان کی باتوں میں صرف عزیز کا ذکر تھا۔ وہاں کھڑا ہر فرد انہیں سن رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہو جاؤں گا مجھے پتا ہے پر اسے بلا کر لے آؤ۔" نیند میں جانے سے پہلے انہوں نے بس یہی کہا تھا۔ سارہ کو اپنا آپ فضول لگا۔ خرم ہوتا تو شاید وہ ہسپتال کو ہی آگ لگا دیتا۔

عشا تک بابا گھر آ گئے تھے۔ ان کے کمرے میں دیر تک سب بیٹھے رہے تا کہ ان کا دھیان بٹا رہے۔

"اسد بھائی کے گھر ہیں عزیز بھائی۔ کل خود جا کر لے کے آؤں گا بابا۔ آپ بے فکر رہیں۔ بلکہ اپنی چپل تیار رکھیں۔" ولید اور ایاز کو آخر کار اس کا پتا مل گیا تھا۔ تائی نے تو شکرانے کے نفل تک پڑھے۔ بابا کی آنکھوں میں سکون ہی سکون تھا۔ گیارہ بجے کے قریب سب اپنے کمروں میں چلے گئے۔ سارہ بابا کے کمرے میں ہی سوئی تھی۔ رات کا کون سا پہر تھا معلوم نہیں جب ایاز کی آواز سارہ کے کانوں میں آئی تھی۔ "بابا...... بابا" وہ نبض چیک کرتا زمین پر بیٹھا انہیں آواز دے رہا تھا۔ پھر وہ زور زور سے ولید، تایا کو آوازیں دینے لگا۔ سارہ پریشانی سے بیڈ کے قریب آئی۔ اس کے باپ کی آنکھیں بند تھیں۔ ہر ایک چیز سلو موشن میں چل رہی تھی۔ آہستہ آہستہ۔ کوئی ڈاکٹر کو فون کر رہا تھا، ایمبولینس منگوا رہا تھا، کوئی

روز رہا تھا۔ کوئی اسے اٹھا رہا تھا۔ وقت چل رہا تھا یا تھم گیا تھا معلوم نہیں۔

ساری زندگی پہلی دعا ایک ہی ہوتی ہے کہ والدین کو صحت کے ساتھ عمر دراز دینا پھر معلوم نہیں اللہ کی کیا مصلحت ہوتی ہے کہ وہ چھن جاتے ہیں۔ اولاد کو ہر آزمائش قبول ہوتی ہے بس والدین کا سایہ قائم رہے۔ ان کے چھوڑ جانے پر یقین نہیں آتا۔ بس یقین نہیں آتا۔ غم کے پانچ مراحل ہیں اور اولاد اس کے پہلے مرحلے پر ہی آدھی زندگی گزار دیتی ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا ہے۔

سارہ کے لیے وقت رک گیا تھا۔ اس کا باپ سفید کپڑوں میں لایا گیا تھا۔ اسے اپنے باپ پر ساری عمر سفید لباس ہی اچھا لگا تھا۔ کلف شدہ۔ وہ انہیں دیکھتی رہی۔ کوئی اسے کہہ رہا تھا کہ رولو۔ اس سے کہا نہیں گیا کیسے رولوں بابا تو سفید لباس میں ہمیشہ کی طرح اچھے لگ رہے ہیں ان کے سامنے کیسے رولوں؟ یہ ابھی تو جاگ جائیں گے۔ ابھی آواز دیں گے۔

اس نے دروازے میں دیکھا عزیز کھڑا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑا سامنے دیکھ رہا تھا ساتھ کچھ بول رہا تھا شاید ایسے کیسے ہوسکتا ہے؟ پھر وہ وہیں بیٹھتا چلا گیا۔ کوئی اسے اٹھا رہا تھا پاس لا رہا تھا مگر وہ آج پھر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر رونا چاہتا تھا۔

دِل خستہ جو لہو ہو گیا، تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
بھو سوزِ سینہ سے داغ تھا، بھو دردِ غم سے نگار تھا

''بابا۔ آپ بھی امی ابو کی طرح واپس نہیں آئیں گے؟ ایسا نہ کریں پلیز۔ ایسا نہ کریں۔'' وہ ان کی چارپائی سے سر لگاتا بس یہی بول رہا تھا۔ سارہ نے غائب دماغی سے اسے دیکھا تھا۔ اسے ماتھے پر واضح چوٹ کا نشان نظر آیا تھا۔

وہ بعد میں سارہ کے پاس گیا تھا وہ دوست تھے وہ اپنا غم بانٹ سکتے تھے لیکن اس نے دروازہ اس کے منہ پر بند کیا تھا۔ وہ اس شخص کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی بات تو دور کی بات ہے۔

ٹھاہ کی آواز آئی تو وہ دونوں واپس حال میں آئے۔ عزیز آنکھیں صاف کرتا کچن کی طرف دوڑا تھا۔ جہاں ساس پین کو نکلہ ہو کر نیچے گر گیا تھا۔ سارہ بھی اس کے پیچھے آئی۔

''تمہاری وجہ سے میری چائے جل گئی ہے۔'' گیلی آواز میں کہتے عزیز نے افسوس سے اپنے ساس پین کو دیکھا۔ اتنا کالا ساس پین دھوئے گا کون۔

''اس میں میری غلطی ہے؟ تم ایسا کرو یہ ساس پین میرے سر پر مار دو۔'' وہ کاٹ کھانے والے انداز میں بولی تھی۔

''میری بات سنو۔ تم نے میرے خاندان کو برا بھلا کہا تو وہ ٹھیک کیونکہ اس وقت مجبوری تھی۔۔۔ اور میں نے نکاح رکوانے کے لیے جو بولا تم اس کے لیے مجھے معاف نہیں کر سکیں ابھی تک؟'' ایک ہاتھ میں ساس پین پکڑے وہ لڑاکا عورتوں کی طرح بولا تھا۔

''میرے بھی وہ باپ تھے یار۔ ہم نے دو سال گزار دیے ہیں۔ بدگمانیوں میں۔ الزام لگاتے لگاتے۔ گلٹ میں رہتے رہتے۔۔۔ تم چاہتی ہو میں تم سے معافی مانگوں؟ میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں تمہارے سامنے یہ بدگمانیوں کی دیوار کو آگ لگا دو۔'' ساس پین ماتھے تک لے جاتے شاید وہ ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ ابھی وہ کچھ اور بولتا ساتھ والے گھر سے آواز آئی تھی۔

''عزیز بھائی باقی تقریر کل۔ یار آپ لوگوں کی صلح ہو نہ ہو ہمیں ڈینگی ہو جائے گا۔ گھر آجاؤ سارہ ورنہ ڈنڈے الگ پڑیں گے۔'' ان تینوں کی دہائیوں کی آواز سے چڑیا بھی اڑ گئی تھی۔ اتنے کان لگانے کے باوجود آواز تو صحیح آ نہیں رہی تھی مچھروں نے الگ اودھم مچا رکھا تھا۔ ''تو تم لوگوں کو کس نے کہا ہے کان لگا کر دوسروں کی بات سنو۔ کس دن بڑے ہو گے تم لوگ۔'' وہ ایک ہاتھ میں ساس پین پکڑے باہر آکر چیخ کر بولا تھا۔ دوسری طرف دوبارہ ٹھاہ کی آواز آئی تھی۔ اب کے اس کی آنکھیں مزید پھیلیں۔ جس کرسی پر اس نے کپڑے رکھے تھے وہ سارہ میڈم

پاؤں مار کر الٹا کر اپنے گھر روانہ ہوئی تھیں۔
''اللہ پوچھے گا تمہیں۔ ایک تو میری چائے جلا دی۔'' وہ جلدی جلدی اپنے کپڑے اٹھانے لگا۔ ساتھ والے گھر کو اپنا گھر نہ کہتا تو وہ بتاتا اس سارہ کو۔ اس کی بڑبڑاہٹ درودیوار نے ساری رات سنی تھی۔ کاش ان کے کانوں کے ساتھ زبان بھی ہوتی تو لازمی آج رات عزیز کو ایک دو تسلی کے بول ہی بول دیتیں۔

☆☆☆

اگلا دن سارہ کو صبح ہی دو پیغامات موصول ہوئے۔ ایک انعم نے یونیورسٹی جانے سے پہلے میسج کیا تھا کہ وہ کل والے جھوٹ پر ذرا شرمندہ نہیں۔
دوسرا پڑوسی کا آڈیو میسج تھا۔ ''میری چائے تم پر ادھار ہے۔ خون معاف کر دوں گا اپنا جلا ہوا ساس پین اور چائے نہیں۔'' سارہ نے منہ بناتے کئی دفعہ اس کا آڈیو سنا تھا۔ پھر فون ہی بند کر دیا۔ آج کوئی مہمان آنے تھے شاید جن کی خاطر چچی اور تائی دوپہر کا کھانا بنا رہی تھیں۔ آج کام والی بھی چھٹی پر تھی تو اس نے بھی تھوڑی شرم کھائی اور کچن میں چلی گئی۔ چچی نے تو سارے کام روک کر اس شاہ سواری کو دیکھا تھا جس سے رات کے برتن دھلوا لو لیکن دوپہر کے وقت اس کے فرشتے بھی کچن میں نہ جائیں۔ چلو خیر اب آگئی ہے تو چچی نے بھی اس کی نظر اتارتے سلاد کا سارا سامان اس کے آگے رکھ دیا۔
''کچھ اور بھی کام دے دیں یہ تو میں پانچ منٹ میں بنا دوں گی۔'' کافی دنوں بعد کچن میں آنا ہوا تھا اس لیے کھیرا کاٹتے پرجوش سی بولی۔
''سارہ تم بس یہی رائتہ سلاد بنا لو۔ اسی پر میں شکرانے کے نفل پڑھ لوں گی۔'' چچی نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ سارہ اور تائی دونوں ہنس پڑیں۔
''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا؟'' تائی فکرمندی سے پوچھ رہی تھیں۔
''آپ لوگ ایسے کریں گے تو میں چلی جاؤں گی' ان دونوں کو ہنستے ہوئے وارن کیا۔ پھر وہ آخر تک ان دونوں کے ساتھ کام کرواتی رہی تھی۔ کام کرنے کا اپنا مزا ہے۔ لیکن شرط ایک ہی ہے کام مہینے میں ایک دفعہ ہی کرنا ہو۔ اس نے پانچ منٹ کے بجائے آدھے گھنٹے میں سلاد رائتہ بنایا تھا۔ ایک تو جو لوگ کبھی کبھی کچن کا رخ کرتے ہیں وہ ہر چیز پر اتنا ہی وقت لگاتے ہیں۔ ساری چیزیں بننے تک ایاز، ولید اور انعم بھی یونیورسٹی سے آگئے تھے۔
''امی اور چچی! آپ دونوں کے علاوہ یہاں تیسرا کون ہے بھلا؟ میری آنکھیں۔ اللہ'' ولید اپنی آنکھیں بند کرتا کھولتا اسے دیکھ رہا تھا۔ ایاز تایا کے کمرے سے آیا تھا ان سب کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ سارہ بھی ان کے پیچھے چلی گئی اسے فریج سے سامان لینا تھا۔
''پتا ہے کون آرہے ہیں۔'' اس کی رازدارانہ سرگوشی پر اس نے بھی ان تینوں کو دیکھا۔ ''کون؟'' انعم تجسس سی مزید آگے ہوئی۔
''عزیز بھائی کے گھر والے۔'' یہ کہنے کے ساتھ ان تینوں نے ایک ساتھ سارہ کو دیکھا تھا۔ جو ٹھنڈے پانی کی بوتل پکڑے کھڑی تھی۔ سب کی شکی نگاہیں دیکھ کر اس کا منہ کھلا۔
''مجھے کیوں ایسے دیکھ رہے ہو؟ میں نے بلایا ہے کیا انہیں؟'' وہ ہٹپٹا کر بولی تھی۔ وہ تینوں ایک ساتھ آگے آئے۔ ''آپ کو پتا تھا اسی لیے صبح سے کچن میں لگی ہوئی ہیں؟'' انعم دور کی کوڑی لائی۔
''کیا بدتمیزی ہے انعم'' وہ غصے سے دو قدم پیچھے ہٹی۔ وہ تینوں ہنستے اسے دیکھ رہے تھے۔
''تم لوگ...... حد ہوگئی۔'' پانی کی بوتل ان کی طرف کرتے وہ چیخی تھی۔
''کتنے فضول ہو تم تینوں۔'' وہ غصے سے سر ہلاتی اپنے کمرے میں ہی چلی گئی۔
کچھ دیر بعد مہمان آگئے۔ اس کے ساتھ وہ چاروں سارہ کے کمرے میں کیونکہ مسئلہ تو اب کھلا تھا کہ عزیز کو بتایا نہیں گیا تھا کہ یہ سب آرہے ہیں۔
''بھائی تو ہنگامہ کریں گے۔'' ان چاروں کی

متفقہ رائے یہی تھی۔ چچی کے بلانے پر وہ دونوں جا کر ایک ساتھ انہیں سلام بھی کر آئی تھیں۔ ایک انکل تھے اور تین عورتیں۔ شکل سے ہی تینوں چالاک لگتے تھے۔ گہرے چمکتے بھڑکتے کپڑے زیب تن کیے وہ اپنے آپ میں کوئی اعلیٰ ارفع مخلوق بنے بیٹھے تھے۔ عورتوں نے پہلے انعم کو گھورا پھر ایک دوسرے سے کھسر پھسر کرنے کے بعد وہ سارہ کا جائزہ لینے لگیں۔ کچھ لوگوں کی نظریں ہوتی ہیں ایکسرے کرتی جن سے عجیب سی الجھن ہوتی ہے۔ سارہ کے سارے جسم سے وہ الجھن لپٹ گئی تھی۔ وہ سلام کر کے فوراً کمرے سے باہر جانے لگی۔ لیکن اپنے پیچھے اس نے آواز ضرور سنی تھی۔

''یہ اپنے عزیز جتنی ہی ہو گی ہاں نا سویرا؟''

عزیز کی کوئی چچی یا تائی آپس میں گفتگو کر رہی تھیں۔ باقی افراد خانہ نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ وہ دور جانے کے بجائے وہی دیوار کے ساتھ کھڑی رہی۔ باقی تینوں بھی اس کے ساتھ کھڑے ہو گئے، گرمی تھی کہ جسم جھلسا رہی تھی پر معلوم نہیں دل کیوں ہوا کی لے پر دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں الگ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

''پتا ہے مجھے کیا لگتا ہے؟'' ولید کے کہنے پر باقیوں نے اسے دیکھا۔

''یہ عزیز بھائی کا رشتہ وشتہ لینے آئے ہیں۔''

ولید کی بات مکمل کرنے پر سارے ہاتھ اس کے اوپر لعنت ملامت کے لیے اٹھے تھے وہ کندھے اچکا کے رہ گیا۔ لیکن اندر سے آتی آواز پر وہ چاروں ساکت ہوئے تھے۔

''تو بھائی ہم آپ سے سیدھی اور صاف لفظوں میں بات کریں گے۔ پہلے تو آپ نے ہم سے جھوٹ بولا کہ گھر میرے بھائی کا نہیں ہے۔ اس پر تو آپ پر کیس کرنے کا دل چاہتا ہے میرا۔'' عزیز کے چچا تھے وہ جو اپنی بات صاف اور کھری سنا رہے تھے۔ تایا نے فون سے نظر ہٹا کر ایک ابرو اٹھا کر اس بندے کو دیکھا۔

''پھر منصور صاحب آپ غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ یہ میرا گھر ہے کچہری نہیں۔'' ٹھنڈے لہجے میں کہتے تایا دوبارہ فون پر لگ گئے تھے۔

''چلو خیر اس بات کو تو زمانہ گزر گیا پر اب اپنا بیٹا ہمیں واپس چاہیے۔'' ان میں سے ایک عورت بات سنبھالتے بولی۔

''اچھا وہ ستائیس سال کا نوجوان آپ کو چاہیے؟'' تائی نے طنزاً کہا۔

''ہاں جی'' واہ کیا اسٹائل تھا۔ باہر کھڑے چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''ماشاء اللہ سے میری بیٹی ہے۔ ایف اے پاس۔ اس کی شادی کروں گی عزیز سے۔ ہم نے سوچا آپ لوگوں نے پالا پوسا ہے اسے تو آپ لوگوں کو بتا دیں۔۔ اب میری بیٹی کی شادی ہو گی اس سے اور اپنے خاندان کے ساتھ رہے گا۔''

دوسری عورت فخریہ بتا رہی تھی۔ باہر کھڑے نفوس نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ان تینوں کی ہنسی بے قابو تھی، بس سارہ تھی جو کھڑی تھی۔ اسے اپنی قسمت پر یقین ہی نہیں تھا۔ سب کو جو بات فضول لگ رہی تھی اس سے کوئی پوچھتا تو وہ کہتی ہاں ایسا ہو سکتا ہے کہ عزیز کسی اور کا ہو جائے۔ اس دنیا میں سب ہو سکتا ہے۔

ان تینوں کی ہنسی کو بریک لگی کیونکہ سامنے سے عزیز آ رہا تھا۔ ٹائی ڈھیلی کرتا وہ ان کی پلٹن کو دیوار کے ساتھ لگا دیکھ کر دل کھول کر ہنسا تھا۔ عصر کا وقت تھا اور اس کی آنکھیں اتنی چمک دار تھیں کہ سارہ کو زندگی میں پہلی دفعہ ان آنکھوں کے غائب ہونے سے خوف آیا۔

وہ نفی میں گردن ہلاتا ہنستے ہوئے ان کے پاس آیا تھا۔ ''کوئی حال ہے تم لوگوں کا؟ اندر مہمانوں کی باتیں سن رہے ہو۔ انتہائی غیر اخلاقی حرکت۔'' ایاز کے سر پر ہلکا سا لیپ ٹاپ بیگ مارتے وہ ہنستے ہوئے بولا تھا۔

''آیا کون ہے؟'' سوال پوچھتے اس نے سارہ

کی طرف دیکھا تھا اس کی آنکھوں میں خوف تھا، نمی تھی۔ اس نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کیا ہوا ہے؟ سارہ سے کچھ نہیں بولا گیا وہ بس اس انسان کو دیکھتی رہی جو اسے ساری زندگی اپنے پاس چاہیے تھا۔

تایا اسے اندر بلا رہے تھے۔ وہ اندر جانے لگا تو سارہ نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ عزیز نے پریشانی سے اسے دیکھا وہ نفی میں گردن ہلاتی اسے روک رہی تھی۔

"کون آیا ہے اندر؟" عزیز نے بغیر ملے ان تینوں سے پوچھا تھا۔

"کچھ لوگ ہیں جو آپ کو لینے آئے ہیں تاکہ اپنی شبانہ سے آپ کی شادی کروا کے آپ کی قسمت کھولیں۔" ولید آگے ہو کر آہستہ آواز میں بتا رہا تھا۔ عزیز کا چہرہ سرخ ہوا۔ ماتھے پر بل پڑے۔ ساتھ یاد بھی آیا کہ کل ہی وہ اس منصور نامی شخص سے اپنی کمپنی میں ملا تھا۔ جس نے عزیز کا پورا نام اور تایا کا نام سننے کے بعد اسے بتایا تھا کہ وہ اس کا چچا ہے اور اسے کتنی محبت ہے عزیز سے۔ بس یہ اکبر (تایا) نامی بلا نے جدا کر دیا عزیز سے سب کو۔ عزیز نے اسے صاف بتایا تھا کہ وہ انہیں نہیں جانتا اور آئندہ کے بعد اس کے ابو کے بارے میں ایک بھی بات منہ سے نکالی تو اس منہ سے واپس قطعاً نہیں جائیں گے۔

اب وہ اندر بیٹھے تھے۔ صرف بیٹھے نہیں تھے اپنی بیٹی کا رشتہ بھی لے کر آئے تھے۔ عزیز کو اندر بیٹھے لوگوں سے زیادہ اس خوف میں مبتلا لڑکی پر غصہ آیا تھا۔ اپنا ہاتھ چھڑواتا وہ اندر بڑھ گیا تھا۔ "ہائے میرا عزیز۔ کتنا یاد کیا ہم نے تجھے۔" وہ تینوں عورتیں ایک ساتھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"ہمارا عزیز! بھابی دیکھو تو علی جیسا ہے بالکل کتنا پیارا ہے۔" پھپھو اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ تائی کو تو سمجھو آگ ہی لگ گئی۔ چچی نے موبائل کا کیمرہ نکالتے فوراً سب کی ویڈیو بنائی۔

"بھئی جنید بھی گھر کا حصہ ہے اس کا بھی حق ہے گھر کی ایک ایک چیز پر۔" "کیسا ظلم کیا تم لوگوں نے۔ ہمارا بچہ ہم سے چھین لیا۔ ہمارے علی کا بیٹا۔ ہمارا سوہنا بیٹا۔" اب شاید وہ چچی تھیں جو واویلا کر رہی تھیں۔ "بس بیٹا۔ اب چلو سامان پیک کرو۔ اپنے گھر چلو" وہ خاتون جو اپنی بیٹی کا رشتہ لائی تھیں محبت سے کہہ رہی تھیں۔ دل میں اپنے آپ کو کوس بھی رہی تھیں کاش جلد بازی میں اپنا نقصان نہ کیا ہوتا۔ اب لڑکا بھی ہاتھ میں ہوتا گھر بھی اور اس کی جائیداد کا حصہ بھی۔ "ہاں عزیز بیٹے۔ بڑا ظلم کیا ان لوگوں نے ہم پر۔ تم سے جدا کر دیا۔ پر اب چلو گھر چلیں۔" اس کے چچا بھی شیریں لہجے میں بولا۔ عزیز ان کے جھرمٹ سے نکل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی۔ وہ تینوں عورتیں اور مرد اسے دیکھنے لگے۔ "بیٹھیں آپ لوگ بھی۔" انتہائی ادب سے انہیں بیٹھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اگر اندر بیٹھے اور باہر کھڑے لوگوں کو لگتا تھا وہ چیخے گا چلائے گا تو وہ غلط تھے اس کی تربیت اس گھر میں ہوئی تھی جس گھر میں ہر فرد کی بہترین تربیت نظر آتی ہے۔

"آپ فکر نہ کریں۔۔ پہلے میرا ارادہ نہیں تھا لیکن آپ لوگ اتنے اصرار سے بلا رہے ہیں تو مجھے آنا ہی پڑے گا اپنے گھر۔"

باقی سب تو آرام سے بیٹھے تھے بس باہر کھڑی سارہ کا ہی خون نچڑ گیا تھا۔ تایا نے ایک دفعہ بھی فون سے نظر نہیں ہٹائی تھی۔ تائی پرسکون سی بیٹھی تھیں اور چچی وہ تو آپ سب کو پتا ہے فون پر کیا کر رہی ہیں۔

"ہائے شکر اللہ کا۔ دیکھا علی جیسا صاف دل ہے اپنے عزیز کا۔ شبانہ سے شادی کے لیے بھی فوراً مان جائے گا اپنا عزیز۔" پھپھو واری صدقے جا رہی تھیں۔

"جی..... چچا جان آپ میرے والد کا حصہ تیار رکھیں۔ میرا وکیل آپ سے جلد مل لے گا میرے گھر میں۔" ان چاروں کا منہ اور آنکھیں دونوں کھل گئیں۔

"اور آپ لوگ بے فکر رہیں اتنے اصرار سے

آپ لوگ بلا رہے ہیں تو میں بھی وکیل کے ساتھ آؤں گا اپنے باپ کی جائیداد لینے۔ دو پلاٹس ہیں میرے باپ کے وراثت میں۔ ساتھ گھر میں حصہ۔ باقی چچا جان آپ بڑے ہیں آپ کو زیادہ معلوم ہوگا۔" آنکھیں ان سب پر جماتے وہ آخری لائن سینے پر ہاتھ رکھے بولا تھا۔

"اب کون سا حصہ" چچا کا تو خون ابلنے لگا۔

"میرے باپ کا حصہ۔" ایک ایک لفظ چبا کر کہتا وہ صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔

"تمہارے باپ کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ بڑے آئے حصہ لینے۔" وہ انکل کھڑے ہو کر اونچا بولے۔

"اچھا" اس نے بھنویں اٹھا کر بس اتنا ہی کہا۔

"منصور آرام سے بیٹھو...... بچہ ہے۔ تم سکون سے بیٹھو۔" بڑی خاتون دوسری دفعہ جلد بازی میں سب خراب نہیں کر سکتی تھی۔ جائیداد تو بعد کی بات ہے بس اپنی شبانہ کے لیے انہیں یہ لڑکا پسند آ گیا تھا۔ کیسا حسین تھا، بڑا افسر، خوب صورت۔ زبان کا کڑوا لگ رہا ہے مگر چلو شبانہ کی زبان سے کون سے پھول جھڑتے ہیں۔ انہوں نے سیکنڈ میں ساری جمع تفریق کر لی۔

"بیٹے سب لے لینا آپ۔۔ آپ کا ہی ہے سب۔" باقی آنٹیوں اور انکل کا خون جل گیا۔

"اچھا" عزیز دوبارہ بس اتنا ہی بولا تھا۔ پر ہونٹوں کے کناروں پر ہنسی دبی تھی۔

"بس بہن آپ نے بیٹا بنا کر پالا ہے آپ ہاں کریں۔ آج ہی منگنی کر لیتے ہیں۔۔ عزیز بیٹے میری شبانہ لاکھوں میں ایک ہے۔" تائی تو سیدھی ہو کر بیٹھیں اور اس عورت کی پھرتی پر ہیں ہیں کر کے رہ گئیں۔ "جی ہمیں کوئی اعتراض نہیں آپ کی شبانہ لاکھوں میں ایک ہوگی لیکن کیا آپ میری بیوی سے نہیں ملیں۔" تائی کے کہنے سے پہلے وہ خود بولا تھا۔ باہر کھڑے تینوں نے "اووووو" کی آواز نکالی اور تائی نے سارہ کو آواز دی۔

"سارہ بیٹے! مہمانوں سے ملو۔ تمہاری چچی ساس اور تائی ساس ہیں۔" تائی کی آواز میں ہنسی کی آمیزش تھی۔ مہمانوں کی ساری خوش اخلاقی ہوا ہوئی۔ لڑکا رہا نہ گھر۔ اوپر سے جائیداد میں حصہ بھی مانگ رہا ہے۔ "یہ آپ لوگوں نے زیادتی کی ہے۔ بیٹے کیسے زبردستی سے شادی کروادی اس لڑکی سے تمہاری۔ ہے ہی کیا اس میں۔" سارہ کو دیکھتے وہ عورت کھڑی ہوئی تھی۔ ہائے ان کی شبانہ۔ سارہ نے اپنے آپ کو ہی اوپر سے نیچے تک دیکھا ان کی شبانہ سے تو ڈیڑھ لاکھ گنا اچھی ہوں گی۔۔ ہاں نہیں تو۔ "ہے تو کچھ نہیں" وہ آہستہ سے بولا تھا۔ نگاہ اس طرف اٹھی وہ نمکین پانیوں سا حسن تھی، بہتے چشمے جیسی جس کے آگے اور پیچھے اتنے خوبصورت پہاڑی سلسلے ہوں کہ نگاہ نہ ہٹ سکے۔ عزیز کس کس کو کیا کیا بتاتا کہ سامنے کھڑی لڑکی میں کیا تھا۔ وہ کہاں کہاں سے تشبیہات ڈھونڈ کر لاتا۔

دوسری طرف سارہ نے ابرو اٹھائی اور گردن موڑ کر اسے دیکھا اس کی تو۔ "میری پسند کی شادی ہے تائی جان۔" اب کی دفعہ "اووو" کافی بلند تھا۔ وہ مہمان کچھ اونچا اونچا بولتے جا رہے تھے۔ "حصہ تو ایسا دیں گے یاد رکھو گے تم سب۔ بے عزتی کر دی وغیرہ وغیرہ۔"

"پیار اندھا ہی ہوتا ہے۔" وہ مزید آہستہ آواز میں بولا تھا۔ "اصل میں دل آئے گدھی پر تو پری کیا چیز ہے۔" وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔ سارہ نے مڑ کر پوری آنکھیں کھول کر ماتھے پر ڈھیروں بل لا کر اسے ایک نظر نوازی تھی۔ "تم اپنا بوریا بستر سمیٹ کر ان کے ساتھ چلے کیوں نہیں جاتے؟ شبانہ پری ایف اے پاس ہے۔ کافی بہترین پروپوزل ہے۔" اسے طعنہ مارتی وہ کمرے سے باہر نکلی تھی جہاں سب کھڑے تھے۔ مسکراہٹ کا راستہ اس نے نہیں روکا تھا۔

تایا آرڈر دے رہے تھے کہ کھانا لگا دو آج سب گھر والوں کی دعوت ہے۔

"ہاں ابو۔ اپنے سسرال والوں کے لیے سارہ نے خود کچن کو شرف بخشا تھا۔" تایا نے ایاز کی بات پر قہقہہ لگایا۔ "واقعی" وہ مسکرا کر پوچھ رہے تھے۔

"اور کیا تایا۔ ہم سب کو منی ہارٹ اٹیک آ گیا۔ کھانا کھانے سے پہلے چاہیے کہ ہم سب پہلے کسی جانور پر تجربہ کر لیں۔ آخر سارہ کے ہاتھ لگے ہیں۔" ان سب کی آوازیں مدھم ہو رہی تھیں۔

"ہاں ولید تم پر تجربہ کر لیتے ہیں۔" کوئی کہہ رہا تھا۔

"ہم نے تو کھانا بنایا کہ مہمان ہیں۔ لیکن ان کی باتوں سے تو دل ہی سڑ گیا۔" تائی اور چچی بھی آپس میں بات کر رہی تھیں۔ عزیز نے اپنے خاندان کو دیکھا وہ سب مطمئن تھے خوش تھے۔ ان سب کے ساتھ چلتی سارہ نے مڑ کر پیچھے دیکھا تھا جہاں وہ کھڑا تھا مسکراتے ہوئے سارے جگنو اپنے قبضے میں کیے۔ کسی نے کہا ہے تو سچ ہی کہا ہے پیچھے مڑ کر نہ دیکھو پتھر کے ہو جاؤ گے۔

☆☆☆

عزیز کھانے کے بعد اپنے گھر چلا گیا۔ کھانے کے بعد اس نے بہت کوشش کی کہ آنکھ نہ لگے مگر ایسا ہو سکتا ہے کیا؟ غلط وقت پر سونے کا اپنا ہی مزا اور سر درد کا الگ ہی درد ہے۔ باہر عشاء کی اذانیں ہو رہی تھیں جب اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ایک جست میں اٹھا تھا مغرب کی نماز نکل گئی۔ اپنے آپ کو کوستے وہ مسجد بھاگا۔ واپس گھر آتے اس نے گہرا سانس لیا تھا اس کے گھر کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کل ہی دس میں سے نو چابیاں تو واپس لے کر آتا ہوں کا پورا ارادہ کرتے وہ گھر کا دروازہ بجانے لگا۔ کھولنے والی سارہ تھی۔ "اب کون سی جنگ باقی ہے؟" اس کی شکل دیکھتے سب سے پہلا سوال یہی منہ سے نکلا تھا۔

"تمہاری چائے والا ادھار اتارنے آئی ہوں۔" وہ یہ کہتے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ عزیز اندر آ کر سب سے پہلے اپنے کمرے میں گیا تھا وہ ویسا ہی پھیلا ہوا تھا۔

"اب میرا اتنا دماغ خراب نہیں ہوا کہ تمہارا کمرا بھی صاف کروں۔ کچن صاف کر دیا ہے یہی بڑی بات ہے۔" وہ احسان جتاتے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"کچن صاف ستھرا تھا۔ چار برتن تھے بس، وہ بھی خود دھو لیتا۔" برآمدے میں رکھے فریج سے پانی کی بوتل نکالتے اس نے جل کر کہا۔ "احسان کرنا تھا تو بڑا کرتیں۔"

"دھو دیے نا اب" سارہ کچن کے دروازے میں آ کر کھڑی ہوئی۔ "اچھا ٹھیک ہے۔" اس سے پہلے دوبارہ جنگ شروع ہوتی اس نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ "باقی تینوں آج بھی دیوار کے ساتھ کھڑے ہیں کیا؟" برآمدا صحن سے دو سیڑھی اوپر تھا۔ لیکن یہ ناممکن تھا کہ ساتھ والے گھر میں چھلانگ مار کے دیکھا جا سکے۔ اس نے پھر بھی ناممکن سی کوشش کی۔

"نہیں وہ تینوں تائی کے سونے کا فائدہ اٹھا کر کیک بنا رہے ہیں۔" اس نے کچن میں جا کر چائے کے لیے کپ نکالے۔ کسی زمانے میں یہ کپ سارہ نے ہی اسے تحفہ میں دیے تھے۔ عزیز برآمدے میں پلر کے ساتھ ٹیک لگائے سیڑھی پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھ گیا۔ دونوں کے مابین خاموشی رہی۔ سارہ نے کپ زمین پر رکھے اور خود بھی بیٹھ گئی۔ برآمدے کے پیچھے کمرے تھے ایک کچن تھا اور آگے کھلا صحن جس میں ایک ڈھیٹ بوگن ویلیاں کی بیل تھی جس کو بارش کے علاوہ عزیز نے تو کبھی پانی دینے کی زحمت نہیں کی تھی۔ سارہ نے بیل سے دھیان ہٹا کر پاؤں سیڑھیوں پر رکھ لیے۔ ان کے درمیان چائے کے دو مگ پڑے تھے۔ کچھ دیر بعد اس کی آواز سماعت تک پہنچی تھی۔ جس کا منتظر عزیز تھا۔ جس کی منتظر خود سارہ بھی تھی۔ "تمہیں پتا ہے باپ کے جانے کے بعد کیسا محسوس ہوتا ہے؟"

اسے سب معلوم تھا پھر بھی کچھ بولنے کے بجائے نہ میں گردن ہلائی۔ آج وہ استاد نہیں بننا چاہتا تھا۔ "ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ ساری دنیا میں تنہا

رہ گئے ہوں، کبھی بھی کوئی بھی آپ کو کچھ بھی کہہ سکتا ہے، کبھی بھی کہیں سے بھی آپ نکالے جا سکتے ہو۔ آپ لوگوں کے چہروں کی طرف دیکھتے ہو کہ کب کون بدلتا ہے۔ کب سارے رشتے مختلف رنگ دیکھائیں گے۔" اس کی آنکھوں سے گرم سیال بہہ رہا تھا۔ عزیز نے تکلیف سے گہرا سانس لیا۔ "جیسے جیسے وقت گزرتا ہے لوگ آگے بڑھ جاتے ہیں اور ہم وقت گزرنے کے ساتھ وہیں پیچھے آوازوں پر کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ آواز نہیں آتی، انسان نظر نہیں آتا۔

کسی کو اس گفتگو میں دلچسپی نہیں ہوتی کہ آپ کے والد کیسے تھے، انہوں نے کیسی زندگی گزاری، آپ سے کتنی محبت کی، وہ کون تھے۔

زندگی اتنی مشکل ہو جاتی ہے عزیز۔ یقین نہیں آتا وہ شخص دنیا میں نہیں رہا جو ہر ایک کو فخر سے بتاتا تھا کہ یہ میری بیٹی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ اب کرہ ارض پر ان کی آواز نہیں آئے گی۔ وہ اب بھی آواز نہیں دیں گے۔" ایک آہ تھی جو دونوں کے لبوں سے آزاد ہوئی تھی۔ وہ سب کسے بتا رہی تھی جو سب جانتا تھا۔

"کیسے صحت مانگتے مانگتے ان کے لیے جنت مانگیں۔" وہ گھٹنوں پر سر رکھے زار زار رو رہی تھی۔ کتنی بڑی نعمت ہیں یہ آنسو یہ نہ ہوں تو انسان غم سے فنا ہو جائے۔ عزیز نے ٹانگیں سینے سے لگائے ان پر سر رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ کافی دیر وہ ایسے ہی روتی رہی۔ عزیز جیسے انسان کا ساتھ ملنا غنیمت ہوتا ہے۔

"ایک جنریشن گیپ ہے جو مجھے ہر وقت محسوس ہوتا ہے۔ میں کسی کے ساتھ بھی ایزی نہیں ہو پاتی۔ آرام سے اپنی بات نہیں کہہ پاتی مجھے لگتا ہے مجھے کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ اور تم جو سمجھ سکتے تھے اس سے میں ناراض تھی۔" اس نے بھی عزیز کی طرف چہرے کا رخ کیا۔ دونوں کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ کتنی دیر ایسے ہی بیٹھے رہے۔ پھر اس نے ناک سے نکلتے پانی کو دوپٹے سے صاف کیا۔

"ایک تو تمہاری اور امی کی نفاست پسندی دوسروں تک ہی محدود ہے۔" وہ ناک چڑھا کر بولا۔

"بکواس بند کرو عزیز! لوگ ٹشو نکالتے ہیں کبھی رومال پیش کرتے ہیں۔ تم باتیں بنالو بیٹھ کے۔" سر اوپر اٹھاتے اس نے بھی افسوس سے اسے دیکھا۔ کیا جاتا اگر جیب سے رومال نکل آتا۔

"اب مجھے کیا پتا تھا تم نے چائے کے ساتھ ایک مفت سیشن لینا ہے۔" وہ اسے چھیڑتے اندر سے ٹشو کا ڈبہ لینے گیا۔ اسے یقین تھا ابھی مزید آنسو بہیں گے۔

ان کے مابین رکھی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی اور دونوں کو معلوم تھا وہ یہاں چائے کے لیے نہیں بیٹھے۔ اصل میں جس طرح رشتے خراب کرنے کے لیے ایٹم بم نہیں پھاڑنے پڑتے اسی طرح تعلقات بحال کرنے کے لیے پاور پلانٹ نہیں لگانا پڑتا۔ بس ایک زبان ہے، جس کا چلنا رشتوں کو سنوار سکتا ہے اور برباد بھی کر سکتا ہے۔

"میں اب تک اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ بابا کو بھیج دیں۔ وہ نہیں آتے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟" وہ کافی دیر بعد بولی تھی۔ عزیز نے اسے بولنے پر نہیں اکسایا۔ قمیص شلوار میں بیٹھا شخص ساری رات بھی اس کے بولنے کا انتظار کر سکتا تھا۔

"صبر" اس کے کہنے پر سارہ ہنسی تھی۔

"میں تمہیں یہ بھی نہیں کہہ سکتی تمہیں کیا پتا صبر کیا ہوتا ہے۔" دونوں ہلکا سا مسکرائے۔

"مجھے صبر کی کسی دنیاوی تشریح پر یقین نہیں رہا۔ بس یہ معلوم ہے کہ یہ ایک لفظ صبر ہر چیز پر بھاری ہے۔ یہ آپ کو کرنا نہیں ہوتا یہ اللہ خود آپ کے نصیب میں لکھتا ہے۔ ہمیں بس دعا مانگنی ہوتی ہے کیونکہ اس کے علاوہ ہمارے پاس چوائس ہی نہیں۔" وہ آج استاد بننا نہیں چاہتا تھا پر شاید کچھ لوگوں کی قسمت میں دوسروں کا استاد بننا ہی لکھا ہوتا ہے۔

"تم دعا مانگو کہ اللہ تمہیں صبر دے دے۔ تم مانگو وہ دے گا۔" عزیز چوکڑی مار کر اس کی طرف رخ کیے بیٹھ گیا تھا۔ کچھ لوگوں کو صرف دیکھ کر بھی اداسی ختم ہونے کے پورے سو فیصد امکانات ہوتے ہیں۔ لیکن لوگوں کی آنکھوں میں عزیز جتنی روشنی بھی ہوتی ہے کیا؟

"سیدہ زینب بنت جحش کے بھائی فوت ہوئے تھے۔ تین دن بعد انہوں نے خوشبو منگوائی اور لگائی۔ پھر کہا مجھے خوشبو کی ضرورت نہیں تھی مگر میں نے رسول اللہ سے سنا۔ جو عورت اللہ تعالی اور روز قیامت پر ایمان رکھتی ہو، اس کے لیے حلال نہیں کہ تین دن سے زیادہ کسی میت پر سوگ کرے، سوائے شوہر کے جس کا سوگ چار ماہ دس دن ہے۔ اسی طرح ہزاروں مثالیں موجود ہیں سارہ۔" آنسو اب بھی چمک رہے تھے، آنسو اب بھی بہہ رہے تھے۔ ان آنسوؤں کا سلسلہ تو کبھی نہیں تھمے گا۔

"جب آپ کے اپنے ہمیشہ کے لیے زندگی سے چلے جائیں تو آگے بڑھنا ہوتا ہے ان کی اچھی اقدار اور عادات کو اپنا کر، ان کی اچھی باتوں کو ذہن نشین کر کے، جنہیں وہ محبوب سمجھتے تھے ان کا خیال رکھ کر، ان سے کیا وعدہ نبھا کر، ان کی کہی گئی اخلاقیات کو پانی میں گھول کے پی کر۔ جب آپ کا کوئی اپنا دنیا سے چلا جائے تو آگے بڑھنا انہیں ساتھ لے کر ہوتا ہے۔" وہ چمکتی آنکھوں سے کہہ رہا تھا۔ زندگی کے چند اصول۔ سارہ نے اس شخص کی طرف نگاہ کی جس سے وہ دو سال سے ناراض تھی۔ کیوں ناراض تھی۔ بس ناراض تھی۔

"مجھے نہیں پتا میں تم سے کیوں ناراض تھی۔ شاید جیلس تھی کہ بابا نے جاتے جاتے صرف تمہارا نام لیا۔ عادل والا قصہ تو ہمیشہ سے بہانا تھا مجھے پتا تھا بابا کو مجھ پر کسی قسم کا شک نہیں تھا۔ ساری دنیا بدگمان ہو جائے باپ بیٹیوں سے بدگمان نہیں ہوتے۔" ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ اس کے بال آدھے کیچر میں جکڑے تھے اور ہلکی ہوا سے اڑ رہے تھے۔ عزیز نے ان اڑتے بالوں کو دیکھتے ہوئے بھی محسوس کیا۔

"اگر اب۔" وہ گِک سائیڈ پر کرتے بولا تھا۔

"اگر اب میں رخصتی کا کہوں تو؟" اس کے کہنے پر سارہ نے انکار میں گردن ہلائی تھی۔ کیسا ظلم ہوا کہ لاکھوں جگنو اس کی آنکھوں سے بے گھر ہوئے۔

"میں نے جو وقت دیکھا ہے شاید اس کے بعد یہ بالکل ناممکن ہے میرے لیے۔"

"میں ہوں سارہ۔" سارہ نے اس کی بات کاٹی۔

"میری دوستیں بھی کہتی ہیں کہ تمہارے پاس تو عزیز ہے وغیرہ وغیرہ۔ تم میری کوئی اچیومنٹ نہیں ہو۔ کوئی میڈل نہ ہی میرا اے ٹی ایم۔ ہر لڑکی کے خواب الگ ہوتے ہیں مجھے ایک انڈیپنڈنٹ لائف ایسے نہیں گزارنی کہ تم میرے کچھ نہیں لگتے یا تمہارے پیسے حرام ہیں۔ مگر میں چاہتی ہوں ہمارا رشتہ ایسے ہو۔" اس نے اپنے ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں سیدھی ساتھ کھڑی کیں۔ لیکن الگ الگ۔

"ایسے نہیں" اب اس نے ایک انگلی دوسری انگلی پر گرا دی۔

"اگر اس رشتے میں دونوں انسان ایموشنلی اور کسی حد تک فینانشلی انڈیپنڈنٹ ہوں تو اگر ایک انسان گر جائے تو دوسرا انسان کھڑا رہتا ہے۔ وہ اسے سہارا دینے کے لیے موجود ہوتا ہے۔ لڑکیوں کو چاہیے اگر وہ پیسوں سے مدد نہیں کر سکتی تو جذبات کو سمجھ کر مدد کریں۔" سارہ نے حرف با حرف ڈاکٹر آمنہ کی بات دوہرائی۔

"تم بھی دوسری قطار میں آجاؤ تو کیا جائے گا۔" عزیز نے سمجھ کر گہرا سانس لیتے سارہ جیسی بوگن ویلیا کی بیل کو دیکھا۔ ضدی۔ ڈھیٹ۔

"میں تمہاری، تمہارے خوابوں کی ہر ایک چیز کی عزت کرتا ہوں۔" سارہ نے مسکرا کے عزیز کی آواز سنی۔ عزیز مطلب قابل عزت، محبوب، پیارا۔

"ایک بات پوچھوں؟" وہ تھوڑا دور ہٹتے بولا تھا۔ سارہ نے ہاں میں سر ہلایا۔

"کیا تمہاری لمبی نامکمل خواہشات کی لسٹ میں عادل بھی شامل ہے۔" اس کی بات پر سارہ نے چہرے سے عزیز کے نام کا مطلب ہٹاتے مصنوعی خفگی سے اسے دیکھا تھا۔

"ہاں سب سے اوپر والی منزل پر وہی براجمان ہے۔ باقی تو اس دنیا میں کچھ ہے ہی نہیں۔" جل کر کہتی وہ سیدھی ہو کر بیٹھی تھی۔ اسے اس کے سوال پر غصہ نہیں آیا تھا وہ شک نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنے مسائل کا حل نکال رہے تھے، بدگمانیاں ختم کر رہے تھے۔ وہ بات کا آگے استعمال کر رہے تھے۔

"تم لوگوں کو کیوں لگتا ہے کہ ہر لڑکی کی زندگی میں ایک عدد لڑکے کا تو مسئلہ ہوگا ہی؟ کسی نہ کسی پر فدا ہوگی؟ لوگوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہم لڑکیوں کی زندگی میں تم عجیب و غریب لڑکوں کے علاوہ بھی مسائل ہوتے ہیں۔ تم لوگ اتنے اہم نہیں ہو یار ہمارے لیے۔" اس کی بات پر پاس پڑے ٹشو کے ڈبے سے چار پانچ ٹشو نکال کر اس کے اوپر پھینکے تھے۔ پر اندر سے وہ مطمئن تھا ہمیشہ کی طرح۔

"اور تم سچ میں نوٹس بھیجو گے ان کے گھر حصے کے لیے؟" وہ آج اس کی کہی گئی بات کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

"کیا اپنا حق آرام سے دے دینا چاہیے؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ سوال کے لیے الفاظ تھے جواب کے لیے خاموشی بھی ہوتی تو اسے معلوم تھا وہ کیا کہتی۔ وہ نفی میں گردن ہلا رہی تھی۔

دروازہ بجا۔

"لو آگئے" عزیز کہتا اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ وہ تینوں کیک لے کر اندر آگئے۔ ساتھ اونچا اونچا بول رہے تھے۔ ساتھ والے گھر کے در و دیوار نے جل کر خاک ہوتے اس گھر کو دیکھا تھا جہاں عزیز دونوں کے چائے کے مگ کچن میں لے کر جا رہا تھا اسے اس چائے کو اب پانچ کپوں میں ڈالنا تھا۔ گھر نے سر جھکا کہ آہ دعا میں ہم نے کیں اور پارٹی دوسرے گھر میں ہو رہی ہے۔ کیسا تضاد ہے۔

☆☆☆

وہ آفس کے لیے جلدی جلدی تیار ہو رہا تھا جب اسے باہر سے آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ اس نے مڑ کر اپنے کمرے کو دیکھا۔ نفاست سے صاف۔ ہر ایک چیز اپنی جگہ پر (بس کوئی الماری کھول کر نہ دیکھے ورنہ اپنی موت کا خود ذمہ دار ہو گا۔ اخبار میں خبر چھپے گی کپڑوں کے نیچے دب کر جاں بحق۔)

پر عزیز اپنی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ اسے یقین تھا اب امی اندر آئیں گی اور اس کی بلائیں لیں گی ان کا عزیز بیٹا۔ ماشاءاللہ۔ جھٹکے سے دروازہ کھولا اور اندر آنے والی امی نہیں سارہ تھی۔۔ پیچھے سے کسی کی آواز بھی آرہی تھی لیکن عزیز ہاتھ روکے بغیر آنکھیں جھپکے اسے دیکھ رہا تھا جو آج سے پہلے بھی اتنا خوبصورت نہیں مسکرائی تھی، آنکھوں نے شاید عزیز کے جگنو چوری کیے تھے۔ اسے صبح زیادہ روشن لگی، پیچھے اپنا گھر بھی۔ سارہ سے الفاظ نہیں بن پا رہے تھے۔ عزیز کو سیکنڈ لگا تھا یہ پتا لگانے میں کہ اس کی بیوی کا خواب پورا ہو گیا ہے۔ کیا خواب پورے ہوں تو انسان اتنا ہی اچھا لگتا ہے؟ جتنی عزیز کو سارہ۔

باہر سے سب کی خوشی سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ دونوں گھروں کے در و دیوار نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے کیونکہ انہیں یقین تھا کچھ دنوں میں یہاں بتیاں روشن ہوں گی، آوازیں گونجیں گی، خوشی کے شادیانے بجیں گے۔ ان کے عزیز اور سارہ تمام خوشیوں کے حق دار تھے!

☆☆

آنیسہ عائش

خلش

وہ ، ہڑبڑا کر نیند سے جاگ اٹھی۔ اس کا سارا وجود پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے پانی کا گلاس لبوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں پی گئی۔ گہری سانس بھرنے کے بعد حواس قابو میں آئے تو وہ موبائل اٹھائے باہر نکل آئی۔ کافی دیر سوچ بچار کے بعد اس نے میسج لکھا اور بھیج دیا۔ اب اسے جواب کا انتظار تھا۔

☆☆☆

رویجہ چار بھائیوں کی لاڈلی اور اکلوتی بہن، ماں باپ کی نازک مزاج ناز و نعم میں پلی اکلوتی بیٹی، عفیفہ اس کی اکلوتی دوست تھی۔ دونوں اسکول کے زمانے کی سہیلیاں تھیں، اب کالج میں بھی ساتھ تھیں۔ دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔ یوں دونوں گھرانے ایک دوسرے سے خوب واقف ہو گئے تھے۔ آج بھی رویجہ کمبائن اسٹڈی کے بہانے سے عفیفہ کے گھر آئی ہوئی تھی۔ عفیفہ سلش لینے کچن میں آئی تو وہاں رافع کو کھڑے پایا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ میری سہیلی کی لائی ہوئی چیزوں پر نظر نہ رکھو۔“ اسے فریج کا دروازہ کھول کر چیزوں کا جائزہ لیتے دیکھ کر بولی۔

”میری تو صرف چیزوں پر ہی نہیں بلکہ تمہاری سہیلی پر بھی نظر ہے۔“

”منہ دھو رکھو۔ خبردار ایسی ویسی بات سوچی بھی تو۔ میری سہیلی یوں ہی ہی نہیں ہے۔“

”اور اگر میں سنجیدہ ہوں تب بھی۔“

”فی الحال تو سنجیدہ کے بجائے غیر حاضر دماغ لگ رہے ہو۔ یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ۔“

وہ شرارتی سے انداز میں کہتی کچن سے باہر نکل گئی جبکہ وہ پر سوچ نظروں سے اسے دور جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

رات کو بستر پر لیٹے لیٹے اس کے ذہن میں رافع کی بات آئی تو وہ چونک اٹھی۔ رافع اس کا خالہ زاد اور رضاعی بھائی تھا۔ رافع اسے بھائی جتنا عزیز تھا تو رویجہ نے اس کی بہن کی کمی پوری کر دی تھی۔ کیا ہی اچھا ہو اگر رویجہ اور رافع ایک ہو جائیں۔ ایک خیال سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ رافع کے اصرار پر وہ رویجہ کے سامنے ذکر چھیڑ بیٹھی۔

رویجہ کے سپاٹ تاثرات نے عفیفہ کو نادم کر دیا تھا۔ مگر عفیفہ کی ثابت قدم کوششوں سے رویجہ رافع سے بات کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی اور پہلی ہی ملاقات میں گئی، پرکشش آنکھوں والے رافع نے رویجہ کو اپنا اسیر کر لیا تھا۔ اس نے رافع کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی مگر وہ اسے جھڑک کر لاتعلقی بھی نہیں اپنا سکی تھی۔ جب رافع کے چکر بڑھنے لگے تو رویجہ نے صاف الفاظ میں عفیفہ کے ذریعے کہلا بھیجا کہ اپنی امی کو گھر بھیجے۔

رافع خود بھی یہی چاہ رہا تھا۔ چنانچہ ارادے پہ عمل کر ڈالا۔ مگر امی کا ردعمل دیکھ کر تو وہ حق دق رہ گیا۔ وہ ایسی چراغ پا ہوئیں اور وہ واویلا مچایا کہ خدا کی پناہ۔ اس نے بھلا اپنی ماں کا یہ روپ کب دیکھا تھا۔ بھلا وہ بغیر بتائے لاہور چلا آیا اور سیدھا عفیفہ کے پاس آ کر دم لیا۔

وہ پریشان حال عفیفہ کو ساری صورت حال سے آگاہ کر رہا تھا کہ رویجہ آ پہنچی۔

رافع کی آواز نے اس میں سرشاری کی لہر دوڑا دی تھی۔ اپنا نام سن کر بلا ارادہ ہی وہ رک گئی اور دروازے سے لگی ان کی باتیں سننے لگی۔

”مجھے لگتا ہے غلطی مجھ سے ہی ہوئی ہے۔ میں نے خود جا کر مما کو بول دیا کہ میں رویجہ کو پسند کرتا ہوں اور وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے مجھے کیا علم تھا کہ



اندر سے مما ایسی سوچ رکھنے والی نکلیں گی۔"

"کیوں کیا ہوا؟" یہ عفیفہ کی آواز تھی۔

"امی بہت غصہ ہوئیں اور پتا نہیں کیا کیا کہنے لگیں کہ وہ کردار کی اتنی ہلکی لڑکی سے میری شادی کبھی نہیں کروائیں گی، جو پڑھائی کے بہانے آکر دوست کے بھائی سے عشق کی پینگیں بڑھائے۔"

"کیا مطلب اس بکواس کا؟ رافع" "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے کتنی مشکلوں سے رویحہ کو راضی کیا تھا تم سے بات کرنے کے لیے۔"

عفیفہ پھٹ ہی تو پڑی اور باہر کھڑی رویحہ پر تو گویا آسمان الٹ پڑا۔ اس سے آگے کچھ نہ سنا گیا۔ اسے خود بھی خبر نہ تھی کہ وہ اپنے بے جان وجود کو گھسیٹے گھر کیسے پہنچی۔

☆☆☆

"رویحہ یار! کیا ہوا تمہیں؟ آنٹی نے بتایا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟" عفیفہ اس کی طبیعت خرابی کا سن کر دوڑی چلی آئی۔

"عفی! میں کردار کی اتنی ہلکی کیسے ہوگئی کہ دوست کے بھائی سے عشق کی پینگیں بڑھانے لگی۔"

رویحہ کا جواب سن کر عفیفہ کو یک دم ندامت نے آگھیرا اور وہ نظریں چرا گئی۔

اس دن کے بعد رویحہ کو اک چپ سی لگ گئی۔ عفیفہ کی تسلی، دلاسا، صفائی اور وضاحت کچھ بھی اس کی سنجیدگی توڑنے میں ناکام رہی۔

رافع کی منگنی کی خبر نے تو گویا تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ جو آس اور آخری امید تھی وہ بھی نہ رہی۔ عفیفہ کو رافع پر رہ رہ کے تاؤ آرہا تھا اور اس نے فون پر اسے سنا کر، خوب بھڑاس نکال کر اسے بلاک کردیا تھا اور اس سب کے بعد رافع کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اس کا سامنا کرسکے سو لاہور کا رخ تک نہ کیا۔

البتہ رویحہ کی دماغی حالت ابتر ہوگئی تھی۔ اس کے ماں باپ اور بھائیوں کی جان پر بن آئی تھی کہ ہر وقت، چہکنے والی مینا نے ایسا چپ کا روزہ رکھ لیا تھا کہ الفاظ بھی گن گن کر بولتی۔

اس کی ماں اسے دیکھ کر ہولتی تھیں کہ ان کی خوش پوشاک لاڈلی کو اپنے پہنے ہوئے دو روز کے میلے کپڑوں سے بھی کوئی الجھن نہیں ہوتی۔ طرح طرح کے کھانے اور چسکے کی شوقین جو تھے زہر مار کر کے ہاتھ کھینچ لیتی۔ وہ پوچھ پوچھ کر تھک گئیں مگر بے سود عفیفہ سے سوال جواب کیے تو وہ بھی خاموش کہ اب بتانے کو کچھ رہا ہی کب تھا۔ سائیکاٹرسٹ سے اس کے سیشن ہونے لگے۔ اس کے والد نے ایک کے بعد ایک، ماہر نفسیات کو آزما چھوڑا مگر بیٹی کا روگ اور سوگ نہ ختم کرپائے۔

عفیفہ کو خود کسی پل سکون نہ ملتا۔ ہر روز رویحہ کے گھر کے چکر لگاتی۔ ہاں اتنا ہوتا کہ عفیفہ کے آنے پر وہ کچھ پر سکون نظر آتی تھی اس سے حال دل کہہ سناتی، اس کے سامنے رو پڑتی کہ ایک وہی تو محرم راز تھی۔

اپنی بیٹی کے سکون کی خاطر انہوں نے عجیب فیصلہ

کیا اور وہ عفیفہ کی امی کے ہاں سوالی بن کر آ کھڑے ہوئے وہ تذبذب میں پڑ گئیں اکلوتی بیٹی کی زندگی کا فیصلہ یوں کرنے کا تو نہ سوچا تھا بھی، مگر بیٹی کے ہر روز کے چکر اور گھر پہ ہو کر بھی ہر صبح اور رات بستر پر پہنچنے تک رویحہ کی فکر، ہر فون کی گھنٹی پر کان لگائے رکھنا ان سے پوشیدہ تو نہیں تھا سو انہیں ہاں کہنی پڑی۔

یوں عفیفہ ان کے بڑے بیٹے سے نکاح کر کے رویحہ کی بھابھی بن کر اس گھر میں آ گئی۔ اس کی آمد سے رویحہ کی چپ ٹوٹی تھی۔ عفیفہ نے آتے ہی رویحہ کو اپنی ذمہ داری میں لے لیا۔ اس کی ادویات۔ سائیکاٹرسٹ کے سیشن۔ اس کو مصروف رکھنے کے لیے نئے حربے، ہر دم پر جوش باتیں۔ پارک اور تمام قریبی جگہوں کے دورے جو وہ کر سکتی تھی کر ڈالا۔

اس کا نکاح سادگی سے ہوا تھا اور نئی دلہن، دعوت، ملبوسات جیسا کچھ بھی نہ تھا کہ وہ لائی ہی رویحہ کے لیے، بلکہ وہ خود اس گھر میں رخصت ہو کر آئی تھی اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنے۔۔۔

ان تمام تر کوششوں کا خاطر خواہ اثر رویحہ پر نظر آنے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ سنبھل رہی تھی۔ اگرچہ ڈپریشن کے دورے اس پر بھی پڑتے تو سب کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ سب کا سلوک عفیفہ کے ساتھ اچھا تھا۔ اس کے علاوہ اس پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔

☆☆☆

"عفیفہ مجھے تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ خود کو دیکھو کہیں سے بھی دلہن نہیں لگتیں۔ لوگوں کے تو سال سال تک چاؤ ہی پورے نہیں ہوتے میں کہہ رہی ہوں، بس تم اور معظم ضرور شرکت کرو گے رافع کی شادی میں، تمہاری خالہ کا تو اصرار تھا کہ اپنے بھائی کی شادی پر ہفتہ پہلے تو آؤ اور تم ہو کہ۔"

"میں بالکل نہیں جاؤں گی۔" عفیفہ پھٹ پڑی۔

"مگر کیوں؟ کوئی وجہ بھی تو ہو انکار کی۔ تم ہی اسے سمجھاؤ بلکہ تم بھی چلو۔ تم تینوں میں کتنی دوستی تھی۔ ماحول تبدیل ہو گا تو تم بھی اچھا محسوس کرو گی۔"

آخری جملے انہوں نے کمرے میں داخل ہوتی رویحہ سے کہے تھے۔ عفیفہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

"آپ بے فکر ہو جائیں آنٹی، میں اسے سمجھاؤں گی اور ہم شادی میں ضرور شرکت کریں گے۔"

وہ خوشی سے کھل اٹھی تھیں۔ امی کے جاتے ہی ہی عفیفہ اس کے سر پر جا پہنچی۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا؟ ہوش میں تو ہو ناں کیا کہا ہے تم نے امی سے۔"

"ہاں ہوش میں ہوں اور ایسا ہی ہو گا۔" رویحہ کے شادی میں جانے کے اعلان کو، سب گھر والوں نے خوش آئند فیصلہ قرار دیا تھا مگر عفیفہ کا دل ہول رہا تھا۔ اس نے معظم کے سامنے بے چینی کا اظہار کیا تو جواباً وہ بھی اسے سمجھانے لگا۔

"اچھا ہے رویحہ کا ماحول تبدیل ہو گا تو ذہن پر اچھا اثر پڑے گا۔"

آخر میں اس رویحہ کے سامنے ہاتھ تک جوڑ دیے کہ وہ اپنی جان پر، یہ ظلم نہ کرے مگر اس کے سمجھانے پر اس نے صرف اتنا ہی کہا۔

"میں اپنے ضبط کو آزمانا چاہتی ہوں۔"

عفیفہ بددلی سے اور رویحہ ظاہری جوش سے رافع کی شادی میں آئے تھے۔ رویحہ مما کا فون سننے کی خاطر باہر کی طرف چلی آئی کہ اپنے نام کے تذکرے نے اس کے قدم روک لیے۔ یہ رافع کی بہن تھی جو شاید اپنی دوست سے کہہ رہی تھی۔

"یہ ہے رویحہ جس پر بھائی مرتے تھے۔ اتنی بھی خوب صورت نہیں ہے۔ اماں نے اس سے دوگنی خوب صورت بھابھی ڈھونڈ نکالی ہے مگر بھائی کا سوگ ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ ہے کیا ہے، اس میں شاید اماں ٹھیک ہی کہتی ہیں اپنے ناز و ادا سے اس نے بھائی کو دیوانہ بنا لیا ہو گا۔"

وہ دونوں ہنستی ہوئی چلی گئیں۔ اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے عفیفہ اس کے پاس پہنچی تو اس کی زرد رنگت پر نظر پڑتے ہی معظم کو کال ملائی۔ امی کو رویحہ کی طبیعت خرابی بتائی باہر کھینچ لائی۔ اسے کار میں بٹھایا۔

"کیا ہوا تمہیں رویحہ ڈیئر؟" رویحہ کیا جواب دیتی۔ اس کا وجود تو زلزلے کی زد میں تھا۔ ہر سمت سے اپنی جملوں

کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ اتنے زیادہ لوگوں میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ کسی پرسکون جگہ لے چلیں۔"

یونہی گھوم گھام کر وہ رات گئے لوٹ آئے تھے۔

ایک جامد چپ رویحہ پر اگلے چوبیس گھنٹے طاری رہی۔

عفیفہ کچن میں تھی کہ اس کے موبائل پر میسج موصول ہوا۔ رافع کی دلہن کے ہمراہ تصاویر دیکھ کر رویحہ کی طبیعت بگڑ گئی۔ فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔

وہ اس صدمے کو برداشت نہیں کر پائی تھی سو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندگی سے منہ موڑ گئی۔

☆☆☆

"قیصر ولا" پر تو گویا افتاد آن پڑی۔

بیگم قیصر پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے تو قیصر صاحب کے کندھے ایک رات میں ڈھلک گئے تھے۔ عفیفہ کو سب کو دلاسا دیتے روتے ہوئے بھائیوں (دیور) کو چپ کراتے خود کو رونا تک نصیب نہ ہو سکا تھا۔ میت کی تجہیز و تکفین، تعزیت کرنے والوں کی آمد، اس کے شب و روز یوں گزر رہے تھے کہ اسے نہ دن کا ہوش تھا نہ رات کا۔ اس کی امی بیٹی کو دیکھ کر تاسف میں مبتلا ہو رہی تھیں، کہاں ان کی نازوں پلی اپنا کھانا خود تک نہیں لیتی تھی اور کہاں یہ بیک وقت سات افراد کی ذمہ داری نبھا رہی تھی۔ وہ بغیر جھنجلاہٹ اور الجھن کے ہر کام سیکھتی چلی گئی۔

وہ اس سب کا قصوروار خود کو سمجھتی تھی سو پہلے دن سے کفارہ سمجھ کر سب کچھ قبولتی چلی آئی۔ اسی تگ و دو میں سال تمام ہو گیا۔ اب گھر میں کل وقتی ملازمہ کا بندوبست کروا دیا گیا۔

مبشر اور مدثر ہاسٹل شفٹ ہو گئے تھے۔ امی جان اٹھتے بیٹھتے اس کی تعریفیں کرتی نہ تھکتیں وہ اس کی ممنون تھیں، بابا جان اس کے لیے مجسمہ شفقت کہتے کہ اللہ نے ایک بیٹی لی تو دوسری عطا کر دی۔ اور معظم اس کا سب سے بڑا شکرگزار۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ اس کو اتنی راحت اور خوشیاں دے کہ گزشتہ تمام تکلیفوں کا ازالہ کر دے۔ اس کی ماں مطمئن تھیں کہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس کے پاس فرصت ہی فرصت تھی۔ ماضی کی دبی سوچیں اسے گھیرتیں۔ وہ پچھتاوؤں کی لپیٹ میں آ جاتی۔ کاش وہ رویحہ کو نہ اکساتی نہ یہ سب کچھ ہوتا۔ نہ یہاں تک بات پہنچتی۔ اسے رویحہ کی باتیں یاد آتیں۔ وہ اردگرد چلتی پھرتی محسوس ہوتی۔ دل پہ اداسی چھاتی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی۔

سال بھر کے دبے آنسوؤں کو باہر نکلنے کا موقع ابھی تو میسر آیا تھا۔ اسے کسی پل چین نہ آتا۔ عجب کل ہی تھی۔ اب تو خواب میں بھی رویحہ ہی دکھائی دینے لگی تھی۔ آج بھی یہی ہوا تھا۔ اس نے موبائل اٹھایا اور ایک سائیکاٹرسٹ (جس سے رویحہ کو علاج کے دوران اس کی اچھی دوستی ہو گئی تھی) کو صورت حال لکھ بھیجی تھی۔ موبائل کی اسکرین چمکی، اس کی میل کا جواب آ گیا تھا۔

"ڈیئر عفیفہ! آپ نے لکھا ہے کہ جو ہوا اس کی قصوروار آپ تھیں مگر آپ کفارے کے طور پر اس کی بھابھی بنیں اور ساری مشکلات سہیں۔ اب جو آپ خود کو رویحہ کی موت کا ذمہ دار سمجھتی ہیں تو اس وہم سے خود کو آزاد کرالیں۔ اور آپ نے لکھا کہ آپ چاہتی ہیں کہ سب کچھ سچ بتا کر معافی مانگ لوں تو ڈیئر، اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کا پردہ رکھا ہے تو یہ نعمت ہے اور یہ بھی تو سوچیے نا، کہ آپ کی مرحوم دوست کا پردہ کھل جائے گا۔ یہ بالکل بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔

آپ کی الجھن کا بہترین حل یہ ہے کہ تمام سوچوں کو جھٹک کر مصروفیت اختیار کریں۔ جتنا ہو سکے خود کو مصروف رکھیں اور اپنی دوست کی مدد کرنا چاہتی ہیں تو اس کا ایک طریقہ ہے۔ "ایصال ثواب" جتنا ہو سکے اس کے لیے ایصال ثواب کا اہتمام کریں۔"

عفیفہ کو اس کی الجھن کا سرا مل گیا تھا۔ اس نے اپنی نمازوں میں خشوع و خضوع بڑھا دیا اور نوافل اور قرآن پاک کو پڑھ کر ایصال ثواب کرنے لگی تھی۔ امی اور بھائیوں کو بھی یہی تلقین کرتی نظر آتی۔ اس کے دل کو قرار آ گیا تھا۔ وہ پرسکون رہنے لگی تھی۔

مزید روح اس میں معظم کے التفات نے پھونکی تھی۔ معظم اس کے نام کی مالا جپتا تھا۔ وہ خوش تھی مگر کبھی کبھی یہ خلش اسے ستاتی تھی۔ اے کاش کہ ایسا نہ ہوتا!

☆☆

آسیہ رئیس خان

موسمِ گل

نمائش گاہ کی پرفسوں فضا میں ابھرتی اکا دکا دبی دبی سرگوشی، مردانہ جوتوں اور زنانہ ہیلز کی ٹھک ٹھک کے علاوہ کوئی اور آواز نہیں تھی لیکن جب وہ سست قدموں سے چلتی اس تصویر کے سامنے پہنچی تو گویا سارا ہال اس کی دھڑکنوں کے شور سے بھر گیا۔

سیاہ گیٹ کے پاس کسی محافظ کی طرح ایستادہ پلاش کے پھولوں سے کیسری ہوا درخت اس کے لیے مانوس تھا لیکن درخت کے نیچے کھڑی عورت کی شبیہہ۔ یہ عکس مانوس نہیں بلکہ اسی کا تھا۔ سرخ لمبا کوٹ، کاندھے سے لٹکا پرس، شانوں پر پڑے بال اور پیروں میں بلاک ہیل والے جوتے۔ تصویر کی صورت واضح نہیں تھی لیکن برش کے اسٹروک اور رنگوں کے امتزاج نے باقی تفصیل بڑی مکمل پیش کی تھی۔ یہ منظر دیکھنے اور پھر اسے کینوس پر رنگوں سے زندہ کرنے والی آنکھیں اسے بھی دیوانی تو نہیں تھیں۔

''ویٹ از ٹائم لیس! (انتظار وقت کی قید سے آزاد ہے) میری زندگی ایک شخص کے انتظار کا دوسرا نام بھی بن جائے تو میں خوش ہوں، انتظار بھی تو رومان ہے۔''

شور تھم سا گیا اور اس کے کانوں میں وہ گہری بھاری سی آواز ابھری تھی۔ وہ دنیا کا یکتا انسان تھا، اپنے یقین کے بل پر سفر جاری رکھنے والا۔ یہ تصویر بھی اسی ایقان کا پرتو تھی جو اس نے یسریٰ کی ذات سے منسوب کیا تھا۔

''اور وہ غلط نہیں تھا۔'' اس نے سوچا اور اعتراف کیا۔

''مجھے اس کے یقین نے بدلا ہے۔''

''ڈاکٹر یسریٰ بیبن!'' عقب سے وہی بھاری گہری آواز آئی، اس بار یہ ماضی قریب کی یاد نہیں، اس پل کی حقیقت تھی۔ وہ آہستہ سے پیچھے مڑی اور اسے دیکھتے ہی دل نے شکوہ کیا کہ اس نے ویسے ہی ''یسریٰ'' کہہ کر کیوں نہیں پکارا جیسے اس دن رخصت کرتے ہوئے اسٹیشن پر پکارا تھا۔

☆☆☆

کچھ مقام ہوتے ہیں جہاں آپ سال کے کسی بھی وقت جائیں، وہ دلکش اور فرحت بخش ہی نظر آتے ہیں۔ قدرت نے 'پرن نگری' کو بھی ایسی ہی شاہانہ فراخ دلی سے حسن عطا کیا تھا کہ اس کی کشش میں تخفیف گویا ناممکنات کا حصہ تھی۔

شام بھی اس کے ہمراہ سفر کرتی قصبے میں داخل ہوئی تھی، سرد ہوائیں اور ان میں بسی پہاڑوں اور جنگلی پھولوں کی مہک کے ساتھ وداع ہوتا سورج، طویل سفر کے باوجود احساب کا مزاج خوش گوار کر رہا تھا۔

اس نے گاڑی اس اونچے راستے پر ڈالی جس کے اختتام پر ایستادہ پرانی عمارت اس کا گھر تھی۔ جتنا خوب صورت یہ قصبہ تھا اتنی ہی خوب صورت یادیں اس گھر اور اس جگہ سے وابستہ تھیں۔ یہ نہیں تھا کہ اسے شہر کبھی پسند نہ تھی لیکن تیز رفتار اور شور شرابے والے ماحول سے دور کچھ دن یہاں گزارنا اسے ہمیشہ بہت اچھا لگتا تھا۔

گیٹ کے پاس بریک لگا کر اس نے ہارن پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ دروازے پر رامو کاکا نمودار ہوئے۔ انجن کی آواز نے انہیں متوجہ کر لیا تھا۔ یہ ان

مکمل ناول



کے واپس جانے کا وقت تھا وہ ہاتھ میں تھیلی تھامے مسکراتے ہوئے تیز قدموں سے اس کی طرف آئے اور گیٹ کھولا، وہ گاڑی اندر لے آیا تب تک ابا بھی اس کی آمد سے باخبر ہو کر پورچ میں نکل آئے تھے۔

''کیسے ہیں راموکاکا؟'' باہر نکل کر اس نے پوچھا۔

''بھگوان کی کرپا ہے بیٹا! اس بار بڑے دن بعد آئے۔'' وہ جواباً مسکرا دیا۔

تب تک وہ ابا کو دیکھ چکا تھا۔ انہیں سلام کرتے ہوئے وہ پورچ کی طرف بڑھا۔ راموکاکا ڈکی سے سامان نکالنے کے لیے وہیں کار کے پاس رکے رہے۔

''کیسے ہیں ابا؟'' وہ ان سے بغل گیر ہوا۔ دونوں کا قد تقریباً ایک سا اونچا تھا۔ قد ہی کیا تینوں بھائیوں میں وہ سب سے زیادہ ابا سے مماثلت رکھتا تھا۔ صورت اور جسامت کے ساتھ ساتھ بیشتر عادات بھی ان کی ایک سی تھیں۔

''اللہ کا کرم ہے۔'' ان کے لہجے میں تشکر تھا۔

''فون کر دیتے۔'' وہ کبھی اطلاع دے کر نہیں آتا تھا اور ابا ہمیشہ اس سے یہ ہی کہتے تھے۔ ان سے الگ ہو کر وہ ہنس دیا۔

''رامو وہیں کھڑا ہے، ڈکی کھول دو۔'' انہوں نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ہر بار اس کے ساتھ آنے جانے والا 'سامان' وہ دونوں جانتے تھے۔

''آپ کو دیر ہو جائے گی کاکا! آپ جائیں۔ صبح نکال لیں گے۔'' اس نے وہیں سے اونچی آواز میں کہا۔ راموکاکا کو ڈھلان اتر کر نیچے جانا تھا اور پھر وہاں سے قصبے کے دوسرے سرے پر ان کا گھر تھا۔

سورج افق کے کنارے پھیلی سرمئی ردا میں منہ چھپانے ہی والا تھا اور شب کوری کے مرض کے باعث ان کی کوشش ہوتی کہ وہ اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے گھر پہنچ جائیں۔ وہ صبح آتے اور شام اس وقت گھر لوٹ جاتے تھے۔ وہ اس گھر کے واحد ملازم تھے جو گھر کی صاف صفائی کے ساتھ ساتھ بیک وقت خانساماں، مالی اور نگراں کے فرائض بھی نبھا رہے تھے۔

''جیسا آپ کہو بیٹا! چلتا ہوں۔'' وہ اپنی دھرم پتنی کے ہاتھوں کی سلی چتکبری سی تھیلی ہلاتے گیٹ سے باہر نکل گئے۔

''آؤ۔'' ابا نے اندر جاتے ہوئے کہا۔

گھر میں خاموشی کا راج تھا، جس میں ابا کے کمرے سے ٹی وی کی دبی دبی سی آواز اس حکومت کے خلاف بغاوت کی کوشش کر رہی تھی۔

''کھانا کھاؤ گے یا کافی؟'' وہ باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

''ابھی کچھ نہیں ابا۔'' وہ رک گئے۔

''میں شاور لوں گا، اس کے بعد خود کچن دیکھ لوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔''

''ٹھیک ہے، تم فریش ہو جاؤ، مغرب ہونے والی ہے نماز کے بعد ساتھ چائے پیتے ہیں۔''

وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ جو راموکاکا ہمیشہ اس کے لیے تیار رکھتے تھے۔ دونوں بھائی جب بھی آتے، آٹھ دس دن پہلے اطلاع دیتے تھے، ان کے ساتھ اکثر بیوی بچے ہوتے اور مقصد کچھ دنوں کی تفریح ہوتا تو کبھی بھی دوستوں کے ساتھ آ دھمکتے تھے جب کہ وہ عمر کی بیالیس بہاریں، خزائیں، بارشیں دیکھنے کے بعد بھی اب تک تنہا تھا اور جب دل کرتا اپنا سامان گاڑی میں ڈال کر چلا آتا۔

یہ چھوٹا قصبہ ان کے بچپن میں گم نام اور عام سا تھا لیکن پچھلے پندرہ بیس برسوں میں قریب کے شہروں میں۔ بسنے والوں نے اسے 'دریافت' کر لیا تھا اور اب وہ ان کے لیے قریبی اور سیر تفریح کی پسندیدہ جگہ بن گیا تھا۔ لوگ کبھی ایک دن کے لیے پکنک منانے بھی آتے تو کبھی 'ویک اینڈ' منانے۔ دنیا اس قصبہ سے اب بھی بے خبر تھی تاہم آس پاس پھیلی اس کی شہرت و مقبولیت نے اس قصبے کی اہمیت بھی بڑھا دی تھی۔ اسی مناسبت سے مقامی افراد نے درمیانے معیار کے ہوٹل اور ریستوران کھول لیے

ساتھ ہی اپنا شوق پورا کرے لیکن انتساب کا فلسفہ زندگی مختلف تھا۔ وہ معاشرتی یا خاندانی دباؤ کی وجہ سے اپنی زندگی مروجہ طریق سے گزارنے کا قائل نہیں تھا۔

وہ حساس تھا، بے حد رومانی مزاج رکھنے والا، کائنات کی رنگینیوں میں عشق ڈھونڈنے اور ان سے عشق کرنے والا۔ یہ ستم ظریفی ہی تھی کہ اس مزاج کے باوجود وہ اب تک اکیلا تھا۔

جس کا افسوس اس کے علاوہ ہر کسی کو تھا۔ اپنے علم فن اور قابلیت کی بنا پر اسے نئے پیشے میں بھی وہ کامیابی ملی جو ہر قابل بندے کا مقدر نہیں ہوتی۔

ابا کا دل اس گھر اور جگہ کے علاوہ کہیں نہیں لگتا تھا۔ بچوں کے اصرار کے باوجود بھی وہ ان کے ساتھ نہیں رہتے تھے۔ چند دن کے لیے جاتے بھی تو جلد ہی لوٹ آتے تھے۔ ان کے بعد اس کا ہی دل 'پون نگری' میں سب سے زیادہ لگتا تھا، باقیوں کے لیے چند دن سے زیادہ یہاں ٹھہرنا مشکل تھا کہ انہیں شہر کے ہنگامے جلد اپنی جانب کھینچ لیتے تھے۔

وہ غسل کے بعد تر و تازہ ہو کر اور مغرب کی نماز پڑھ کر باہر آیا تو ابا باورچی خانے سے ٹرے لیے باہر آ رہے تھے۔

"کھانا بھی تیار ہے، اگر بھوک لگی ہے تو پہلے کھانا کھا لو۔" انہوں نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا جس میں ایک کپ میں ان کی چائے تھی اور دوسرے مگ میں اس کی کافی۔ اسے اپنے ابا پر بے اختیار پیار آ گیا۔

"کھانا آپ کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔" اس نے ایک کرسی سنبھال لی۔ باہر اندھیرا اچھل گیا اور فضا میں خنکی کا احساس بڑھ چکا تھا۔

"آپ نے روٹین چیک اپ کروایا؟" مگ اٹھاتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔

"اسپتال گیا تھا، اس دن کوئی مشین خراب تھی، انہوں نے اگلے دن آنے کو کہا لیکن میں پھر جا نہیں سکا۔"

تھے۔ قصبے کی رونق اور شہرت بڑھ گئی تھی۔

دادا وہاں کے پوسٹ آفس میں سرکاری ملازم تھے۔ یہ مکان انہوں نے ہی تعمیر کروایا تھا جسے بناوٹ اور قدامت کی وجہ سے اب 'ہیریٹج' میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ ابا اکلوتی اولاد تھے۔ دادا کے بعد ابا کو بھی ریلوے میں ملازمت مل گئی لیکن جلد ہی وہ تبادلوں سے تنگ آ گئے اور وہیں کے اسکول میں ملازمت اختیار کر لی جہاں ترقی کرتے ہوئے وہ پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ ان تینوں کو اسکول کے بعد اعلا اور بہتر تعلیم کے حصول کے لیے انہوں نے خود سے دور دوسرے شہر میں ہاسٹل میں رکھا۔

وہ جب گیارہ سال کا تھا تب ایک رات اس کی پیاری اور معصوم سی امی دل کے دورے سے جانبر نہ ہو سکیں۔ اس وقت بڑے دونوں بھائی شہر جا چکے تھے۔ اس کا اسکول مکمل ہونے تک ابا اور وہ دونوں ہی گھر کے مکیں تھے۔ امی کے بعد ابا نے اس کا ہر طرح سے خیال رکھا، ہر ممکن کوشش کی کہ وہ ماں کی کمی محسوس نہ کرے۔

یہ بھی ایک وجہ تھی کہ وہ دونوں بھائیوں کے مقابلے میں ابا کے زیادہ قریب تھا۔ ان کے درمیان بے تکلفی تھی اور وہ ایک دوسرے کے لیے سب سے زیادہ قابل فہم تھے۔

اسکول کے بعد وہ بھی بھائیوں کے پاس شہر چلا گیا اور ابا یہاں تنہا رہ گئے۔

بڑے بھیا لیکچرر تھے، چھوٹے بھیا کاروبار کر رہے تھے۔ اب تو ان کے بچے بھی شادی کی عمر کو پہنچ چکے تھے لیکن وہ ان کا چاچو یعنی احتساب اب تک تنہا تھا۔ فائن آرٹ پڑھنے کے بعد اس نے بھی تدریس کو اپنا پیشہ چنا تھا۔ پھر ہوا یوں کہ ملازمت کے دوران ڈاکٹریٹ کے لیے سرچ کرتے ہوئے اس نے دل و ذہن کے اصرار پر اپنے شوق کو ہی پیشہ بنا لیا اور ملازمت چھوڑ دی۔ سب نے سمجھایا، اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ نوکری نہ چھوڑے، اس کے

"کوئی بات نہیں۔ اب میرے ساتھ چلیے گا۔"
اس کام کے لیے قریبی شہر جانا پڑتا تھا۔

اس نے ان کے دوستوں کا احوال پوچھا اور وہ اس سے دونوں بیٹوں اور پوتے پوتیوں کے متعلق بات کرتے رہے۔ عشاء کی نماز کے بعد دونوں نے کھانا کھایا اور ابا لکھنے کا کام لے کر بیٹھ گئے۔ وہ حالاتِ حاضرہ کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر اردو اخبارات کے لیے مضامین لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا دوسرا پسندیدہ کام ٹی وی پر پرانے کرکٹ میچ دیکھنا تھا۔

اسے لمبے سفر اور ڈرائیونگ نے تھکا دیا تھا، بستر پر گرتے ہی وہ سو گیا۔

☆☆☆

جب اس نے بھابھی سے کہا کہ وہ جانے سے پہلے مما کا سامان دیکھ لیں گی تو انہوں نے صاف لفظوں میں واضح کر دیا تھا۔

"دیکھنا نہیں ہے، کمرہ خالی کرنا ہے۔ کپڑے اور استعمال کا جو سامان تم لے جانا چاہو۔ لے جاؤ، باقی کسی کو دے دیں گے اس کے علاوہ جو کتابیں وغیرہ ہیں، ان کا کیا کرنا ہے یا وہ بھی ساتھ لے جانا، ویسے بھی تم اتنے بڑے گھر میں اکیلی ہوتی ہو۔"

وہ حسب عادت مسکرا دی تھی اور اب ماں کے کمرے میں بڑی دیر سے ان کے پلنگ پر بت بنی بیٹھی تھی۔ ماں کی خوشبو، ان کی موجودگی کا احساس، ان کا لمس کمرے کی ہر چیز میں تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ہمیشہ کے لیے کمرے کو جوں کا توں رہنے دیتی۔ کمرے کی فضا میں ماں کے قریب ہونے کا احساس رچا بسا تھا۔

اس کے ہر فیصلے میں وہ اس کے ساتھ ڈٹ کر کھڑی رہی تھیں۔ انہوں نے اسے دنیا کے ڈر اور معاشرے کے دباؤ میں آ کر مرضی اور پسند کے خلاف فیصلے کرنے سے ہمیشہ روکا تھا۔ وہ اس کے لیے فکر مند ضرور ہوتی تھیں لیکن اپنی تسلی اور اطمینان کے لیے انہوں نے اسے مجبور کبھی نہیں کیا۔ انہوں نے جذباتی بلیک میلنگ کی جگہ ہمیشہ اسے جذباتی طور پر مضبوط کرنے کی سعی کی تھی۔

وہ اتنی سبک خرامی اور خاموشی سے اگلے جہاں چلی گئی تھیں کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہونے پائی۔ نہ کوئی بیماری نہ علامت، ہنستی مسکراتی پوتے پوتیوں کے ساتھ روزمرہ کے معمول نبھانے کے بعد وہ رات کو سوئیں اور پھر یہ نیند ان کی آخری ثابت ہوئی۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے ان کا لحاف اٹھا کر اس کی خوشبو اپنے اندر اتاری۔ دنیا کو محسوس ہو نہ ہو مگر ہر ماں کو اپنی تھی اولاد کی مخصوص خوشبو بڑی اچھی لگتی ہے ویسے ہی بوڑھے والدین کے بستر، کپڑے اور ان کی چیزوں سے بھی بچوں کو ان کی مخصوص خوشبو آتی ہے۔ اس کا دل ایک نئے دکھ سے بھر گیا۔ اب ماں کے سینے سے لپٹنے کے بجائے اسے ان ہی چیزوں سے لپٹنا تھا۔

اس نے نم آنکھوں سے لحاف واپس بستر پر رکھا اور ایک گہری سانس لے کر کھڑی ہو گئی۔

اس کے پاس وقت کم تھا۔ اس نے الماری سے ان کی کچھ ساڑیاں اپنے لیے الگ کیں اور باقی سب ضرورت مندوں میں تقسیم کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ پھر ان کی کتابیں چھانٹیں، کچھ پرانے شوپیس اپنے ساتھ لے جانے کی نیت سے الگ کیے جو وہ برسوں سے سنبھالے ہوئے۔

چلے جانے والوں کا سامان دیکھتے ہوئے زندگی کی بے ثباتی کا احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے۔ ادھورے کام، کل پر اٹھا کے رکھے کاموں کی فہرست، کسی خاص موقعے کے لیے رکھی گئی چیزیں، دواؤں کے استعمال شدہ اور نئے پتے، ان سلے جوڑے، ان کی چپلیں۔

کیا کچھ نہیں تھا جو اسے رلا رہا تھا۔ ماں کی پسند، شوق اور خواب سمیٹتے ہوئے وہ ان کے لیے مسلسل دعا گو تھی۔

سب سے آخر میں لاکر سے ان کے زیورات نکالے۔ وہیں اسے پرانے طرز کا لکڑی کا خوب

صورت نقش ونگار سے مزین ڈبہ ملا۔ اس کی بناوٹ صندوق کی طرح تھی جس پر ننھا سا قفل بھی لگا ہوا تھا۔ چھوٹی سی چابی بھی اسے لاکر میں ہی مل گئی۔

اس نے ڈبہ کھولا تو اندر وقت کے ستم سے زرد ہو چکے لفافے جانے کب سے قید تھے۔ سارے لفافے بند تھے، ان پر پتا لکھا تھا لیکن کسی ڈاک خانے کی سیل نہیں تھی۔ اس نے باری باری سب دیکھ ڈالے، وہ کل بیس لفافے تھے جو سب کسی "صبیح الحسن" کو ارسال کرنے تھے لیکن اب تک اس صندوقچی میں بند تھے۔

"پھوپھو!" دروازے میں کھڑی کنزئی نے اسے پکارا "ڈیڈی کھانے کے لیے بلا رہے ہیں۔"

"دو منٹ میں آرہی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایسا لگتا ہے، دادو اب بھی یہیں کہیں ہیں۔" اس نے کمرے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔

"مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔" اس نے کہا اور اسی وقت ایک فیصلہ کرلیا۔

وہ میز پر آئی تو ساتھ زیورات تھے۔

"یہ مما کے لاکر میں تھے۔" اس نے سب ڈبے بھائی کے آگے رکھ دیے۔

"میں نے سوچا ہے، میں اپنا سامان مما کے روم میں شفٹ کر کے اپنا روم خالی کر دیتی ہوں۔" اس نے بھابھی کو دیکھا۔

"کھانے کے بعد ملازمہ کے ساتھ مل کر کر لوں گی، کپڑے، کتابیں اور نیمل ہی ہیں۔"

"جیسا تم چاہو، آخر تمہارا گھر ہے۔" وہ کبھی جتانا نہیں بھولتی تھیں کہ وہ اکیلی ایک بڑے سے گھر میں رہتی ہے، بھلے وہ سرکاری کوارٹر تھا۔ یہ گھر بھی بڑا تھا لیکن مکین بھی زیادہ تھے۔ بھائی بھابھی اور ان کے چار بچے۔ نیچے کمروں کی تعداد محدود تھی۔ ایک اس کا کمرہ تھا اور دوسرا مما کا، لہٰذا مہمانوں کو بھی اوپر ٹھہرانا پڑتا تھا۔ ایسے میں جب بھابھی کے امی ابو چند دن رہنے کے لیے آتے تو زینے چڑھنا اترنا ان کے لیے مشکل ہو جاتا۔ ہفتہ بھر کا کہہ کر آئے وہ دونوں تین چار دن میں ہی لوٹ جاتے تھے۔ بھابھی کی نیت اسے پتا تھی کہ وہ مما کا کمرہ اب ان کے لیے مختص کرنا چاہتی ہیں اس لیے اس نے اسے اپنا کمرہ بنایا کہ وہ ماں کی خوشبو اور یادوں سے سجا کمرہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔ بھابھی کو بس نیچے ایک کمرہ چاہیے تھا، سو وہ بھی خوش تھیں۔

"تم مما کی جیولری رکھنا چاہو تو لے لو۔" بھائی نے کہا اور بھابھی نے خود کو روکنے کے لیے سختی سے منہ بند کرلیا۔ اکلوتی، لاڈلی بہن تھی، اگر وہ سب مانگ لیتی تو بھی ان کے شوہر نے اٹھا کے دے دینا تھا۔

"ان میں سے کچھ نہیں لیکن مما جو ہمیشہ پہنے رہتی تھیں وہ چین اور کنگن چاہیے مجھے۔" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ بھائی نے بیوی کو دیکھا۔

"وہ رکھے ہیں، کھانے کے بعد دیتی ہوں۔"

کنگن اور چین کے مقابلے میں میز پر رکھا زیور بلاشبہ زیادہ تھا۔ انہیں کسی چیز کی کمی نہیں تھی لیکن ساس نند کے لیے ان کے جذبات روایتی ہی تھے۔

"تم نے حرید لیو کے لیے میل یا فون کیا؟" کھانے کے دوران انہوں نے پوچھا۔

"نہیں، میں اب جاؤں گی فی الحال خود کو بزی رکھنا ضروری ہے۔"

وہ دو ہی بہن بھائی تھے۔ متمول گھرانہ تھا۔ پاپا نے پھلتا پھولتا کاروبار اور کئی اثاثے چھوڑے تھے جو اب بھائی سنبھال رہے تھے۔ اس نے ایم بی بی ایس کے بعد اسپیشلائزیشن کے لیے جنرل سرجری کو چنا تھا۔ حسن ذہانت، مال و دولت اور وسائل کی فراوانی کے باوجود زندگی نے ہمیشہ اسے ایک ایسی ٹیڑھی میڑھی ڈگر پر رکھا تھا کہ ذاتی زندگی میں اطمینان کبھی دیرپا نہیں رہا تھا۔

اتنے اتار چڑھاؤ آئے تھے کہ اب وہ انتہائی سست قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔

اب اس نے زندگی میں توقعات اور امیدوں

کے ساتھ ساتھ لوگوں سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

تمام عمر اس کے ہر فیصلے میں مما نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ انہوں نے کبھی اپنی ممتا کی دہائی دے کر یا لوگوں کی باتوں کا خوف دلا کر اسے مرضی کے خلاف کچھ کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ وہ اپنا اسپتال کھولنے کے قابل تھی، اس وقت بھی، وہ ایک نامور اور سب سے بڑے اسپتال سے منسلک تھی جب اس کی گوشہ نشینی کی نئی نئی خواہش نے اسے سب سے دور جانے پر اکسایا۔

ایک سال پہلے جب اس نے قریب کے چھوٹے سے شہر کے سول اسپتال میں بطور سرجن کام کرنا قبول کیا تو ہر کسی نے مخالفت کی تھی سوائے مما کے۔

رات تک وہ اپنا سامان مما کے کمرے میں لے آئی تھی۔ وہ سونے جا رہی تھی کہ بھائی دستک دے کر اندر آگئے۔

''صبح نکلنا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔ وہ آنے جانے کے لیے خود اپنی کار ڈرائیو کرتی تھی۔

''جی فجر کے بعد ہی نکل جاؤں گی۔ ٹریفک نہیں ہوگا، آٹھ بجے تک پہنچ جاؤں گی۔''

''مما چاہتی تھیں، تمہارا اپنا ہاسپٹل ہو، وہ اس کے لیے تمہارے خود سے کہنے کا ویٹ کر رہی تھیں لیکن مجھے ہاسپٹل کی تیاریوں کے لیے بھی کہہ رکھا تھا۔'' وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھے تھے۔

ماں کی یہ خواہش وہ بھی جانتی تھی اور اس نے وعدہ بھی کیا تھا کہ کچھ سال بعد یہ ہی اس کا بھی ارادہ ہے۔

''میں نے زمین خرید رکھی ہے، جب تم کہو ضروری پرمیشن وغیرہ کی فارملیٹیز بھی مکمل ہو جائیں گی۔ یہاں کے ٹاپ موسٹ ہاسپٹل میں تمہارے لیے جاب بھی موجود ہے، تمہارے کہنے کی دیر ہے۔ میں تمہاری اجازت کے بنا کچھ نہیں کروں گا۔'' وہ تھوڑا رکے۔

''لیکن تمہاری شادی ہم سب کا خواب ہے۔ پرانی باتیں بھول کر تمہیں موو آن ہوتے دیکھنا، ہم سب کو خوشی دے گا۔ تمہارے لیے میری نظر میں کوئی ہے، میں چاہتا ہوں، تم ایک بار اس سے مل لو۔ جب تم خود کو اس کے لیے ریڈی پاؤ، مجھے بتا دینا۔''

ماں کے بعد اب وہ ہی اس کے سرپرست تھے اور اسی حیثیت سے بات کر رہے تھے۔

اس نے انہیں یقین دلایا کہ جب اس کا ارادہ ہوگا اور دل بھی راضی ہوگا، وہ انہیں بتا دے گی۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ وہ بستر چھوڑ کے باہر آیا۔ حسب توقع ٹی وی بند تھا۔ اس نے کمرے میں جھانکا تو ابا وہاں موجود نہیں تھے۔ وہ نماز کے بعد چہل قدمی کو جاتے اور واپسی میں تین چار اخبار لے کر آتے۔ اس نے اپنے لیے کافی بنائی اور ان کے کمرے میں آگیا۔ ابا کے کمرے کی کھڑکی اس گھر میں اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ اس کھڑکی سے نظر آتا منظر کسی نظم سے کم نہیں تھا۔ گیٹ سے لگ کر کھڑا پلاش کا درخت، نیچے اترتا آتا پگڈنڈی سا رستہ جس پر انسانی قدموں کے علاوہ کبھی کبھار اس کی کار کے ٹائر نشان بناتے تھے، اور اس کے دونوں جانب جنگلی جھاڑیوں پر لگے رنگ برنگے پھول۔ یہ منظر بہت کم بدلتا تھا اور جب بدلتا تو دلکشی کم نہیں ہوتی بس نظم کا عنوان بدل جاتا تھا۔ ابا جب بھی اسے اس کھڑکی سے اس قدر محویت سے باہر تکتے دیکھتے تو کہتے تھے۔

''تم اس منظر اور درخت کو پینٹ کیوں نہیں کرتے؟''

''ضرور کروں گا ابا۔'' وہ ہر بار کہتا۔

اب بھی کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے وہ کھڑکی سے اس منظر کو ایسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے لوگ اس کی تصاویر کی نمائش میں فن پارے سے نئے معنی اخذ کرنے کے لیے غور کرتے تھے، پھر ایک ایک راز پانے اور ہر انوکھے انکشاف پر نئے جوش سے اسے

سراہتے تھے۔

اسے خوبصورت، ہلکی سی چیزیں اور لوگ اپنی طرف کھینچتے تھے۔ اس جگہ سے اس کی انسیت بھی اپنی رومان پرور طبیعت کی وجہ سے تھی یا پھر اس جگہ قدم قدم پر بکھرے عشق کے نظاروں نے اسے رومان پرور بنا دیا تھا۔

اسے یہاں کے ہر منظر میں محبت دکھائی دیتی تھی۔ کہساروں کے سروں پر بدمست ہو کر اتراتے بادل جو بھی ترنگ میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے اور پھر اپنی اس بے باکی پر حیا سے پانی پانی ہو جاتے تو کبھی جھوم کے، جھک کے پہاڑوں کے سروں کو چوم کر خود کو فنا کر لیتے۔

یہاں کا کسک جگاتا سرد موسم، کھڑکیوں سے جھانکتی برف میں آتش دان میں چٹختی لکڑیوں سے نکلتی چنگاریوں سے دل میں اٹھتی ہوک یا پھر طلائی دھوپ کے سایے میں مسکاتے پھولوں کا نور، اسے یہاں ہر سو محبت کی ترجمانیاں نظر آتی تھیں۔

جانے کب کس منظر نے اس کے اندر وہ خواہش اور انتظار جگایا تھا جو آج تک اس کے ساتھ تھا کہ کسی دن کوئی اس سے ٹکرائے گا جسے دیکھتے ہی دل گواہی دے گا کہ یہی ہے وہ! محبت کے گیت گنگنانے کے لیے لازمی دوہرا اسٹر، رقص محبت میں ہم قدم ہو کے جھومنے والا ساتھی۔ وہ دل کی گواہی کے بنا سمجھوتے والی زندگی پر انتظار کو ترجیح دینے والا بندہ تھا۔ خواہشوں کے بے قرار سجدے اپنے صنم کے منتظر تھے اور اس کے قدم عمر کے زینے طے کرتے جا رہے تھے۔

جو اس کے طرز زندگی اور اس کے خیالات سے واقف تھے، اس کی رجائیت پسندی اور خوش مزاجی کو سراہتے تھے۔ اسے اپنے لیے دنیا میں اتاری گئی محبت پر یقین تھا، اسے اس شخص کا انتظار تھا جسے دیکھتے ہی دل نے گواہی دینا تھی۔

اسی یقین کے سہارے وہ عمر کے اس مقام پر کھڑا تھا جہاں لوگ تھک جاتے ہیں، ان میں تنہا رہنے کا حوصلہ یا تو ختم ہو جاتا ہے یا وہ شکست تسلیم کر کے سمجھوتا کر لیتے ہیں لیکن بالوں میں اترتی سفیدی کے باوجود اس کا جوش اور انتظار اب بھی بیس بائیس سالہ مرد سا تھا۔

وہ ہمیشہ ہی خود کو ایک سی کیفیت میں قید پاتا تھا۔ آہستہ آہستہ اسے ادراک ہوا کہ یہ کیفیت انتظار کی تھی۔ طویل عرصے اور یکسانیت نے اسے بھی مایوس کیا تھا نہ وہ اکتایا، جھنجلایا تھا۔ اسے اس میں مزہ آتا تھا۔ یہ اس کے لیے نشہ تھا۔

اسے مصوری کی جانب بھی یہ ہی کیفیت لے گئی تھی۔ اس کی تصویروں میں انتظار ہی ہوتا تھا لیکن یہ اداسی اور تھکاوٹ سے مبرا اور رومان و خوش گواریت کے رنگوں سے سجا انتظار تھا۔

پگڈنڈی سے ابا اور راموکاکا آتے دکھائی دیے تو وہ ان کے کمرے سے نکل کر پورچ میں آ گیا۔

"سامان نکالنا ہے یا نہیں؟" راموکاکا کو یاد تھا۔ وہ ہنستے ہوئے چابی لینے اندر چلا گیا۔ ویسے تو یہاں بھی اس کے کمرے میں 'سامانِ مصوری' ہمیشہ موجود ہوتا تھا لیکن وہ سفر میں بھی سب لے کر چلتا تھا کہ کہیں رنگوں اور برش سے کھیلنے کی خواہش ہو تو وہ رک کر اسے پورا کر سکے۔

☆☆☆

اگلی صبح فجر پڑھ کے وہ اسپتال کے لیے روانہ ہو گئی تھی۔

چھٹیوں نے کئی سرجریز اس کے لیے اکٹھا کر رکھی تھیں۔ اس کی مما کے لیے اسپتال کے عملے نے چھوٹی سی تعزیتی تقریب رکھی تھی۔

اس کے بعد وہ بے حد مصروف رہی۔ اس دوران بھی اسے وہ چھوٹا سا صندوق اور لفافے یاد آتے رہے جو وہ اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

اس نے چائے کا خالی کپ ساتھ والی میز پر رکھا، دونوں پیر پلنگ پر سمیٹے اور سامنے رکھی صندوقچی کو دیکھا۔ وہ اس صندوقچی اور لفافوں کے راز کھولنے

سے پہلے کس وجہ میں تھی۔ ماں کے جانے کے بعد اسے انہیں کھولنے، دیکھنے، یا اس کی گہرائی میں اترنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ فطری تجسس تھا تو جھجک بھی فطری تھی۔

"جب کچھ کرنے کا خیال دل میں آجائے تو کرگزرا کرو زیادہ سوچنے سے فیصلہ مشکل ہوتا ہے اور اکثر بعد میں ہم پچھتاتے ہی ہیں کہ تب کرلیا ہوتا تو اچھا تھا۔ زیادہ سوچ بچار عمل کا صحیح وقت ہم سے چھین لیتا ہے۔" اسے اس وقت امی کی کہی بات یاد آئی۔

ایک گہرا سانس لے کر اس نے صندوقچی کھولی اور سارے لفافے نکال کر اسے ایک طرف سرکا دیا۔ لفافے بند تھے لیکن اتنی طویل مدت تک اس سے کام لیا گیا تھا کہ اب گوند وعدہ خلافی پر حق بجانب تھا۔ اس نے انگلی سے سب سے اوپر والے لفافے کے دونوں جڑے سرے احتیاط سے الگ کرنے کی کوشش کی تو وہ جدا ہوتے گئے۔ اندر جانے وہ کس رنگ کا کاغذ تھا اس وقت میلا پیلا سا تھا۔ اس نے کاغذ کھولا۔

ڈیئر صبیح!

جیسا میں نے کہا تھا، دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے، میں تمہیں ہر حال میں لیٹر لکھوں گی، تو دیکھو، میں برابر لکھ رہی ہوں۔ یہ میرا چھٹا لیٹر ہے۔

میرا نئے اسکول میں اب بھی دل نہیں لگتا۔ نہ میرا کوئی نیا دوست بنا ہے، یہاں اسکول اتنا دور ہے کہ بس سے جاتی ہوں، وہاں کی طرح دوڑتے بھاگتے نہیں پہنچ سکتی۔ مجھے اپنے اسکول کا راستہ روز اتنا یاد آتا ہے کہ بھی بھی بس کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سارا رستہ روتی ہوں۔ مجھے تمہارے بعد ہمارا اسکول اور اس کے پیچھے والا پلاش کا پیڑ سب سے زیادہ یاد آتے ہیں۔

یہاں کہیں بھی پلاش نہیں ہیں۔

میں نے ابو سے پوچھا تھا تو وہ ہنس دیے کہ یہ شہروں میں نہیں ہوتے!

میں سوچتی ہوں شہر ہی کیوں ہوتے ہیں؟ نہ شہر ہوتے نہ ہم یہاں آتے نہ مجھ سے اپنا گاؤں چھوٹتا۔ میں سوچتی رہتی ہوں، تم کیا کررہے ہوگے، کیا نئے دوست بنالیے ہوں گے، اب تم روز کسے پلاش کے پھول دیتے ہوگے۔

صبیح! مجھے نہیں پتا تھا میں یہاں آنے کے بعد تمہیں اتنا یاد کروں گی۔ کیا تمہیں بھی میری اتنی یاد آتی ہے؟

رفعت

اس نے وہ عبارت دوبار پڑھی اور پھر کاغذ موڑ کر لفافے میں ڈال دیا۔ خط میں دن اور تاریخ نہیں بلکہ اوپر 'چھ' لکھا تھا۔ تاہم ہر لفافے پر مکمل پتا درج تھا۔

"آپ نے یہ بچپن سے اب تک پوسٹ کیوں نہیں کیے مما؟"

وہ اتنا جانتی تھی کہ اس کے نانا برسوں قبل اپنا گاؤں چھوڑ کر شہر آبسے تھے۔ اس سے زیادہ اسے نانا یا ماں کی دیہی زندگی کا علم نہیں تھا۔

اس کے والدین کی ازدواجی زندگی بھی ٹھیک ٹھاک ہی تھی۔ ہر شادی شدہ جوڑے کی طرح ان میں اختلاف اور لڑائیاں ہوتی تھیں تو محبت اور اپنائیت کے مظاہرے بھی تھے۔

اس کا خاندان خوش حال تھا۔ لفافے دیکھ کر اس کے اندر جس خیال نے بے قراری بھر دی تھی، وہ پہلا خط پڑھ کے دور ہوگئی تھی۔

"لیکن مما نے یہ ساری عمر سنبھال کے رکھے تو ضرور ان کے لیے بہت خاص ہوں گے۔" اس نے لفافے اوپر نیچے کرتے ہوئے درمیان سے ایک لفافہ نکالا۔ وہ بھی یوں آسانی سے کھل گیا جیسے منتظر ہی تھا۔

صبیح!

میرا کالج بہت بڑا ہے۔ تم نے کہاں ایڈمیشن لیا؟ تم اب ڈاؤن کرتے ہو یا وہیں ہاسٹل چلے گئے ہو؟ دیکھو بھی یون نگری مت چھوڑنا، میں نے کہا تھا

نا، میں آؤں گی ضرور اور مجھ سے پہلے میرے خط بھی۔ اگر میں آئی اور تم نہ ملے تو؟

کیا ہم دوبارہ ملیں گے؟ کب ملیں گے؟ بہت وقت ہوگیا تو کہیں ہمارے بیچ اجنبیت نہ آجائے۔ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ مجھ سے تصور بھی نہیں ہوتا۔

اب میں پڑھ لیتی ہوں دل لگا کے۔ تم نے کون سے سبجیکٹ لیے؟ دیکھو تو ہمیں اب ایک دوسرے کے بارے میں کچھ بھی نہیں پتا۔ تم بھی ناں! عجیب ہو مجھ سے بس خط لکھنے کا وعدہ لیا، وہ بھی یہ کہہ کر کہ مجھے پتا ہے تم بس یہ ہی کرسکتی ہو۔ اگر تم نے فون کرنے سے منع نہ کیا ہوتا تو۔ شاید۔ شاید میں فون کرتی۔

ویسے صبیح! اب مجھے میری سمجھ میں آتا ہے، تم نے فون کرنے سے کیوں منع کیا، رابطے کے لیے بس خط کا کیوں کہا تھا۔ تم بہت زیادہ سوچتے ہو اور بہت آگے کا بھی

ویسے تم نے غلط نہیں سوچا تھا۔

رفعت وہ کاغذ کو تکتی رہی۔ اس کا دل عجیب سا ہونے لگا تھا، ذرا دیر پہلے والا اطمینان غائب تھا۔ چھتیس سال کی عمر نے اسے لفظوں کی گہرائی تک پہنچنے کا ہنر عطا کیا تھا۔ ڈیئر صبیح سے زیادہ معنی خیز صبیح تھا۔

اس نے آہستگی سے کاغذ موڑ کے لفافے میں ڈالا۔

''آپ نے ڈیٹ کیوں نہیں لکھی ہما؟''

حالاں کہ اسکول اور کالج کے ذکر سے سال کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا لیکن اسے بنا دن اور تاریخ کے یہ خطوط بے آرام کررہے تھے۔

اس خط کے بعد اس نے اگلا لفافہ نہیں کھولا۔ ماں کے جذبات جو انہوں نے راز رکھے تھے، اسے انہیں جاننے کا کوئی حق نہیں تھا۔

اس کے تین ماموؤں میں سب سے چھوٹے ماموں ہی زندہ تھے۔ ان کی عمر بھی اب پچھتر سے تجاوز کرگئی تھی۔ اس نے رات انہیں فون لگایا۔

''تمہیں 'پون نگری' کا کس نے بتایا؟'' اس کے منہ سے قصبے کا نام سنتے ہی انہوں نے پوچھا۔

''مما کے سامان میں ان کے اسکول کے وقت کی چند چیزیں تھیں، وہیں یہ نام دیکھا۔''

''اچھا۔ ہمارا بچپن گزرا تھا وہاں۔ ایک ہی اسکول تھا اور سارے بچے وہیں جاتے تھے۔ ابا اور دادا کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ ہماری فیملی ایک طرح سے وہاں کی رائل فیملی تھی۔ سب سے امیر اور آس پاس کے علاقے کے بارسوخ لوگ تھے ہم، دادا ابا کا سیاست میں بھی دخل تھا۔

رفعت کی دوستی بھی زیادہ تر بستی والوں سے تھی۔ لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ باز نہیں آتی تھی۔

وہاں سے شہر آنے کے فیصلے کی ایک بڑی وجہ وہ اسکول ہی تھا۔ ہمارے دادا چاہتے تھے ہم اپنے ہم پلہ بچوں کے ساتھ بڑھیں۔ انہوں نے وہاں دوسرا اسکول بھی شروع کیا تھا لیکن ہم جیسا تو وہاں دوسرا خاندان تھا ہی نہیں۔

شہر آنے کے بعد ہم میں سے کوئی بھی دوبارہ وہاں نہیں گیا۔ ہاں وہاں سے لوگ نوکری یا سفارش کی خاطر ابا سے ملنے آتے تھے۔

ابا اور دادا کبھی کبھار الیکشن کے دنوں میں جاتے تھے کہ وہاں کے سیاست دانوں سے تعلقات تھے اور لوگ ووٹ دینے کے لیے دادا اور ابا کی بات مانتے تھے پھر کچھ وقت بعد جب مکان اور زمینیں بیچ دیں تو 'پون نگری' سے مکمل رابطہ ختم ہوگیا۔

تم نے یاد دلایا تو مجھے بھی اچانک وہ جگہ یاد آرہی ہے، بڑا ہی خوب صورت گاؤں تھا، ویسا حسن پھر کسی جگہ نہیں ملا۔''

اس کے ننھیال میں سب کو ہی خاندانی اور جدی پشتی امیر ہونے کا غرور تھا اور ددھیال بھی ان کا ہم پلہ اور ہم مزاج ہی تھا۔ رشتے اور شادیاں طے کرتے وقت سب سے زیادہ اہمیت اسی بات کو دی جاتی تھی۔ اس کے پاپا فواد کے رشتے کے لیے اسی وجہ سے راضی ہوئے تھے کہ وہ نامور خاندان کا امیر

سپوت تھا۔ بعد کے رشتوں میں بھی اس چیز کو اولیت حاصل رہی تھی۔

وہ رات بہت دیر تک گوگل پر "پون نگری" کی تفصیل چھانتی رہی جو اتراکھنڈ اور اتر پردیش کی سرحد پر چھوٹی سی جگہ تھی۔

ماں کے ماضی کا پردہ اور یہ راز، کسی کو ہلکا سا بھی شبہ نہ ہوا اس حد تک خود تک محدود رکھنے والی ان کی سعی کے احترام میں اس نے مزید خطوط نہ پڑھنا طے کیا۔ اسے لگا ماں کی ان کہی خواہش بھی یہی تھی کہ وہ اس کو نہ کریدے ورنہ کئی ایسے نازک لمحے ان دونوں پر گزرے تھے کہ وہ صاف یا کنایوں میں، اسے کچھ تو کہہ سناتیں۔

اس فیصلے کے باوجود بھی نہ وہ لفافے اس کے دل و ذہن سے نکلے تھے نہ اس بے چینی کا خاتمہ ہو رہا تھا جو صندوقچی کھولنے کے بعد سے لاحق تھی۔ اس کے اندر یہ احساس ہر دن کے ساتھ قوی ہوتا جا رہا تھا کہ اتنے برسوں بعد بھی ان خطوط کی لاکر میں موجودگی اس کی ماں کی خواہش کی ترجمان ہے۔

وہ بھی تو انہیں اس پتے پر پہنچانا چاہتی تھیں ورنہ کیوں سنبھال کر رکھنے کا جوکھم اٹھاتیں۔ جس طرح زندگی نے انہیں مہلت دی نہ کوئی اشارہ کیا کہ وقت پورا ہوا اور نہ شاید وہ خطوط اس لاکر میں نہ ملتے، اس پتے پر پہنچ جاتے۔

وہ دیر تک گزرے لمحات اور مناظر ذہن میں دہراتی رہی کہ ان کی تقریباً کاملیت بھری زندگی میں کہیں تو کوئی لغزش، کوئی کمزوری اس کے ہاتھ لگے جو اس وقت وہ دیکھ اور سمجھ نہ پائی، لیکن اسے کسی راز کا سرا نہ ملا۔

بالآخر اس باب کو ہمیشہ کے لیے بند کرنے کے لیے اس نے لفافوں پر درج پتے پر جانے کا فیصلہ کیا۔ اتنی دور اور نئے راستے پر وہ تنہا کار سے سفر نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے اس نے وہاں پہنچنے کا مختصر ترین راستہ اور ذریعہ دیکھا اور پھر جانے کے ساتھ ہی واپسی کا ٹکٹ بھی بک کر لیا۔

☆☆☆

وہ صبح سے کمرے میں بند اپنے 'سامان مصوری' میں الجھا تھا۔ شام میں نہا کر باہر نکلا تو راموکاکا لان میں کین کی میز اور کرسیاں رکھ رہے تھے۔ یہ اہتمام اس کی موجودگی میں ہی ہوتا تھا۔

"کیا خاص بنایا ہے آج؟"

"کچوریاں اور پکوڑے۔"

"ارے واہ!" اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ جب وہ کمرہ بند کیے کوئی تصویر مکمل کرتا تو بس کافی پیے جاتا۔ یہ پرتکلف چائے کا انتظام اسی وجہ سے ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد ابا بھی باہر آ گئے۔

"آج موسم کچھ زیادہ ہی خنک ہے۔" انہوں نے سوئیٹر پہن رکھا تھا۔

"تمہیں ٹھنڈ نہیں لگ رہی؟ راموسے کہو، جیکٹ لے آئے اندر سے۔"

"ہمیں کم ہی ایسی میٹھی اور کوزی سردیوں کے مزے ملتے ہیں، انجوائے کرنے دیں۔"

"بیمار نہ پڑ جانا، خیال رکھو۔"

تب ہی راموکاکا گرما گرم پکوڑے اور کچوریاں لے آئے۔ ساتھ چٹنی اور کیچپ بھی تھا۔

"آپ بھی آ جائیں، اب کہاں جا رہے ہیں۔"

"چائے لے آؤں، پھر بیٹھتا ہوں۔"

"روحان کا فون تھا۔" ابا نے کچوری توڑتے ہوئے پوتے کے متعلق اطلاع دی۔

"کسی دوست کے ساتھ کل پہنچے گا۔ کہہ رہا تھا چاچو کا فون کہاں گم ہے۔"

ان کی بات پر اس نے جیب سے فون نکالا تو اس کے پیغام اور مسڈ کالز تھیں۔

"یہاں آتے وقت راستے سے اسے کال کی تھی تو کہہ رہا تھا وقت رہا تو آؤں گا، قریب ہی کہیں کسی شادی میں آیا ہے۔" انتساب نے اس کے میسج کا جواب لکھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد راموکاکا تھرموس اور کپ لیے

آ گئے۔

"شادی کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے آپ؟" دفعتاً رامو کاکا نے سوال داغا۔

"بابو جی بھی کچھ نہیں کہتے ہیں۔" ایک ناراض سی نظر انہوں نے مالک پر ڈالی۔ ابا مسکرا دیے۔

"انتساب آزاد ہے، جب جس سے چاہے، شادی کر لے، میں نے کہاں روکا ہے۔"

"روکنا بھی نہیں چاہیے لیکن آپ کو اب تک ان کے لیے لڑکی دیکھ کر شادی کر دینی چاہیے تھی، عمر گزری جا رہی ہے۔"

"اب وہ زمانہ نہیں رہا جب ماں باپ شادیاں طے کرتے تھے۔"

یہ سچ تھا، انہوں نے بھی اس پر شادی کے لیے زور نہیں ڈالا تھا۔ ہاں اس سے ایک بار کہا ضرور تھا کہ تمہیں کوئی پسند ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

"مجھے کوئی پسند نہیں ابا، جس دن ایسا ہوا، میں آپ کو سب سے پہلے بتا دوں گا۔"

اس دن کے بعد سے انہوں نے اس کے سامنے خود سے دوبارہ یہ ذکر نہیں چھیڑا تھا۔

چائے اور پکوڑے کچوریوں کے دور کے بعد رامو کاکا سب سمیٹ کر گھر چلے گئے۔ وہ رات کا کھانا بنا کر جاتے تھے۔

"ایسا لگ رہا ہے قریب پہاڑوں میں کہیں برف باری ہو رہی ہے۔"

سنہری دھوپ بادلوں کے بوجھ سے دم توڑنے لگی تھی اور درجہ حرارت گرتا جا رہا تھا۔

"یہاں بھی آ جائے تو کیا بات ہے!" اسے یہاں کی بارشیں اور برف باری بڑی بھلی لگتی تھی۔

گاڑی کے انجن کی آواز پر وہ دونوں گیٹ پر ختم ہونے والے کچے راستے کی سمت دیکھنے لگے۔ گیٹ سے دور گاڑی رک گئی۔ گاڑی پر لگی زرد بتی اس کے بجھی ہونے سے انکار کر رہی تھی۔ انتساب کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر آئی یسریٰ نے دھڑکتے دل کے ساتھ قدم گیٹ کی طرف بڑھائے۔ درمیانے قد کے ساتھ لمبے قرمزی کوٹ میں شانوں پر جھولتے بالوں اور بھری بھری جسامت والی خاتون پلاش کے درخت کے پاس آ کر رک گئی تھی۔ اس کے گلابی حسن میں تمکنت اور سلیقہ تھا۔ بلاک ہیل والے جوتوں میں پروقار چال چلتی وہ ان کی سمت آ رہی تھی۔ قریب پہنچا انتساب پل بھر کو بت بنا تھم سا گیا تھا۔ کیسا زندہ جاوید منظر تھا، دنیا کی سب سے قیمتی اور سب سے خوب صورت تصویر سے بڑھ کر دلکش۔ جب وہ گیٹ کھول کر اس کے قریب آیا تو اس کا سفر تمام ہوا۔

"مجھے صبیح الحسن سے ملنا ہے۔" اس وقت لاکھ سوچنے پر بھی اسے اس سے موزوں جملہ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ جینز، شرٹ میں ملبوس بکھرے بال والا بے ترتیب مگر پرکشش وہ شخص صبیح الحسن نہیں ہو سکتا تھا۔

"آیئے۔"

وہ بولا اور یسریٰ اندر داخل ہو کر رک گئی۔ ڈھلوان چھت والا قدیم طرز کا مکان تھا جس کے پورچ کے کنارے لگا جنگلا بڑا پیارا تھا۔ چار زینے اتر کر مختصر سا لان پودوں پھولوں سے سجا بڑا خوب صورت تھا۔

اس کی نگاہ سامنے کرسی پر بیٹھے شخص پر پڑی تو کتنے ہی خیال ایک ساتھ وارد ہوئے۔ اس کے اندر نامانوس سی سنسنی پھیل گئی۔

انتساب نے گیٹ بند کیا اور آگے بڑھا، وہ سرخ روش پر اس کے پیچھے چل دی جو زینوں سے گیٹ کے درمیان تھی۔

"انہیں آپ سے ملنا ہے۔" انتساب نے ابا سے کہا جو حیرت سے بت بنے اجنبی مہمان کو دیکھ رہے تھے۔

انتساب ان کے ایسے تاثرات پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ بمشکل ان کے چہرے سے نظر ہٹا پایا۔

"تشریف رکھیے پلیز۔" انتساب نے اسے کرسی پیش کی۔ وہ اپنی بے جان ہوتی ٹانگوں سے

گھبرا کے فوراً بیٹھ گئی۔ انتساب نے بھی ابا کے بازو والی کرسی سنبھال لی۔

"میرا نام یسریٰ مبین ہے۔"

دونوں کی نگاہوں کے حصار میں وہ مشکل سے گھبراہٹ پر قابو رکھے تھی۔

"میں رفعت امان اللہ کی بیٹی ہوں، ان کی وفات کے بعد ان کے روم سے مجھے کچھ خطوط ملے ہیں جن پر یہاں کا ایڈریس درج تھا۔" اس نے اپنے پرس سے وہ ضخیم سا پلندہ نکالا جس کی دریافت نے اسے ایسی بے کلی دی تھی کہ وہ اس وقت ایک انجان جگہ، انجان لوگوں کے درمیان بیٹھی تھی۔

انتساب نے یہ سادہ، پھر بھی الجھی سی بات سن کے اس کے ہاتھ میں دھرے ڈھیروں لفافوں کو دیکھا اور پھر ابا کو اور اسے شدید جھٹکا لگا۔

ان کی بوڑھی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں، لب پھڑپھڑا رہے تھے، زانو پر رکھے ہاتھ کانپ رہے تھے، وہ جس کیفیت سے گزر رہے تھے، اسے چھپانے میں ناکام تھے اور وہ سمجھنے میں مگر چند ثانیے بعد ہی انتساب اپنے باپ کی ان کہی داستان کا عنوان جان گیا۔ یہیں رہنے کی خواہش اور پوسٹ آفس کے چکر۔ وہ ان کا ایقان پا گیا تھا۔

وہ بے ساختہ کرسی پر آگے کھسک آیا، ابا سے کچھ کہنا چاہا لیکن کیا۔ اس نے یسریٰ کو دیکھا جو ہاتھ آگے کیے ابا کو ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی کیفیت بھی انوکھی سی تھی، کچھ حیرانی، کچھ اطمینان، کچھ بے یقینی اور نم ہوتی پلکیں۔ انتساب نے اس کے ہاتھ سے لفافے لیے جو ساٹن کے ربن میں بندھے تھے۔

نرمی سے ابا کی گود میں رکھ دیے۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے کسی متبرک سوغات کی طرح اسے عقیدت سے چھوا اور آنسو گالوں پر لڑھک آئے۔ وہ دونوں ہی سمجھ نہیں پا رہے تھے انہیں وہاں تنہا چھوڑ کر چلے جائیں یا یونہی خاموش بیٹھے رہیں۔

"ابا!" انتساب نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ جیسے کوئی سحر ٹوٹا، وہ چونکے اور احتیاط سے لفافوں کا ڈھیر لرزتے ہاتھوں میں لیا۔

"تم مہمان کو دیکھو، میں اندر ہوں۔" ان کی آواز شدت جذبات سے تھرک رہی تھی۔ وہ بمشکل کھڑے ہوئے اور انہیں دیکھے بنا اندر جانے لگے۔ وہ دروازے تک انہیں دیکھتا رہا۔ یسریٰ بھی پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

"میں چلتی ہوں۔" اس نے یہ تو نہیں سوچا تھا کہ خطوط، لفافے پر لکھے نام کے سپرد کر کے فوراً لوٹ آئے گی لیکن اس وقت ماحول میں پھیلی عجیب سی بے آرامی محسوس کر کے اسے وہاں سے چلے جانا ہی مناسب لگا۔

"میری زندگی کی سب سے انوکھی شام دے کر آپ منٹوں میں رخصت چاہتی ہیں؟" اس کی بھاری اور گہری آواز ہی مقابل کو مرعوب کرنے کو کافی تھی اس پر یہ جملہ۔ یسریٰ کو وہ شخص اوروں سے جدا محسوس ہوا تھا۔ ان دونوں کی شکلوں کی مشابہت سے ان کے رشتے کا اندازہ آسان تھا۔ بالوں میں جھلکتا سفید اور سرمئی رنگ اور بڑھی ہوئی داڑھی اس کی شخصیت پر بھلی لگ رہی تھی۔

"ٹیکسی باہر ویٹ کر رہی ہے۔" اس نے گیٹ کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ اس کی فکر نہ کریں۔" انتساب نے اپنی کار کی طرف اشارہ کیا۔ "ٹرانسپورٹ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"ٹیکسی کو رخصت کر دیں، بلکہ رکیں میں کہہ دیتا ہوں۔" وہ اس کا جواب سنے بنا لمبے ڈگ بھرتا گیٹ سے نکل کر ٹیکسی کے پاس چلا گیا۔

یسریٰ ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔ یہاں تک آ جانے اور صبیح الحسن کا ردعمل دیکھنے کے بعد وہ اس وقت خود کو جذباتی اور جسمانی طور پر کچھ کرنے کے قابل نہیں پا رہی تھی۔

انتساب نے اگلی کھڑکی میں جھک کر کچھ کہا، پھر پچھلا دروازہ کھول کے نشست سے اس کا چھوٹا سا ٹرالی بیگ باہر نکالا۔ اس کے بعد کار ریورس

کرنے میں ڈرائیور کی مدد کی اور ٹیکسی کے ڈھلان سے نیچے جانے کے بعد بیگ گھسیٹتا واپس آ گیا۔

"آپ شاید لمبا سفر کر کے آئی ہیں، پلیز اندر چلیں۔"

ڈرائیور نے اس کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ وہ اسے کسی ہوٹل سے نہیں بلکہ ریلوے اسٹیشن سے سیدھا یہیں لے کر آیا ہے اور سب سے قریبی ریلوے اسٹیشن بھی دو گھنٹوں کی مسافت پر تھا۔

وہ متامل ہوئی پھر مقابل کا اخلاق اور اس کی آمد نے جو صورت حال پیدا کی تھی، اس کے مدنظر کچھ کہے بنا اس کے ہمراہ اندر جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ وہاں خاموشی تھی اور اب تک کسی تیسرے شخص کا ظہور نہیں ہوا تھا، اس بات نے اس کی گھبراہٹ کچھ کم کر دی تھی۔ اندر آنے کے بعد اسے ہال میں بٹھا کر وہ خود باورچی خانے میں چلا گیا۔ ابا کے کمرے میں جانا اس وقت مناسب نہیں تھا۔

صوفے پر بیٹھی یسریٰ نے اطراف کا جائزہ لیا۔ پرانے طرز کا ویسا ہی مکان تھا جیسا اس نے فلموں میں پہاڑی علاقوں کا دیکھ رکھا تھا۔ لکڑی کا استعمال زیادہ تھا، چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بہت سی تھیں اور اس وقت ساری کھلی تھیں۔ اتنی سرد ہواؤں میں بھی ان کے پردے ایک طرف کھنچے تھے۔ دیواروں پر تصاویر، کیلنڈر، گھڑی تھی، کتابوں کی الماری اور دروازوں والی کنسول میز، جس میں ایک پرانے اخبار کا ڈھیر تھا۔ اسے سب سے زیادہ دلچسپ آتش دان لگا۔ اصل زندگی میں وہ اسے پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ دائیں بائیں دو دروازے تھے اور باورچی خانے کے بغل میں راہداری جہاں آگے بھی دروازے دکھائی دے رہے تھے۔

"جانے انکل کس روم میں ہیں۔ ان کا ری ایکشن تو کہہ رہا تھا، انہیں انتظار تھا، یہ لیٹرز ان ایکسپیکٹڈ نہیں ہیں۔ سارے لیٹرز پڑھنے میں ٹائم لگے گا، کیا اس کے بعد وہ مجھے مما اور اپنا ماضی بتائیں گے، ان کے درمیان کا رشتہ، ان خطوط کے پوسٹ نہ ہونے کی وجہ۔ کیا مجھے سب سننا چاہیے؟ کیا میں وہ سب سننا چاہتی ہوں۔؟" وہ بے ربط سوچوں میں گھری تھی۔

کچھ دیر بعد احتساب مائیکرو ویو میں گرم کیے گئے پکوڑے، کچوری اور اپنے ہاتھ سے بنائی کافی ٹرے میں رکھے ہال میں داخل ہوا۔

"میں احتساب الحسن اور آپ جن سے ملنے آئی ہیں وہ میرے والد ہیں۔" ٹرے میز پر رکھتے ہوئے اس نے اپنا تعارف کروایا۔ یسریٰ خفیف سا مسکرائی۔

"آپ تکلف نہ کریں، ڈرائیور نے بتایا آپ اسٹیشن سے ڈائریکٹ آئی ہیں۔" مگ اس کی طرف بڑھا کر احتساب نے کہا۔

"شکریہ۔" یسریٰ نے مگ لے لیا۔ کچھ دیر وہ دونوں خاموشی سے کافی پیتے رہے۔ دونوں ہی اس عجیب صورت حال پر مختلف خیالوں میں گھرے تھے۔ یسریٰ نے کافی کے علاوہ کچھ نہ لیا، احتساب نے بھی اصرار نہیں کیا۔

"یہاں آپ اور انکل اکیلے رہتے ہیں؟" شام کے وقت گھر میں پھیلی خاموشی اس بات کی گواہی دے رہی تھی لیکن اسے اس میں شک تھا۔

"پچھلے ستائیس سال سے ابا اکیلے رہتے ہیں، اس سے پہلے ہم بچے ان کے ساتھ تھے اور اس سے پہلے امی بھی۔" وہ کہنی کرسی پر ٹکائے دونوں ہاتھوں میں مگ لیے آگے کو جھکا ہوا تھا۔

"ابا کی ساری عمر یہیں گزری ہے۔" اسے ادراک تھا کہ اس وقت وہ جو کہہ رہا ہے، وہ بھی اس کتاب کا باب تھا جو آج یسریٰ کی آمد نے کھولی تھی۔

اچانک تیز ہوائیں چلنے لگیں اور باہر جیسے کسی نے آسمان پر سیاہ چادر کھینچ دی۔ احتساب نے اٹھ کر ساری بتیاں جلائیں اور کھڑکیاں بند کیں۔ یسریٰ نے کوٹ کو اچھی طرح لپیٹا۔ اسے اب کوٹ میں بھی ٹھنڈ لگ رہی تھی۔

"آپ کی مدر کا سن کر افسوس ہوا، کیا وہ بیمار

تھیں؟" واپس آکر اس نے پوچھا۔
"نہیں، سوتے ہوئے ہی وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔" یسریٰ نے مگ میز پر رکھ دیا۔
"شکریہ کہ آپ نے ابا کی امانتیں ان تک پہنچا دیں، اسکینڈل کے ڈر سے عموماً لوگ ایسا کرتے نہیں ہیں، خطوط دینے آپ یہاں تک آئیں، مجھے بہت اچھا لگا۔" اپنی مخصوص آواز میں نرمی سے کہتے ہوئے اسے اندازہ نہیں تھا، وہ کیسا سحر انگیز لگ رہا ہے۔
"اسکینڈل کا ڈر مجھے بھی تھا اسی لیے میں نے کسی کو ان کے بارے میں بتایا ہے نہ کسی کو میرے یہاں آنے کی خبر ہے۔" وہ خفیف سے تبسم کے ساتھ گویا ہوئی۔
انتساب نے مڑ کر ابا کے کمرے کے دروازے کو دیکھا۔
"میں بھی خوش ہوں کہ اس وقت میرے علاوہ یہاں کوئی اور موجود نہیں۔"
تب ہی بوندوں نے کھڑکیوں کے سے ٹکرا کر پیارا سا شور برپا کر دیا۔ انتساب تیزی سے کھڑا ہوا۔
"ابھی آیا۔" لان سے کرسیاں اور میز اٹھا کر پورچ میں رکھتے ہوئے وہ بھیگ گیا تھا۔
"موسم اچانک ہی بدل گیا ہے۔" صوفے کے ہتھے پر رکھے چھوٹے سے تولیے سے بال رگڑتے ہوئے اس نے یسریٰ سے کہا جو اپنے فون پر جھکی تھی۔
"کیا ہوا؟" اس کے گلابی چہرے پر پھیلی فکر مندی انتساب نے بھانپ لی تھی۔
"میں اپنی ٹرین ٹریک کر رہی تھی، وہ ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ تھی لیکن اب نظر ہی نہیں آ رہی ہے۔"
"کینسل ہوگئی ہوگی۔" اس نے اطمینان سے کہا۔
"آں؟" اس نے جھٹ سر اٹھا کے انتساب کو دیکھا۔
"پہاڑی علاقوں میں اکثر موسم کی زیادتیاں راستوں کو بھگتنا پڑتی ہیں۔ اس اسٹیشن کے لیے کینسل ہوئی ہوگی، یعنی اس کا روٹ چینج کر دیا گیا ہوگا۔"
"پھر اب؟" وہ ایک دم پریشان ہوگئی۔
"آپ ٹرین کا نمبر دیں، میں پتا کرتا ہوں۔"
یسریٰ نے فون میں دیکھ کر نمبر پڑھا۔ انتساب نے نمبر دہرایا اور اٹھ گیا۔
"فون کمرے میں ہے۔" وہ راہداری والے ایک کمرے میں چلا گیا۔
رات گیارہ بج کر پچاس منٹ اس کی واپسی کی ٹرین کا وقت تھا۔ اس نے اسپتال سے چھٹیاں تو تین دن کی لی تھیں لیکن اس کا رکنے کا ارادہ قطعی نہیں تھا۔ اس کے اندر بہت تجسس اور کئی سوال تھے مگر اب صبیح الحسن سے مل لینے کے بعد اس کا دل راضی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ان کی زبانی الف سے بے سب کچھ سنے۔ ان دو خطوط کا متن اس کے لیے کافی تھا۔
اسے صبیح الحسن کے ردعمل نے حیران کرنے کے ساتھ ساتھ دل کو سکون عطا کیا تھا، ایسا سکون جس میں اداسی کی آمیزش تھی۔ اگر اس کی مما نے وہ خطوط بھی تو ان تک پہنچیں گے اس ارادے سے رکھے تھے تو وہ غلط نہیں تھیں کہ وقت کی دیوار کے دوسری طرف انہیں اسی پذیرائی کی توقع تھی۔
وہ راہداری کے دروازے پر نظر ٹکائے خود سے باتیں کر رہی تھی، انتساب کے آنے کی آہٹ پر چونکی۔
"بارش اور متوقع برف باری کے پیش نظر اس جانب آنے والی سبھی ٹرینوں کے روٹس بدل دیے گئے ہیں۔" یسریٰ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔
"کب تک کے لیے؟"
"فی الحال اس کا علم نہیں اگر حالات سنبھل گئے تو روٹین کی سب ہی ٹرینیں فوراً شروع ہو جائیں گی۔"
"اور اگر نہیں سنبھلے تو؟" اس نے پریشانی سے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ انتساب کو اس کی تشویش سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ بتا چکی تھی وہ چھپ کے یہاں آئی ہے۔

آپ ایک دو دن کے لیے کوئی تو بہانا بنا کر آئی ہوں گی، اب اسے ہی مزید دو دن کے لیے بڑھا لیں۔" اس نے مشورہ دیا اور یسریٰ ایک دم ٹھٹھک کے اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس کی پریشانی کی وجہ گھر والوں سے چھپ کر آنا سمجھ رہا تھا۔

"میں جاب کے سلسلے میں گھر سے دور ہوتی ہوں۔ بھائی بھابھی کے لیے میں اب بھی وہیں ہوں۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔" وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ یسریٰ نے پھر بے چینی سے پہلو بدلا۔

"آپ تب تک ہمیں میزبانی کا شرف بخشیں اور یہاں کا حسن انجوائے کریں۔"

انتساب کی پیشکش پر وہ مسکرائی لیکن اس تبسم میں سچائی نہیں تھی۔ وہ یہاں رکنا ہی تو نہیں چاہتی تھی۔

"اگر آپ یہاں نہیں رہنا چاہتیں تو نیچے چند معقول ہوٹلز ہیں، میں آپ کو وہاں ڈراپ کر دیتا ہوں۔" انتساب کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"ایسی بات نہیں ہے۔" اس کا اندازہ ایسا درست تھا کہ اس نے شرمندگی مٹانے کے لیے جھٹ سے کہا۔

"تو پھر آئیں، آپ کمرے میں سیٹل ہو کر آرام کریں۔" وہ پھر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ متامل تھی لیکن اب انکار کرنا بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اسے کمرے تک پہنچانے آگے چل پڑا تو اسے تقلید کرنا پڑی۔ وہ خود کو ڈانٹ رہی تھی کہ پہلے تو اندر آئی اور اب کمرے میں جا رہی تھی۔

شکر تھا راموکاکا نے آج ہی روحان اور اس کے دوست کے لیے کمرے تیار کیے تھے۔ کچھ دیر پہلے اسے روحان کی کال موصول ہوئی تھی کہ خراب موسم کی وجہ سے ان کا ادھر آنے کا منصوبہ ملتوی ہو گیا ہے۔

وہ اسے دروازے تک پہنچا کے پلٹ گیا۔

دروازہ بند کر کے وہ بیگ ... کے پاس آئی۔ اس کے پاس سرد موسم والے کپڑے نہیں تھے۔ کوٹ اس نے یہاں کا درجہ حرارت دیکھنے کے بعد خاص طور پر خریدا تھا۔ بال او نچائی پر پلیٹ کر ان کے گرد ہیئر بینڈ لگاتے ہوئے وہ کھڑکی کے پاس آئی۔ باہر اندھیرے میں برستی بارش کا شور تھا۔ ٹھنڈ اس قدر تھی کہ جلد ہی پلنگ پر بیٹھ کر اس نے رضائی میں خود کو چھپا لیا۔

وہ واپس اپنے کمرے میں نہیں گیا تھا بلکہ ہال میں ہی بیٹھا رہا۔ اس نے مغرب کی نماز بھی وہیں پڑھی۔ وہ چاہتا تھا جب ابا کمرے سے نکلیں تو انہیں ہال خالی نہ ملے۔

یسریٰ نے نماز پڑھی پھر اسپتال فون لگا کر مریضوں کا احوال جانا۔ جب بھوک کا احساس ستانے لگا تو وہ باہر نکلی۔

اسی وقت صبیح الحسن بھی دروازہ کھول کر ہال میں داخل ہوئے۔ انتساب اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے دونوں کو باری باری دیکھا پھر یسریٰ سے مخاطب ہوئے۔

"میں یہ ہی کہنے آیا تھا کہ اس موسم میں آپ نہ جائیں۔" وہ اب سنبھل گئے تھے تاہم ان کی آنکھیں ذرا دیر پہلے ہوئی برسات کی شاہد تھیں۔

"آج کی ٹرینیں کینسل ہو گئی ہیں۔" یسریٰ آگے آئی۔ اس کا دل گداز ہو رہا تھا۔ اس کی مما کے لیے اہم یہ شخص واقعی اہمیت کا حامل تھا، یہ سچائی اسے عجیب سی کیفیت میں مبتلا کر رہی تھی اور اس احساس کے پیچھے سے جھانکتی وجہ وہ جان بوجھ کر نظر انداز کیے ہوئے تھی۔

"تم نے انہیں چائے، کافی، کھانا کچھ دیا؟" انہوں نے بیٹے کو دیکھا۔

"جی انکل۔ آپ اس کی فکر نہ کریں، میں نے کافی لی تھی۔" وہ ذرا ٹھہری پھر انتساب کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"لیکن اب مجھے بھوک لگی ہے۔" اس نے

آہستہ سے رک رک کے کہا۔

"ڈنر ریڈی ہے، آئیں۔" ابا اسے لیے کھانے کی میز پر آئے اور انتساب نے کھانا لگایا۔ یسریٰ کی مدد کی پیشکش ان دونوں نے سہولت سے رد کردی تھی۔ اس وقت کھڑکی، دروازے سب بند تھے اس لیے سردی بھی کچھ کم تھی۔ کھانے کے دوران وہ اس سے عام سی باتیں پوچھتے رہے اور اس کے جواب انتساب بغور سنتا رہا۔

انہوں نے اس کی مما کے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی۔ ان سے باتوں کے دوران اسے خیال آیا کہ اس نے انہیں خطوط ماں کی موت کی خبر کے ہمراہ دیے تھے یعنی ان کے اندر بھی وہی اداسی بھرا اطمینان تھا جو فی الوقت اس کے پاس تھا۔

ان دونوں نے برائے نام کھایا کہ شام کے پکوڑے اور کچوریاں ابھی ہضم نہیں ہوئی تھیں اور اس نے جم کے کھایا۔ ٹرین میں اس پر آنے والے وقت کی گھبراہٹ اس قدر سوار تھی کہ کھانا بھی حلق میں اٹک رہا تھا۔

کھانے کے بعد ابا اسے آرام کرنے کی ہدایت دے کر سونے چلے گئے، ورنہ وہ روز کھانے کے بعد اس کے ساتھ کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کرتے پھر کمرے میں جا کر ٹی وی لگا کر کچھ دیر لکھنے کا کام کرتے تھے لیکن آج وہ رکے نہیں تھے اور ان کے کمرے میں ٹی وی بند تھا۔ اس کے لاکھ اصرار کے باوجود انتساب نے اسے کھانے کے بعد میز سمیٹنے نہیں دی۔

"سنگل لائف میں بندہ ان سب کا عادی ہو جاتا ہے۔" پلیٹیں ایک کے اوپر ایک رکھ کے لے جانے سے پہلے اس نے کہا تھا۔

اس کی کافی کی پیشکش پر شکریے کے ساتھ معذرت کرتی وہ کمرے میں چلی آئی۔ اسے لگا تھا اتنی تھک گئی ہے کہ بستر پر لیٹتے ہی سو جائے گی۔ لیکن اب نیند کی جگہ خیال ہی خیال تھے۔

کوئی نہیں جانتا تھا اس وقت وہ کہاں اور کیوں ہے۔ یہ حقیقت ہی اپنے آپ میں سنسنی خیز تھی اس پر مستزاد یہاں صبیح الحسن کا مل جانا اور لفافوں کو دیکھ کر ان کی کیفیت۔

"اصل زندگی میں بھی ایسی باتیں ہوتی ہیں؟" وہ اب بھی بے یقین تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی مما ایسا کوئی راز اپنے سینے اور گھر کے لاکر میں چھپائے ہوئے ہیں۔

"آئی ہوپ مما بھی یہ ہی چاہتی تھیں اور میں نے یہاں آکر ٹھیک کیا ہے۔"

جانے کتنی دیر کروٹ بدل بدل کر وہ تھک گئی تو اٹھ بیٹھی۔ باہر بارش اور ہواؤں کا شور اتنا ہی شدید تھا۔ ٹھنڈ بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ گرم رضائی میں دبکی پلنگ سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔ اکتاہٹ اسے کمرے سے باہر نکلنے کو کہہ رہی تھی لیکن ٹھنڈ اسے روک رہی تھی۔ اس کا لمبا فیشن ایبل سا کوٹ سارا وقت پہننے کے قابل نہیں تھا۔ اس موسم میں فون کا نیٹ ورک بھی ٹھٹھر رہا تھا۔ آخر ہمت کر کے وہ پلنگ سے اتر گئی۔ کمرے کی الماری کھولی تو وہاں چادریں اور شالیں رکھی تھیں۔ انہی میں سے ایک شال اپنے گرد لپیٹ کر وہ باہر آئی جو اس کے اندازے سے زیادہ گرم تھی۔ اس نے ہال میں کتابیں دیکھی تھیں، ارادہ وہاں سے کتاب لے کر کمرے میں آنے کا تھا۔

ہال میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ دبے قدموں وہ الماری تک آئی اور کتابوں کے عنوان دیکھنے لگی۔ اردو انگلش کی فکشن، نان فکشن کی کئی کتابیں تھیں۔ اسے اپنے نصاب کے علاوہ کچھ اور پڑھنے کا شوق نہیں تھا سو ان کتابوں کے متعلق معلومات بھی صفر تھی۔ کافی دیر کتابوں کی قطار پر ہاتھ پھیرنے، ایک کتاب پر رک کے سوچنے، پھر آگے بڑھنے اور پھر پیچھے جا کے آگے بڑھنے کے بعد اس نے آخر ایک کتاب منتخب کر ہی لی۔ کتاب لے کر پلٹی ہی تھی کہ پیچھے باورچی خانے کی چوکھٹ میں انتساب کو دیکھ کر اس بری طرح ڈری کہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ سینے پر ہاتھ

رکھا۔

"سوری۔" اس نے جھٹ معذرت کی۔

"آپ اس قدر انہماک سے انہیں دیکھ رہی تھیں کہ مجھے ڈسٹرب کرنا ٹھیک نہیں لگا۔"

اسے خود بھی 'انہماک' کا احساس تھا۔

"کافی؟" انتساب نے اپنے ہاتھ کا مگ آگے کرتے ہوئے پوچھا۔

"نیند آجائے، اس کوشش میں کتاب لینے آئی تھی۔" اس نے انکار کیا کہ اسے جاگنا نہیں تھا۔

"تو پھر سب سے بورنگ کتاب لیں۔" وہ چوکھٹ سے ہٹ کے آگے آیا۔

"مجھے اپنے سبجیکٹ اور پروفیشن کے علاوہ ساری کتابیں ہی بورنگ لگتی ہیں۔" اس نے ہلکی ندامت کے ساتھ اقرار کیا۔

"آئی وش یہ بیسٹ ٹرنکولائزر ثابت ہو آپ کے لیے۔" اس کی بات پر وہ مسکرادی۔

"گڈ نائٹ۔" انتساب نے کہا وہ بھی جواباً شب بخیر کہتی کمرے میں آگئی۔

☆☆☆

صبح آنکھ کھلی تب بھی سردی اسے رضائی میں دبکے رہنے کہہ رہی تھی۔ بہت دیر بعد وہ ہمت کر کے بستر سے نکلی۔

ہمت کر کے اس نے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کر کے باہر آئی۔ ہال اور باورچی خانہ خالی تھا۔ چھوٹے سے لان کے پھول پودے بارش میں دھل کر نکھر گئے تھے۔

اس نے کل غور نہیں کیا تھا کہ لان بہت اچھی طرح سے سجایا اور سنبھالا گیا تھا۔ ترتیب سے لگے پودے، درمیان کی سرخ اینٹوں والی روش، گاڑی کھڑی کرنے کے لیے سائبان اور مختصر سا گھاس کا قطعہ جہاں کل اس نے صبیح الحسن کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ سبز حصہ اس وقت پانی سے بھرا تھا۔ کین کی کرسیاں پورچ میں رکھی تھیں۔ بارش اس وقت تھمی ہوئی تھی۔

ایک بزرگ کے کمرے میں دستک دے کر ان کے آرام میں خلل ڈالنے سے بہتر تھا، وہ انتساب کو جگا دیتی۔ اس نے دستک دے کر انتظار کیا پھر ہلکے سے دروازے پر زور ڈالا، دروازہ کھلا تھا۔ اندر کے منظر نے اسے ایسا حیران اور مبہوت کیا کہ وہ اس کی غیر موجودگی کا خیال کیے بنا ہی اندر داخل ہو گئی۔

سب سے پہلے اسے کمرے میں ایک عجیب سی بو محسوس ہوئی۔ بڑا سا کمرہ کسی پینٹر کے اسٹوڈیو کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ایک جانب ایزل پر ابسٹریکٹ پینٹنگ لگی تھی۔ اس سے کچھ دور مختلف لمبائی چوڑائی کی کینوس، فریم میں اور دو کینوس چڑھی فریمیں تھیں۔ پاس ہی بڑی سی میز پر چپٹے گول برشوں کا ڈھیر تھا۔ وہ قریب جا کے دیکھنے لگی۔ پینٹنگ نائف، ٹرپنٹائن اور لن سیڈ آئل کی بوتلیں، مختلف رنگوں کی ٹیوبز، کلر پیلیٹ اور جانے کیا کیا تھا۔ کھڑکی کے پاس دیوار پر مختلف رنگوں سے اٹا ایپرن لٹک رہا تھا۔

"مسٹر انتساب الحسن دی ویژول آرٹسٹ!" اس نے دل میں متاثر ہوتے ہوئے کہا اور ایزل کے قریب آئی۔ رنگ ابھی خشک نہیں ہوئے تھے۔ بو ان گیلے رنگوں سے ہی اٹھ رہی تھی۔

پیچھے پلٹی تو وہاں دو مکمل تصاویر دیوار سے ٹکا کر رکھی ہوئی تھیں۔ وہ بھی 'کنٹیمپرری آرٹ' کا نمونہ تھیں۔ وہ پاس گئی اور نیچے بیٹھ کر بغور انہیں دیکھنے لگی۔ اسے آرٹ اور تصویروں کی زیادہ سمجھ تھی نہ ان میں بہت دلچسپی تھی لیکن خوب صورت چیزیں اچھی لگتی تھیں۔ اب بھی اسے ان تصاویر میں اسے رنگوں کا امتزاج اور برش کے اسٹروک بڑے بھلے معلوم ہو رہے تھے۔

عادتاً بنا آواز کیے دروازہ کھول کر باہر نکلا انتساب اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ تولیہ گلے میں ڈالتے ہوئے اس نے کھنکھار کے گلا صاف کیا اور وہ ہڑبڑا کے کھڑی ہو گئی۔ پیشانی پر بکھرے گیلے بال، ڈھیلا پاجامہ اور ٹی شرٹ، اس کا لباس اور انداز کھلنڈرے، لاابالی لڑکے کا سا تھا۔

"سوری۔" وہ شرمندہ سی کہنے لگی۔

"میں یہاں یہ سب دیکھ کر اتنا سرپرائز ہوئی کہ خود کو روک نہیں سکی۔"

"ابا کب سے کہہ رہے ہیں کہ میں دونوں کمرے ملا کر یہاں باقاعدہ اپنا اسٹوڈیو بنالوں لیکن میں اسی سے کام چلا رہا ہوں۔" وہ آگے آیا۔

"میں نے آپ کی محض یہ دو نہیں تین پینٹنگز دیکھی ہیں اور مجھے بہت پیاری لگیں۔" وہ ان تصاویر کو دیکھ رہی تھی اور انتساب اسے۔

فیروزی اور اودے امتزاج کے ڈھیلے ڈھالے آرام دہ کاٹن کے سوٹ کا بڑا سا دوپٹہ ایک شانے پر رکھا تھا جس کے دونوں سرے زمین سے ذرا اوپر تھے، کان کی بالیاں، پیچھے کیچر میں مقید نم سے بال اور کاجل لالی جیسے تکلفات سے پاک اس کا گلابی چہرہ، کوئی اس وقت انتساب کے دل میں مچلتی ضدی سی خواہشیں دیکھ لیتا تو دنیا ایک نئے رومانی انقلاب سے آشنا ہوتی۔ اس کی محویت پر یسریٰ نے اسے دیکھا تو اس نے احتیاطاً نگاہیں ہٹالیں۔

"آپ تو باقاعدہ ایک سیریس مصور ہیں۔"

یسریٰ کی بات پر وہ ہنس دیا۔ اس نے بھی اس کی طرح اب تک نہیں پوچھا تھا کہ وہ کس شہر میں رہتا ہے، کیا کرتا ہے۔

"کبھی اپنا ہاسپٹل شروع کیا ناں تو لابی کے لیے بڑی سی تصویر بنواؤں گی آپ سے۔"

اس نے پھر دیوار سے ٹکے فریم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ انتساب کے اندر بہت سی باتیں ایک ساتھ مچلیں لیکن وہ جانتا تھا، ابھی انہیں کہنے کا صحیح وقت نہیں ہے۔

"آپ کب سے جاگی ہوئی ہیں؟ آپ نے ناشتہ کیا؟" اسے اچانک خیال آیا۔ بارش کی وجہ سے راموکاکا شاید آج لیٹ ہوں۔

"میں نے سوچا، خود ہی ناشتہ بنالوں لیکن پھر یاد آیا کہ چائے کافی کے علاوہ مجھ سے تو آملیٹ بھی ٹھیک سے نہیں بنتا ہے۔" وہ مسکرائی۔ کل کی گھبراہٹ، بے چینی اور اجنبیت دور ہوتے ہی وہ اپنے ازلی دوستانہ اور ہنس مکھ مزاج میں لوٹ آئی تھی۔

"اگر راموکاکا اب تک نہیں آئے ہیں تو آج میں آپ کو مزے دار سے آملیٹ کا ناشتہ کرواتا ہوں۔" اس نے تولیہ گلے سے نکال کر کرسی کی پشت پر پھیلایا اور ہاتھ سے بال ٹھیک کرتا چپلیں پہننے لگا۔

وہ میز پر بیٹھی تھی اور انتساب باورچی خانے میں تھا جب راموکاکا اور ابا ایک ساتھ ہال میں داخل ہوئے۔ اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" انہوں نے ہاتھ میں تھامے سارے اخبار میز پر رکھے اور راموکاکا سیدھا باورچی خانے میں چلے گئے۔

"بارش رک گئی ہے اور نیچے میں نے پتا کیا ہے، ٹرینیں آج رات سے شروع ہوں گی۔"

"مجھے اب دوسری ٹکٹ بک کرنا پڑے گی۔"

"آپ تفصیل لکھ دیں۔" وہ اٹھ کر آتش دان کے پاس گئے اور واپس آئے تو ہاتھ میں قلم اور چھوٹا سا پیڈ تھا۔

"میرے چند جاننے والے ہیں بکنگ آفس میں، فون پر ٹکٹ ہوجائے گی۔"

اس نے ضروری چیزیں لکھ کر انہیں دے دیں۔ وہ پیڈ اور قلم لیے پھر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہ اخبار دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد آکر انہوں نے اطلاع دی کہ اس کے لیے ٹرین اگلے دن دوپہر کی ہی تھی اور اس کی ٹکٹ ہوگئی ہے۔

ذرا دیر بعد تینوں نے مل کر ناشتہ کیا۔ انتساب کے 'اسپینش آملیٹ' کے علاوہ راموکاکا نے اس پہاڑی علاقے کے مشہور 'آلو کے گٹکے' اور پوریاں تیار کی تھیں۔

اسپتال کے کوارٹر میں خانساماں کے ہاتھ کا بنا کھانا کھانے کے بعد اسے گھر کا کھانا ویسے ہی نعمت لگتا تھا۔

"آپ بابا کے ساتھ جا کے اپنی ماتا جی کا اسکول اور ناناجی کا گھر دیکھ آئیں۔" راموکاکا نے

مشورہ دیا۔

انتساب نے اس کا تعارف ہی یوں کرایا تھا کہ وہ ماں کی وفات کے بعد ان کے بچپن کا گاؤں دیکھنے آئی ہے۔ ابا نے بس یہ کہا تھا کہ گھر میں مہمان موجود ہے۔

ان کی بات اس کے دل کو لگی۔ وہ باہر انتساب کا انتظار کر رہی تھی جو گاڑی کی چابی لینے گیا تھا۔ یہ مکان اونچائی پر اور سب سے الگ تھلگ تھا۔ اس کی خستہ حالی چھپی نہیں تھی مگر یہاں اندر یا باہر کی ہر چیز کہتی تھی کہ انہیں بڑی توجہ اور پیار سے سنوارا اور سنبھالا جاتا ہے۔ گیٹ کے باہر موجود پلاش کا پیڑ اور جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے نیچے ڈھلوان غائب ہوتا رستہ بھی خوب صورت تھا۔ وہ جگہ چوڑی تھی لیکن محض چند قدموں کی آوک جاوک کی وجہ سے وہاں پگڈنڈی بن گئی تھی۔

''چلیں۔'' پیچھے سے انتساب کی آواز آئی تو وہ چونکی۔

بارش اور کچی زمین کی مشکل بس نیچے آنے تک تھی۔ نیچے پکی سڑک کی وجہ سے سہولت تھی۔ آبادی بہت کم تھی لیکن سیاحوں کی وجہ سے چھوٹے شہروں والی سہولیات میسر تھیں۔ امی کا اسکول دیکھنے کے بعد انہوں نے انتساب کا اسکول بھی دیکھا۔ اس کے بعد ابا کے بتائے پتے پر پہنچے جو اس کے نانا کا گھر ہوا کرتا تھا۔ وہاں اب پرانی عمارت کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس کی جگہ نیا مکان اور نئے مکین موجود تھے۔ وہ دور سے دیکھ کر ہی پلٹ گئی۔ مما نے کبھی بچپن یا ان جگہوں کا ذکر کیا ہوتا، یا ان سے منسوب کوئی یاد، بات اس کے ساتھ بانٹی ہوتی جو ان کی جذباتی وابستگی ظاہر کرتی تو شاید وہ ان جگہوں کو دیکھ کر جذباتی ہوتی۔

''کیا کسی وجہ سے مما نے دانستہ اسے میری یادوں کا حصہ نہیں بنایا تھا؟'' اس نے سوچا۔

''یا ان کے لیے جگہ نہیں بس ایک انسان اور اس کی بات اہم اور خاص تھی؟؟''

چوں کہ یہاں سیاح آتے رہتے تھے لہٰذا ان کے لیے مقامی بازار بھی تھا۔ انتساب اسے وہاں بھی لے گیا۔ اس نے کچھ خریدا نہیں لیکن سارا بازار دیکھا ضرور۔

☆☆☆

وہ دونوں گھر واپس آئے تو ابا اپنے کمرے میں تھے۔ آج کل ان کے کمرے کا ٹی وی بند ہی رہتا تھا۔ راموکاکا کھانا تیار کر چکے تھے اور اب گھر کی ڈسٹنگ میں مصروف تھے۔

''کافی لیں گے بابا؟'' انہوں نے اس کی عادت کے مدنظر پوچھا۔

''بی بی سے بھی پوچھ لیں۔'' وہ ان کی سادگی پر مسکرایا۔ وہ مہمان سے پہلے اس سے پوچھ رہے تھے۔

''آپ کو جو چاہیے، حکم کریں بی بی جی۔'' وہ مودبانہ اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

''شکریہ۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے، ویسے بھی کچھ دیر میں ڈنر کا وقت ہو جائے گا۔'' وہ مسکرائی۔

''بابا تو کھانے کے ساتھ بھی کافی پی لیتے ہیں۔'' وہ کہہ کر اندر چلے گئے۔ ان کی بات پر وہ ہنس دیا۔

''امی کی وفات کے بعد سے راموکاکا ہمارے ساتھ ہیں۔ پہلے صبح شام آتے تھے اب پورا دن یہیں گزار کر شام میں گھر جاتے ہیں۔''

اس کی بات سنتے ہوئے یسریٰ کی نگاہ آتش دان پر ٹھہر گئی۔ راموکاکا نے اس کی بھی صفائی کر دی تھی۔

ظہر کی نماز کے بعد انہوں نے کھانا کھایا۔ راموکاکا نے اپنے وہاں کی مشہور جھنگورے کی کھیر بنائی تھی جو اسے بے انتہا پسند بھی آئی۔

کھانے کے بعد کام سمیٹ کر راموکاکا اسے ''پون نگری'' کی تاریخ بتانے لگے۔ اسپتال سے فون آیا تو وہ اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔ بات کرتے ہوئے وہ بستر پر لیٹ گئی تھی اور فون رکھتے ہی اس نے

کروٹ بدل کر آنکھیں بند کرلیں۔

شام میں وہ کمرے سے باہر نکلی تو پھر بارش ہو رہی تھی۔ اسے پھر اپنی واپسی کی فکر نے گھیرا۔ راموکاکا جا چکے تھے۔ احتساب ابا کے ساتھ پورچ میں بیٹھا تھا۔

"چائے یا کافی؟" اسے بھی ساتھ بٹھانے کے بعد احتساب نے پوچھا۔

"جو آپ آسانی سے بنا سکیں۔" اس کے جواب پر وہ دھیرے سے ہنستا اٹھ گیا۔ اب صبیح الحسن اور وہ دونوں موجود تھے۔

"راموکاکا چلے گئے؟" خاموشی معنی خیز لگنے لگی تو اس نے پوچھا۔

"جی بیٹا۔ انہیں نائٹ بلائنڈ نیس کی شکایت ہے اس لیے دن کے اجالے میں ہی گھر لوٹنا ہوتا ہے۔"

"یہاں میڈیکل سہولیات میسر ہیں؟"

"پہلے پرائمری ہیلتھ کیئر سنٹر تھا۔ اب ایک سرکاری اسپتال ہے، نجی کلینک کافی ہیں۔ ویسے میں متاثر ہوا ہوں کہ آپ نے ایک چھوٹے شہر کے گورنمنٹ ہاسپٹل میں جاب کو ترجیح دی۔" وہ اس ستائش پر بس مسکرا دی۔

"بہت شکریہ بیٹا۔" کچھ پل کے توقف کے بعد انہوں نے کہا۔

"میں نہیں جانتا، آپ کے یہاں تک آنے اور ان خطوط کو پتے پر پہنچانے کا محرک کیا تھا لیکن میں ہر صورت میں آپ کا ممنون ہوں۔"

"ممانے وہ اب تک سنبھال رکھے تھے، اتنی وجہ ہی کافی تھی۔ اب میں بھی مطمئن ہوں۔" اس کے لہجے میں محبت تھی۔

اسی وقت احتساب کافی لیے آگیا۔

"موسم اچھا ہے، چہل قدمی کے لائق۔" احتساب نے آسمان کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ چلنا چاہیں گی؟"

پھر کافی ختم کر کے وہ دونوں پیدل ہی نکل گئے۔ بارش کی وجہ سے ہوئے کیچڑ کے باعث وہ اسے اپنے دوسرے پسندیدہ اور خوب صورت مقامات پر نہیں لے جا سکتا تھا۔

☆☆☆

رات میں جب وہ کھانا کھا رہے تھے، ایک بار پھر بارش شروع ہوگئی۔

"ٹرین پھر کینسل نہ ہو جائے۔" اس نے سہم کے کھڑکی کی سمت دیکھا۔

"ٹرین والے روٹ پر ہو رہی برف باری رک گئی ہے۔ اس لیے وہ معمول پر ہے۔" ابا نے کہا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

ایک بار پھر بستر پر لیٹ کر اسے نیند نہیں آرہی تھی اور ٹھنڈ غضب کی بڑھ گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر شال اوڑھ کے باہر چلی آئی۔

ہال میں آتے ہی ایسی پیاری تپش نے اس کا استقبال کیا کہ اس کا روم روم دعا دینے لگا۔ سلگتے آتش دان کے پاس کرسی پر بیٹھا احتساب اسے دیکھ کر چونک گیا۔

"آپ اب تک سوئیں نہیں؟ کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

"نیند نہیں آرہی تھی، سوچا یہاں سے پھر ایک کتاب لے لوں۔" آگے آتے ہوئے اس نے شال کے اندر چھپے ہاتھوں سے الماری کی طرف اشارہ کیا۔

"لیکن اب یہ آگ مجھے کہہ رہی ہے، یہیں بیٹھ جاؤں۔" صوفے کے کونے میں سمٹ کر بیٹھتے ہوئے اس نے چپلیں اتار کر پیر بھی اوپر کر لیے۔ احتساب نے بغور اسے دیکھا۔

"دو منٹ، ابھی آیا۔" وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور یسریٰ کا دل کیا اس کی کرسی پر بیٹھ جائے جو آتش دان کے قریب تھی لیکن جس وضع میں وہ بیٹھی تھی اسے بدلنے کا بھی دل نہیں تھا۔ وہ آتش دان کے شعلوں پر نظر جمائے ہوئے تھی جب اس نے صوفے پر اس کے قریب جرابیں رکھیں۔

"آپ یہ پہن لیں۔" وہ کچھ کہتی، اس سے پہلے ہی سیدھا ہو کر اس نے اگلی بات کہی۔

"اس وقت تو آپ کافی سے انکار بھی نہیں کر سکتیں۔" اس نے میز پر رکھا خالی مگ اٹھایا اور باورچی خانے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ دو مگ لیے واپس آیا تو وہ جرابیں پہن کر شال کو لحاف کی طرح اوڑھے تھی۔

"تھینک یو۔" گرما گرم مگ کی دیواروں کے گرد دونوں ہتھیلیاں رکھتے ہوئے اس نے مشترکہ تشکر کا اظہار کیا۔ کافی اور جرابوں کے لیے۔

"یہ موسم آپ کے لیے زیادہ ہی شدید ہے، ہم اس کے عادی ہیں۔"

"جی۔ مجھے آئیڈیا نہیں تھا ورنہ میں انتظام سے آتی۔" اس نے اعتراف کیا۔

"یہ خنکی بے موسم بارش اور اطراف کی برف باری کی وجہ سے ہے ورنہ ان دنوں ایسی شدید سردی نہیں پڑتی ہے۔"

دو گھونٹ لینے کے بعد انتساب نے اسے دیکھا جس کی ساری توجہ مگ پر تھی۔

"کیا آپ ابا سے ان خطوط یا اپنی مدر کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہیں؟" وہ بہت سنجیدہ تھا۔ اب تک ابا نے اس ذکر سے گریز کیا تھا جو اس معاملے میں ان کے موقف کا اظہار تھا اور اس کے بعد وہ ذمہ دار بیٹے کی طرح یسریٰ کا موقف جاننا چاہتا تھا۔ یسریٰ کچھ دیر سوچتی رہی پھر کہنے لگی۔

"اس گھر کے گیٹ پر پہنچ کر بھی میں ڈبل مائنڈڈ تھی کہ یہاں آ کر ٹھیک کیا یا غلط۔! مجھے پہلا ڈر تھا کہ کیا پتا صبیح الحسن حیات بھی ہیں یا نہیں، پھر یہ کہ ان کی فیملی کیسے ری ایکٹ کرے گی، میں نے اپنے گھر والوں سے تو چھپا لیا مگر یہاں خود ہی اسکینڈل کی وجہ نہ بن جاؤں، یہی ریزن ہے کہ باہر انکل کے ساتھ صرف آپ کو دیکھ کر، اس سے پہلے کہ اندر سے مزید لوگ باہر آئیں، میں نے بنا کسی تمہید کے خطوط انہیں دے دیے تھے۔"

"اس نے رک کر کافی کا گھونٹ لیا۔

"میں نے مما کے دو لیٹرز پڑھے ہیں، وہ کوئی لو لیٹرز نہیں تھے، یہ دو دوستوں یا ایک دوسرے کی پروا اور فکر کرنے والوں کے احساس تھے لیکن کچھ خاص بہت خاص۔ میں چاہ کر بھی اس فیلنگ کو جھٹک نہیں پائی اور اسی وجہ سے یہاں ہوں کہ مما نے انہیں سنبھال کے رکھا تھا تو وہ ضرور انہیں اس پتے تک پہنچانا چاہتی تھیں ورنہ ان کے پاس بہت وقت تھا انہیں ڈسپوز آف کرنے کے لیے۔"

"ہم نے ابا کے یہاں رہنے کو ہمیشہ اس جگہ سے ان کی انسیت اور لگاؤ سے منسوب کیا لیکن ان خطوط کے بعد لگتا ہے ابا کے یہاں سے دور نہ جانے کی وجہ یہ ہی تھی۔ وہ اب بھی پوسٹ آفس کے چکر لگاتے ہیں اور ہم اسے بھی ان سے ان کا پرانا رشتہ ہی سمجھتے رہے۔" آگ کی لپٹوں سے ہو رہی نارنجی روشنی میں ان دونوں کے چہرے چمک رہے تھے۔

"مما نے "پون نگری" چھوڑا تب وہ اسکول میں تھیں اور ایک لیٹر میں ان کے کالج جانے کا ذکر تھا، دونوں لیٹر میں ڈیٹ یا ایئر نہیں لکھا تھا۔" وہ اب انتساب کو دیکھ کر بات کر رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے، ان کی عمر نے جب نئے جذبوں کی زمین پر قدم رکھا، ایک دوسرے سے دور ہو گئے، خواہشوں کے نئے رنگ اوڑھنے کے دن آتے ہی جدا ہو گئے ہوں، ان کے درمیان فاصلے پہلے آئے اور آنکھوں میں خواب بعد میں سجے۔ انہیں شاید اس وقت اپنے جذبات کا احساس نہیں تھا یا پھر وہ اس وقت دوست ہی تھے جو دور جانے کے بعد ایک دوسرے کے لیے زیادہ اہم ہو گئے۔"

"آپ انکل سے پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں۔" اس نے تھمی اور مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ اس کے انکار کو سمجھ رہی تھی۔ انتساب اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"یہ ایسے ہی بہت خوب صورت اور مکمل ہے۔ ضروری تو نہیں ہم اسے کوئی نام ہی دیں۔ دنیا میں بنا

کسی توقع، لالچ اور بدلے کی خواہش کے بھی دو انسان ایک دوسرے کے لیے بہت خاص اور اہم ہو سکتے ہیں، اتنے اہم کہ وہ ایک دوسرے کی بات کا پاس رکھتے، یقین کرتے ہوئے ساری عمر گزار دیں۔ ابا کی زندگی کو دیکھتے ہوئے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کوئی تشنگی، کمی یا کسک تھی سوائے اس کے کہ وسائل اور موقعوں کے باوجود اس جگہ کو خیر باد نہیں کہا، انہوں نے عام اور آسودہ زندگی گزاری ہے۔"

"مما بھی ایسی ہی تھیں۔"

"یہ دو خاص انسانوں کا ایک خاص تعلق تھا، ہم اسے اتنا ہی مان کر چھوڑ دیتے ہیں۔" انتساب نے کہا۔

"ہمم۔" اس نے آخری گھونٹ لیا اور جھک کر آگے میز پر رکھنے جا رہی تھی کہ انتساب نے اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"ایڈریس میں پون نگری دیکھ کر میں نے ماموں جان سے پوچھا تھا، انہوں نے بتایا کہ نانا کی فیملی بہت امیر تھی اور وہ اپنے بچوں کو اپنے ہم پلہ بچوں کے ساتھ ہی رکھنا چاہتے تھے جب کہ مما کی دوستی اسکول کے عام بچوں سے تھی۔" اس نے وقفہ لیا پھر بات مکمل کی۔

"کہیں روایتی امیری غریبی کے فرق نے انہیں دور کیا ہو تو؟"

"ہم سوچیں تو ایسے بیسوں منظر نامے نکل سکتے ہیں اور وہ سارے غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ جب آپ مزید جاننا نہیں چاہتیں تو سوچوں کے آگے فل اسٹاپ لگا دیں۔"

"ہاں۔" وہ خجل سی سر جھکا گئی پھر اچانک سر اٹھا کے پوچھا۔

"آپ نے کس خیال کو آخری مان کے فل اسٹاپ لگایا ہے؟"

"محبت کے ان گنت روپ ہیں اور جب تک دنیا قائم ہے جانے کتنے مزید وجود میں آتے رہیں گے۔ ہمیں سب کا علم نہیں اور علم ہو بھی جائے تو ضروری نہیں کہ ہم سب پر ایمان لے آئیں۔ ہر روپ کا اپنا نصاب ہے جسے پڑھنے، سمجھنے کی صلاحیت ہر کسی کے ذہن علم میں نہیں۔ یہ جتنی پیچیدہ ہو سکتی ہے اتنی سادہ بھی۔ دو لوگوں کا ایک دوسرے سے دور اور بے خبر رہتے ہوئے ایک دوسرے کے لیے بے حد خاص اور اہم ہونا بھی اسی کی صورت ہے۔

ان کی زندگی اور دل میں ایک دوسرے کا جو مقام تھا وہ وقت، حالات، فاصلے، بے خبری کسی سے بھی نہ بدلا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی بات کا مان رکھا، اسے یقین بخشا تب ہی ابا نے یہ جگہ نہیں چھوڑی اور آپ کی مما نے خطوط لکھ کر جانے کس وجہ سے پوسٹ نہیں کیے مگر انہیں ضائع بھی نہیں کیا۔ میں نے یہیں فل اسٹاپ لگایا ہے کہ ان دونوں کی زندگی اور دل کا موسم یقین کا تھا کہ ایک دن وہ خط پوسٹ ہوں گے، ایک دن خط انہیں ملیں گے۔ یہ ہمارے لیے معمولی بات ہو لیکن ان کے لیے یہ معمولی اور چھوٹی سی بات ہی سب کچھ تھی، سب کچھ!"

وہ اتنے جذب سے کہہ رہا تھا کہ یسریٰ کو عجیب احساس نے آگھیرا۔

اس دور میں محبت وجت اور کسی کے لیے خاص ہونے پر اسے کہاں یقین تھا۔ مما کے خطوط اور ان کی کہانی کو بھی وہ پرانی نسل کے ساتھ ختم ہو چکا احساس مان رہی تھی، پاکیزہ، ان کہا، ان چھوا جذبہ جو اس دور میں ناپید تھا۔ لیکن وہ درمیانی عمر کا اس زمانے کا بندہ اس قدر سنجیدگی، سچائی اور جذب سے یہ سب کہہ رہا تھا اور جو کہہ رہا تھا اسے مانتا بھی تھا۔

وہ عجائب دماغ سی مسلسل اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ انتساب نے خاموش سی فضا میں اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا ہوا؟" اس نے سنبھل کر پہلو بدلا۔

"مانا یہ کیس منفرد اور یکتا ہے لیکن مجھے دو انسانوں کے بیچ اس فیلنگ کے اس قدر گہرا، سنجیدہ اور دیرپا ہونے پر کم ہی یقین آتا ہے۔ آپ جو کہہ رہے ہیں وہ اس دور میں ناممکن ہے۔"

یہ وہ پہلی دفعہ نہیں سن رہا تھا تاہم اس کی زبانی سننا اسے پہلی بار دل گیر کر گیا۔

"مجھے یقین ہے، یہ اس دور میں بلکہ ہر دور میں ممکن ہے۔" اس کا لہجہ اس کے بیان کی سچائی کا غماز تھا۔

"اور اب میں کہہ سکتا ہوں کہ میری فطرت میں یقین کی آمیزش مجھے ابا کی جانب سے ودیعت کردہ ہے، جیسے وہ متزلزل نہیں ہوئے، میں بھی اس عمر تک منتظر رہنے کے باوجود نہ ہارا ہوں نہ تھکا ہوں۔" اس کا انداز کچھ خود کلامی سا تھا۔

"آپ کو کس کا انتظار ہے؟" یسریٰ کو احساس ہوا، وہ اس شخص کی آواز اور باتوں میں کھو سی جاتی ہے۔

"میرا سنگل اسٹیٹس اور سفید ہوتے بالوں سے یہ نہ سمجھیں کہ میں خشک سا بندہ ہوں۔" وہ مسکرایا۔ "میں ڈائے ہارڈ رومینٹک ہوں۔ مجھے فطرت، قدرت کی ہر تخلیق اور ان کے تعلق میں رومانس نظر آتا ہے، میری پینٹنگز بھی اسی کا اظہار ہے بس اب تک میرے اندر بسی محبت کو وصول کرنے والا حق دار نہیں ملا، مجھے اسی کا انتظار ہے۔"

"مائنڈ مت کیجیے گا لیکن مزید ویٹ سے بہتر نہیں آپ اس یقین پر سمجھوتا کرتے ہوئے لائف پارٹنر منتخب کرلیں تاکہ تصویروں اور خیالوں کے علاوہ حقیقت میں بھی آپ کی زندگی میں رومانس شامل ہو سکے؟" اس نے منطقی بات کہی۔

"ویٹ از ٹائم لیس! (انتظار وقت کی قید سے آزاد ہے) میری زندگی ایک شخص کے انتظار کا دوسرا نام بھی بن جائے تو میں خوش ہوں، انتظار بھی تو رومان ہے۔"

احتساب کے اندر احتجاجی سرگوشیاں ابھر رہی تھیں کہ وہ اب بھی ایسی بات کیوں کر رہا ہے۔

"مجھے آپ کی باتیں حقیقت سے دور لگ رہی ہیں اور میں تسلیم کرتی ہوں کہ یہ میری شارٹ کمنگ ہے، آپ آرٹسٹ لوگ عام انسانوں سے زیادہ حساس ہوتے ہیں، اسی لیے ان کا فلسفہ بھی باقی دنیا سے جداگانہ اور سمجھ سے باہر ہوتا ہے۔"

"آپ رومانس میں یقین نہیں رکھتیں یا رائٹ پرسن کے انتظار کی قائل نہیں؟" اس کے گرد لپٹی میرون شال اور آتش دان کے شعلوں کا اس پر پڑتا نور، اس وقت اس کے حسن کو بڑا مقدس اور ماورائی بنا رہا تھا۔

"میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا۔ شروع سے ہی پڑھائی کے جنون کے ساتھ میں نے ہمیشہ پریکٹیکلی سوچا اور ویسے ہی فیصلے کیے۔" وہ سر جھکا کر شال سے جھانکتے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔

"پھر کچھ ٹریجڈیز ایسی ہوئیں کہ اس موضوع پر کوئی لطیف اور سہانا خیال آیا ہی نہیں۔" احتساب کا دل کیا اس کے پاس جا بیٹھے اور اس کا چہرہ اپنی سمت کر کے پوچھے۔

"میری آنکھوں میں دیکھو، یہاں میرا انتظار سرخرو سا اترا رہا ہے، کیا اسے دیکھ کر بھی تمہارے اندر کوئی لطیف احساس نہیں جاگا؟"

اپنے تصور میں وہ ایسا کر چکا تھا تب ہی یسریٰ نے سر اونچا کر کے اسے دیکھا تو وہ ٹھٹھک کے حال میں آیا۔

"ٹریجڈیز۔؟"

یسریٰ کو احساس ہوا، وہ اپنے مزاج کے برخلاف اس کے ساتھ بڑے آرام سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ معاملہ ہی ایسا درپیش تھا کہ اپنے لیے شجر ممنوعہ مان چکے جذبے پر وہ بول رہی تھی۔

سن رہی تھی۔ اس نے کبھی اس پر کھل کر اظہار خیال نہیں کیا تھا۔ ایسا نہ تھا کہ وہ کم گو اور تنہائی پسند تھی۔ وہ سب کے ساتھ باتیں کرتی تھی لیکن اس کی ساری گفتگو اسپتال، مریض اور اپنے پیشے سے جڑی ہوتی۔

جہاں ذاتی زندگی یا اپنے خیالات پر بات شروع ہوتی، وہ متبسم سامع بن جاتی۔ اسپتال کا عملہ اور اس کے ساتھی ڈاکٹرز بھی اس کی ذاتی زندگی کے

متعلق اتنا ہی جانتے تھے جو سامنے تھا۔

انتساب کی جواب طلب نگاہیں اس پر ٹکی تھیں۔ کچھ تغیر اتنے سلیس اور ہموار ہوتے ہیں کہ ان کے ظہور پذیر ہونے کا احساس یا حیرت کبھی نہیں ہوتی۔ اس پل اپنے ایسے اور دکھ خود تک رکھنے والا اصول پیچھے چلا گیا تھا اور اس کے آگے مختصر سی شناسائی کھڑی تھی، جو بڑی نرمی سے اس کے وجود اور زخموں سے لپٹی قبا کھول رہی تھی۔

☆☆☆

ہاؤس جاب کے دوران اس کی منگنی ساتھ پڑھنے والے فواد سے بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ وہ فواد کی پسند تھی اور اس نے خاندانی روایت توڑتے ہوئے برادری کے باہر رشتہ کیا تھا۔

اس کا معاملہ فواد جیسا نہیں تھا۔ اسے فواد کے پروپوزل سے پہلے اس سے شادی میں دلچسپی نہیں تھی لیکن جب نئے زاویے سے سوچا تو نہ وہ برا لگا نہ اس کا رشتہ اور وہ مان گئی۔

مسائل منگنی کے بعد شروع ہوئے اور جب اس نے جانا کہ فواد کے گھر میں اس رشتے سے کوئی خوش نہیں تھا، خاص طور پر اس کی ممی۔ فواد کی بہن کی شادی کی مختلف تقاریب کے دوران اس نے ان ماں بیٹوں کا رویہ دیکھا اور جھیلا تھا۔

وہ ہر قدم اور ہر موقعے پر اسے باور کراتیں کہ وہ بیٹے کی وجہ سے مجبور تھیں، وہ انہیں پسند نہیں۔

یہ صرف اس حد تک بھی گوارا تھا لیکن جب اس نے انہیں مہمانوں اور رشتے داروں میں بھی یہ ہی کہتے سنا تو برداشت نہیں ہوا۔ اس نے فواد سے صاف کہہ دیا۔

''مجھ سے محبت کا دعوا کرتے ہو تو جیسے سب کو رشتے کے لیے تیار یا مجبور کیا تھا ویسے ہی مجھے میرا مقام اور عزت بھی دلواؤ۔''

اس نے وعدے اور دعوے تو بڑے کیے لیکن عملاً کچھ نہ کر سکا۔ اس کی اہمیت کی نفی کرتا، طنز اور طعنوں سے لبریز ان سب کا ہمیشہ محاذ کھلا رکھنے والا رویہ اسے قبول تھا نہ برداشت، لہٰذا اس نے اپنی طرف سے منگنی ختم کر دی۔

وہ والدین اور بھائی کی لاڈلی تھی۔ ذہانت نے کالج میں بھی پروفیسروں میں اسے ہر دل عزیز رکھا تھا۔ ان سب کے باوجود اس کے مزاج میں غرور، تکبر نہیں آیا تھا لیکن

خود کو اپنی اہمیت اور شخصیت کا احساس تھا۔ اسے رد کرنے یا اس کی نفی کرنے والوں کے درمیان وہ تناؤ اور لڑائی جھگڑے والی زندگی نہیں چاہتی تھی۔ سب نے سمجھایا لیکن اسے ایسا کمزور ہم سفر قبول نہیں تھا جو اسے سمجھوتے کے درس کے علاوہ اور کچھ نہ دے سکے۔

جلد ہی فواد نے اپنی کزن سے شادی کر لی اور وہ اپنے اسپشلائزیشن میں مصروف ہو گئی۔ ایم ایس کے بعد بھی وہ اپنی ڈگریوں میں اضافہ کرتی رہی تھی۔

پھر اس کا رشتہ خاندان میں ہی دور کے کزن سے طے ہوا۔ وہ اعلا تعلیم یافتہ نہیں تھا لیکن دیگر شعبوں میں ہم پلہ ضرور تھا۔ اس نے اس بار گھر والوں کی پسند پر اعتبار کیا۔ وہ مطمئن سی اپنی جاب میں مصروف تھی کہ ایک دن خبر ملی کہ اس کا رشتہ ختم کر دیا گیا ہے۔ اس بار اس کی وجہ پاپا اور اس کے متوقع سسر کے درمیان کی کچھ کاروباری رنجشیں وجہ بنی تھیں۔

ابھی اس بات کو تین ماہ ہی ہوئے تھے کہ پاپا کی وفات ہو گئی۔ اس کے طبقے میں دو منگنیاں ٹوٹنا کوئی قیامت نہیں تھی۔ اس کے لیے پیام آتے رہتے تھے۔ ان ہی میں اس کی مما نے خوب دیکھ بھال کر پروقار اور اپنی فیلڈ کے مشہور نیورو سرجن عارف اقبال کو اس کے لیے پسند کیا۔ جب وہ ان سے ملی تو اسے ان کی پختہ سوچ اور بہترین اخلاق نے متاثر کیا۔ پچھلے برے تجربے اور اپنے اندیشے بھول کر اس نے مما کی پسند کے آگے سر جھکا دیا۔ اس بار منگنی کے بجائے فوراً ہی شادی کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر عارف اقبال سے ملنے کے بعد وہ تو

مطمئن تھی لیکن قسمت کو اب بھی اس کا گھر بسانا منظور نہ تھا۔ نکاح کے بعد رخصتی سے پہلے کسی ایمرجنسی کی وجہ سے اسپتال جاتے ہوئے راستے میں عارف اقبال کی تیز رفتار کار ڈیوائڈر سے ٹکرا گئی اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔

حادثہ جس نازک وقت اور موقعے پر ہوا تھا اس نے اس کا درد، تکلیف اور اثرات کئی گناہ شدید کر دیے تھے۔ دلہن بنی یسریٰ کی ابھی تصویریں ہی بن رہی تھیں کہ وہ بیوہ ہو گئی، کسی کو یقین نہیں آتا تھا۔ اسے لگتا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے، کیوں ہر بار ایک نئے عزم سے مستقبل میں قدم رکھنے کی کوشش نے اس کی شخصیت پر ضربیں ہی لگائی تھیں؟

کئی دن اس کا ذہن سن سا رہا۔ شادی کے ہنگاموں، قہقہوں اور نغموں کے بعد یکا یک ماتم بہت بڑی تبدیلی تھی۔ پچھلی ٹوٹی منگنیاں بھی اب نئے سرے سے دکھ دینے لگی تھیں۔ جب ان کا اثر ایسا شدید اور گہرا نہیں تھا مگر اب ان کے ٹوٹنے نے اس کی روح میں دراڑیں ڈالیں اور دل کو ہمیشہ کے لیے وہموں کے سپرد کر دیا تھا۔

اس نے مان لیا کہ زندگی کا یہ رخ روشن اس کی بصارتوں کے لیے تھا ہی نہیں جہاں کوئی اس کا ہم قدم اور ہم دم ہوتا۔ اسے لگتا کہ شادی کی کوشش کا انجام بھی ماضی جیسا ہی ہوگا۔ تعلیم اور روشن خیالی اسے خود کو منحوس کہنے سے روکتی تھی تاہم وہ مان چکی تھی کہ مقدر نے اس خانے میں سیاہی ہی بھر رکھی ہے۔

اسے یقین ہو گیا تھا کہ چاہت اور رفاقت کے رنگ اس کے لیے نہیں ہیں۔ اسے لگتا اس نے پھر رفاقت کی تتلی کو مٹھی میں قید کرنے کی کوشش کی تو ہاتھ نئے زخموں سے بھر جائیں گے۔

ان ساری مشکلات میں مما اس کا سب سے بڑا سہارا تھیں۔

اسے دوبارہ معمول پر آنے میں بہت وقت لگا اور ایک بار پھر وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں اور زندگی کی طرف لوٹ آئی لیکن اس کی ذاتی زندگی اب انجانے خوف سے سمٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ پھر کوئی تجربہ کرنے اور محبت اور نئے تعلق کو موقع دینے سے خوف زدہ تھی۔ ہر ماں کی طرح مما کی تمنا بھی اسے شادی شدہ زندگی میں خوش دیکھنا تھی۔ وہ اسے مثبت سوچنے پر اکساتیں، برے حادثوں کے بعد بھی اچھے حادثوں کا یقین دلاتیں مگر اس کا دل مانتا ہی نہیں تھا۔ اسے یقین تھا وہ زندگی اس کے لیے نہیں۔

☆☆☆

اگلی صبح دیر سے آنکھ کھلی تو باہر بارش کے بعد کا سہانا موسم مسکرا رہا تھا۔ اس نے کروٹ لے کر کھڑکی کی طرف رخ کیا تو پچھلی رات یاد آ گئی، وہ جھٹ اٹھ بیٹھی۔ اپنی داستان سنانے کے بعد وہ احتساب کو وہیں بیٹھا چھوڑ کے کمرے میں آ گئی تھی۔ اسے اس سے ہمدردی کے بول یا افسوس نہیں چاہیے تھا۔ احتساب نے بھی اسے روکا نہیں تھا۔

"کیا میرا یوں اٹھ کے آ جانا مناسب تھا؟" اس نے بالوں میں ہیئر بینڈ لپیٹتے ہوئے سوچا۔

"کیا میرا اب کچھ کہہ دینا بھی ٹھیک تھا؟" جو پہلی ہونی چاہیے تھی، وہ الجھن اس وقت ثانوی ہو گئی تھی۔

"آئی ہوپ انہیں برا نہ لگا ہو۔" احتساب نے اس کے بارے میں کیا سوچا ہوگا کا خیال ستانے لگا۔ کتنی دیر وہ یونہی بیٹھی پچھلی رات یاد کرتی رہی پھر احساس ہوتے ہی خود کو سرزنش کی اور فون اٹھایا اور یہاں کا موسم اور ٹرینوں کا حال دیکھنے کے بعد بستر سے نکل گئی۔

باہر آئی تو صبیح الحسن اور رامو کاکا لان کی صفائی میں لگے تھے۔ بارش کے بعد فضا اب بھی بھیگی بھیگی سی تھی جب کہ آسمان صاف تھا۔ وہ دروازے سے ہی انہیں دیکھ رہی تھی۔

"میرے ساتھ آئیں، اس سے خوب صورت منظر دکھاتا ہوں۔" پیچھے سے احتساب نے کہا۔ وہ جانے کب وہاں آیا تھا۔ یسریٰ نے شکر ادا کیا کہ احتساب نے بات وہیں سے شروع نہ کی جہاں اس نے رات میں چھوڑی تھی۔

وہ اسے ابا کے کمرے کی کھڑکی کے پاس لے آیا۔

"اس کھڑکی کے باہر کا نظارہ ہمیشہ میرا فیورٹ رہا ہے۔ کچھ تو بات تھی کہ ابا نے یہ کمرہ کبھی نہیں بدلا اور مجھے اس سے اچھا کوئی اور منظر نہیں لگا۔"

کھڑکی سے باہر والا منظر پوسٹ کارڈ پر چھپی تصویر سا تھا۔ سرخ روش کے بعد سیاہ گیٹ اور اس کے پاس کھڑا پلاش کا درخت، جیسے کسی نے وہاں آگ رکھ دی ہو اور پھر چھوٹے بڑے جنگلی پھولوں کے درمیان لہراتی پگڈنڈی۔ جس سے پھسلتی نگاہیں پگڈنڈی کے نیچے غائب ہوتے ہی اطراف کے پہاڑوں پر ٹھہر جاتی تھیں۔

"یہ واقعی بریتھ ٹیکنگ ہے۔"

"آپ کو پتا ہے اس درخت کو 'فلیم آف دی فارسٹ' کہتے ہیں۔ یقین بھی جذبات کے جنگل کا ایک ایسا ہی شعلہ ہے جو جلتا رہے تو دنیا، دل، رستہ، کچھ تاریک نہیں ہوتا۔ اس پگڈنڈی کو آپ کی آمد اور خطوط کے بعد میں پہلی بار اس گھر تک آنے والے رستے کے طور پر دیکھ رہا ہوں ورنہ اس سے قبل میرے لیے یہ ہمیشہ گھر سے دور لے جانے والی راہ تھی۔" وہ دھیمی آواز میں ٹھہر ٹھہر کے بول رہا تھا۔

"دنیا میں قائم موسموں کے تغیرات ہمارے اختیار سے باہر ہیں لیکن اپنی زندگی کو کس موسم کے زیر اثر رکھنا ہے، یہ ہمارے بس کی بات ہے۔ اپنے خواب، اپنی بات اور اپنی کوششوں کو یقین کے موسم کے سپرد کردیں پھر دیر سویر ہو بھی جائے تو زندگی اداسی کو گلے نہیں لگاتی، نہ تھکتی ہے نہ مایوس ہوتی ہے۔ یہ ناممکن نہ سہی لیکن مشکل تو ہے، وسوسوں اور اندیشوں کی ہواؤں میں یقین پر قائم رہنا ہر کسی کو نہیں آتا مگر جو یہ مشکل کام کرلیں وہی اس موسم کا لطف لے سکتے ہیں۔"

"آپ ویژیل آرٹسٹ کے ساتھ ساتھ کمال کے رائٹر بھی ہو سکتے ہیں۔" کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد یسریٰ نے کہا۔

وہ دونوں ذرا فاصلے پر کھڑے باہر دیکھ رہے تھے۔ وہ بس مسکرا دیا۔

"آپ نے ضرور اس پیڑ اور اس منظر کو پینٹ کیا ہوگا۔ کبھی چانس ملے تو مجھے وہ پینٹنگ ضرور دکھایئے گا۔"

"میرے پاس ایسی کوئی پینٹنگ نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ اس کی طرف مڑی۔ "آپ نے یہ تصویر نہیں بنائی؟" وہ شدید حیران تھی۔

"جب کہ یہ بہت انسپائر کرتی ہے، منظر، یہ پیڑ اس کی فلاسفی، نام سب کچھ۔"

"آپ سے متفق ہوں۔ ایسا نہیں کہ میں نے سوچا نہیں بس جب بھی فریم ریڈی کر کے ایزل پر لگایا محسوس ہوا ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔"

"اُف! آپ، انتظار اور صحیح وقت۔ میں نے آپ سے زیادہ 'کول' بندہ کہیں نہیں دیکھا۔" وہ اس کی طرف دیکھ کے ہنس دیا۔

"چلیں، دیکھتے ہیں آج راموکاکا نے آپ کی تواضع کے لیے کیا خاص بنایا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے اس کے ساتھ چل دی مگر اس کے اندر انتساب کے الفاظ نقش ہو رہے تھے۔

آج وہ دونوں ہی بہت دیر سے جاگے تھے اس کے ابا ناشتہ کر چکے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے اپنا مختصر سامان سمیٹا اور جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ ٹرین وقت پر چل رہی تھی۔ اس کے اندر خطوط حق دار تک پہنچانے کے اطمینان کے ساتھ ایک نیا سا احساس بھی تھا جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

راموکاکا نے اسے پھر آنے کا کہا تا کہ وہ اسے مزید یہاں کے خاص پکوان کھلا سکیں۔

انہیں کھانا بنانا تھا، اس لیے الوداعی کلمات کے بعد وہ باورچی خانے میں چلے گئے۔

"شکریہ بیٹا۔" ابا نے کہا وہ اپنا بیگ اور پرس لیے انتساب کے لیے رکی تھی۔

"یہاں جب بھی آنا چاہو موسٹ ویلکم۔"

"وعدہ نہیں کرتی انکل! لیکن موقع ملا تو دوبارہ آنا چاہوں گی۔" اس نے ایمان داری سے کہا۔

اس نے مما کے بچپن کے بارے میں جاننے کا اشتیاق اور تجسس سب تھپک کے سلا دیا تھا۔ جو انہوں نے راز رکھا، بہتر تھا وہ اسے جاننے کی کوشش نہ کرتی۔ برسوں پرانی ادھوری داستان اس نے خطوط پہنچا کے مکمل کر دی تھی تاہم اس کے لیے بھی اس داستان کی خوبصورتی 'ان کہی' میں تھی۔

"اگلے پانچ منٹ میں نہیں نکلیں تو ہم لیٹ ہو جائیں گے۔" انتساب جیکٹ کی زپ بند کرتا باہر آیا۔

"مفلر بھی رکھ لو۔" ابا نے اس سے کہا۔ واپسی کے پہر سردی کا زور بڑھ جاتا تھا۔

"گاڑی میں رکھا ہے۔" وہ صوفے پر بیٹھ کر جوتے پہن رہا تھا۔ اس کی دی جرابیں یسریٰ نے لوٹائی نہیں تھیں بلکہ وہ انہیں اس وقت بھی پہنے تھی۔ اس نے کوٹ کے ساتھ دوپٹے کو مفلر کی طرح لپیٹا ہوا تھا۔

"مجھے دیر ہو تو آپ سو جایئے گا، میرے واپس آنے کا انتظار مت کیجیے گا، چابیاں ہیں میرے پاس۔" اسے ابا کے آرام کا خیال تو ہمیشہ رہتا تھا۔

یسریٰ ان سے رخصت لے کر باہر آئی۔ انتساب اس سے آگے تھا۔

دروازہ میں کھڑے ابا کے چہرے پر ممنونیت اور اطمینان تھا لیکن آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

کیا ان بی بی جی کا بیاہ ہو چکا ہے؟" باورچی خانے سے نکل کر راموکاکا نے ابا سے پوچھا۔

"نہیں۔" یسریٰ نے انہیں یہ ہی بتایا تھا کہ شوہر بچے نہیں ہیں ابھی۔

"تو پھر بابا کے لیے سوچیں۔ چاند سورج کی جوڑی ہے۔" اور وہ ٹھٹک کر اس سمت دیکھنے لگے جہاں کار ڈھلان پر غائب ہو رہی تھی۔

☆☆☆

"اگر آپ چاہیں تو قریبی شہر کے سول ہاسپٹل میں اپلائی کر سکتی ہیں۔ یہاں کم سے کم آس پاس خوبصورتی ہو گی اور جب چاہے تب پون نگری آسکیں گی۔" اس کو دلچسپی سے کھڑکی کے باہر کے نظارے دیکھتا پا کر انتساب نے مشورہ دیا۔ وہ ہنسنے لگی۔

"اب تو شاید وہ جاب بھی چھوڑنی پڑے۔ مما کی حمایت اور کان پور سے قریب ہونے کی وجہ سے وہاں جاب ممکن تھی کہ جب دل کیا گھر آنا جانا بھی آسان تھا ورنہ گورنمنٹ جاب وہ بھی اتنی چھوٹی سی جگہ، ہماری خاندانی شان و شوکت کے خلاف ہے، ایسا سب کا خیال ہے میرا نہیں۔" آخر میں اس نے اپنی صفائی بھی پیش کر دی۔

"بھائی کہہ چکے ہیں کہ وہ میرے لیے ہاسپٹل کی جگہ فائنل کر چکے اور ملٹی اسپیشلٹی ہاسپٹل میں نئی جاب بھی۔" اس نے مختصر وقفہ لیا۔

"اور مما بھی میرے لیے یہ ہی خواہش رکھتی تھیں کہ ایک دن میں اپنا ہاسپٹل اسٹارٹ کروں۔"

اس وقت انتساب نے بہت کچھ، سارا کچھ بھی اور کہنے کی تھپکی دے کر دل کو بہلایا تھا۔

جب انتساب نے کار پارک کی تو اسے لگا، دو گھنٹے کا سفر چند منٹوں میں طے ہو گیا ہے۔

انتساب اس کا بیگ لیے ساتھ چل رہا تھا۔ جب وہ پلیٹ فارم پر پہنچ گئے تو اس نے بیگ لے لیا۔

"بہت دیر ہو گئی ہے، اب آپ جائیں۔" وہ پلیٹ فارم پر وہاں کھڑے تھے جہاں انڈیکیٹر پر اس کا بوگی نمبر درج تھا۔

"مجھے کون سا سویرے اٹھ کر آفس جانا ہے۔" اس کی بات پر وہ ہنس دی۔ پھر ذرا ٹھہر کر سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"میں کنفیوز تھی کہ میرا یہاں آنا ٹھیک ہے یا نہیں، مجھے ڈر تھا کہیں میں مما کے متعلق کوئی غلط تاثر لے کر یہاں سے نہ جاؤں لیکن اب۔ میں خوش ہوں کہ میں یہاں آئی اور ان لیٹرز کو خاموشی سے کہیں دفن نہیں کیا۔"

"میں بھی خوش ہوں کہ آپ یہاں آئیں۔" یہ تو وہی جانتا تھا کہ کیسے خود پر پہرے بٹھائے تھا۔

"کبھی کان پور آئیں تو کانٹیکٹ کیجیے گا۔" یسریٰ نے کہا۔

"اس کے لیے کان پور آنا شرط ہے؟" وہ مسکرا رہا تھا۔

''نہیں۔'' وہ ہنس دی۔ تب ہی ٹرین کی آمد کا اعلان ہونے لگا۔

اس نے پرس شانے پر درست کیا اور فون والا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے مڑ کر اس سمت دیکھنے لگی جدھر سے ٹرین آنا تھی۔

''یسریٰ!'' گہری بھاری آواز میں اس بے تکلفی نے اسے ساکت کر دیا۔ وہ فوراً اس کی سمت نہیں دیکھ سکی۔ جب گردن سیدھی کی تو وہ سنجیدہ سا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''دو ٹریجڈیز کے بعد آپ محبت اور رفاقت کی زیادہ حق دار ہیں۔ ہر کسی کے بخت میں اس کے حصے کا عشق لکھا گیا ہے، بس آپ کے ماننے اور یقین کرنے کی دیر ہے۔''

اس کے انداز میں کچھ تھا جو وہ پہلی بار محسوس کر رہی تھی۔ اس نامانوس لہجے اور بات پر دل بھی اس کی طرح دم بخود تھا۔

''آئی ہوپ آپ اپنی مما کی طرح عزم اور یقین سے اپنے لیے وہ فیصلہ کریں گی جو دنیا اور خود آپ کو بھی حیران کر دے۔''

انجن کی سیٹی پر وہ چونکی۔ اسے جواب میں کہنے کو ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور اپنے خیر خواہ کو کچھ نہ کہنا بد اخلاقی تھی۔

''کچھ نہ کہیں۔'' اس کی کشمکش دیکھ رہے احتساب نے مشکل آسان کی۔

''لیکن اس پر غور ضرور کریں۔'' وہ خفیف سا مسکرائی۔

ٹرین رینگتی ہوئی پلیٹ فارم پر آ گئی تھی جس کا وہاں رکنے کا وقت دو منٹ ہی تھا۔ دروازے سے اندر داخل ہو کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ اسے یہیں الوداعی کلمات کہنے تھے کہ فرسٹ کلاس میں کھڑکیاں بند ہوتی ہیں۔ حالاں کہ وہ ایک دوسرے کے فون نمبر لے چکے تھے، اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اسے اپنی تصاویر کی نمائش میں بلائے گا تو وہ ضرور آئے گی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

''آئی ہوپ ہم دوبارہ پھر ملیں گے۔'' اس کے انداز میں جھجک تھی۔

''یقیناً۔'' اس نے یقین سے کہا۔

''اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ۔'' احتساب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ وہ اندر اپنی نشست کی طرف بڑھ گئی۔

احتساب ٹرین کا آخری ڈبہ نظروں سے اوجھل ہونے تک وہیں کھڑا رہا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح ابا اخبار میز پر رکھتے ہوئے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ یہ خلاف معمول بات تھی۔ ورنہ وہ صبح کی چہل قدمی کے بعد اخبار اپنے کمرے میں لے جا کر پڑھتے اور ناشتہ اس کے بعد کرتے تھے۔

''تمہیں ان لیٹرز اور۔ رفعت کے بارے میں جو بھی پوچھنا ہے پوچھ سکتے ہو۔'' انہوں نے اسے حیران کیا۔ اس کے لیے تو رفعت نام بھی نیا تھا۔ یسریٰ نے اپنی مما کا نام نہیں بتایا تھا۔

''مجھے کچھ نہیں پوچھنا ابا۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''اور یہ میں ناراض یا ایموشنل ہو کر نہیں کہہ رہا ہوں، میں خوش ہوں کہ آخر آپ کا انتظار ثمر بار ہوا۔'' وہ باپ بیٹے 'انڈر اسٹینڈنگ' کی کسی اور ہی سطح پر تھے۔

ابا کو اطمینان ہوا۔ والدین کے لیے اس عمر میں اولاد کو اپنی وجہ سے شرمندہ دیکھنے سے بڑی شرمندگی کوئی دوسری نہیں ہوتی۔ یہ مصلحت بھی ان پر اللہ کا کرم تھی کہ یسریٰ کی آمد کے وقت کوئی اور نہیں بلکہ احتساب ہی موجود تھا۔

''اور تم میرے انتظار کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش میں اپنی تنہا زندگی کا دورانیہ بڑھا مت لینا۔'' انہوں نے مشورہ اور اپنی خواہش کا عندیہ دیا۔

''ابا!'' ابا اس کے مزاج آشنا تھے اور دونوں ہی رازوں کے ساجھے دار بھی سو یہ تعجب خیز نہ تھا کہ وہ جان گئے ہیں پھر بھی اس قدر جلد اس سے کہہ دینے

تھا وہ سب اب اس پر گزر رہا تھا۔ مانو اس کے پھونکے سحر کا اثر اب ہو رہا تھا۔ وہ دور ہو کے بھی ساتھ تھا، پاس تھا کہ اس کی آواز اور الفاظ کا لمس بھی وہ محسوس کرنے لگی تھی۔

جب اس کی آخری باتیں یاد آتیں تو اسے یقین ہو جاتا کہ ''اس وقت وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔''

اس نے دریچے سے ایک نئے جہان کا نظارہ دکھا کر اس کے اندر اس دنیا کی جستجو پیدا کر دی تھی۔

''لیکن میں مما جیسی نہیں ہوں۔'' اب تک خود کو ماں کا پرتو کہنے اور سمجھنے والی اب اس سے انکاری ہو رہی تھی۔

لیکن پھر آنکھیں بند کرتے ہی وہ اس منظر کو دوبارہ جینے لگتی، جہاں وہ سامع تھی اور انتساب کی باتیں مبہوت ہو کر سن رہی تھی۔ جب احساس ہوتا تو ہڑبڑا کے آنکھیں کھولتی اور خود کو سرزنش کرنے لگتی۔

اسے سمجھوتے پسند نہیں تھے ورنہ وہ فواد سے منگنی نہ توڑتی، پاپا سے کزن کا رشتہ نہ توڑنے کا کہتی کہ وہ لاڈلی بیٹی کی بات ٹالتے نہیں تھے، یا سب کے اصرار پر بیوگی کے بعد آئے کسی نہ کسی رشتے پر مان جاتی، اور اب ایک نیا خیال، اپنے متعلق نیا انکشاف اسے حیران کر گیا۔

''وہ سب نہ میری تکلو تھ سمجھتے نہ ویسی میری قدر کر سکتے تھے جس کی میں حق دار ہوں۔'' آئینے میں عکس نے کہا۔

''تو کیا میں خود پسند ہوں؟ نہیں۔ یہ تو خود شناسی ہے، اپنی قدر دانی۔'' عکس اسے یقین دلا رہا تھا۔ کہیں اس کا سر غرور سے تن گیا کہ اس نے مما سے کچھ تو لیا تھا۔ جو ان کے لیے خاص تھا، وہ واقعی اس قابل تھا۔ اپنے جذبوں کی قدر دانی کا یقین ہی ان کی شانت اور مطمئن زندگی کا راز تھا۔

وہ بھی تو اب کہیں اپنے جذبے ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ رائیگانی سے بہتر اس نے تنہائی کو چنا تھا اور اب۔

''اپنے خدشات اور خوف کو یقین سے ہی

پر وہ حیران ہوا۔

''آپ کی طرح میری خواہشوں، خوابوں کا موسم بھی یقین ہے ابا، آپ کی رجائیت پسندی بھی مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے لیکن۔ دوسری طرف ایسا نہیں بلکہ اس کے متضاد ہے۔''

وہ چاہتا تھا وہ فوری نتائج کی توقعات نہ باندھ لیں۔ ابا مسکراتے ہوئے اٹھ گئے اور جاتے ہوئے اس کے پاس رک کر شانے پر ہاتھ رکھا۔

''متضاد موسم آسانی سے بدلتے نہیں، لیکن آس پاس کے موسم کا اثر قبول کرنے کی صلاحیت ان میں ہوتی ہے۔'' وہ کہہ کر چلے گئے۔

وہ چاہتے تھے، وہ یسریٰ کے پاس رہے، کوشش کرے، اسے احساس دلائے۔ اسے پھر اپنے ابا پر بڑا پیار آیا۔ لیکن اس کا طریقہ کار تھوڑا مختلف تھا۔

اس نے فون اٹھا کے رابطوں میں یسریٰ کے نام سے محفوظ نمبر دیکھا اور پھر گہرا سانس لے کر فون بند کر دیا۔

''ویٹ از ٹائم لیس!'' (انتظار وقت کی قید سے ماورا ہے) اس نے اپنا کہا جملہ دہرایا۔

☆☆☆

وہ ماسک اور کیپ اتارتے ہوئے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر رک گئی۔

''ہر کسی کے بخت میں اس کے حصے کا عشق لکھا گیا ہے۔''

ذرا دیر پہلے ایک پندرہ سالہ لڑکی کی ''اپینڈ یکٹومی'' کے دوران نرس نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ کھدر پہن کر بھی شادی کے فنکشن میں چلی جائے تو سارے مہمانوں میں سب سے پیاری لگے گی۔ وہ جانتی تھی اس میں مبالغہ ہے وہ پہلے بھی ایسی باتیں سنتی آئی تھی لیکن اب وہ خود پر کسی کی نظریں محسوس کرنے لگی تھی۔ ایسی باتیں سن کر اسے انتساب کی نگاہیں خود پر محسوس ہوتی تھیں۔

وہ شخص، اس کی آواز، اس کی باتیں کچھ بھی اسے بھولتا نہیں تھا۔ وہاں جو اس نے محسوس نہیں کیا

شکست دی جاسکتی ہے، اپنے حصے کی خوشیاں ملنے کا یقین۔" وہ رک گئی۔

"میں نے ایسا تو کسی کے لیے محسوس کیا نہ سوچا جیسا اب۔ اور میرا دل۔ وہ اتنے سالوں میں بھی یوں نہیں دھڑکا جیسے اب۔۔" پہلا زینہ خود سے سچ کہنا ہی ہوتا ہے۔

تبھی فون کی آواز نے اس کی توجہ کھینچ لی۔

پیغام میں کوئی ذاتی بات نہیں تھی بلکہ وہ ایک دعوت نامہ تھا۔ انتساب الحسن کی تصاویر کی نمائش کا دعوت نامہ جو گلابی شہر 'جے پور' میں منعقد ہونے والی تھی۔ اس 'سولو ایگزیبیشن' کا نام موسوم تھا۔

اسے امید تھی کہ فون نمبر لینے کے بعد وہ ضرور اس سے رابطے میں رہے گا لیکن ساڑھے تین ماہ میں یہ اس کا پہلا رابطہ تھا۔ وہ فون کی ہر آواز پر چونک جاتی، دھڑکنیں تیز ہو جاتیں اور پھر اس کا نام نہ دیکھ کر مایوسی گھیر لیتی۔

کئی بار سوچا خود ہی حال احوال پوچھ لے لیکن گھنٹوں فون ہاتھ میں لیے رہنے کے بعد بھی وہ ہمت نہ کر سکی تھی لیکن اب اس نے خود کو حیران کرتے ہوئے جے پور جانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

اس وقت نمائش گاہ میں وہ "یون نگری" والے حلیے سے یکسر مختلف تھا۔ عام طور پر فن کاروں کے مقبول حلیے یعنی جینز، جھولے، چپلیں اور بکھرے الجھے بالوں کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ جو تبدیلی اسے فوراً محسوس ہوئی وہ سیاہ سوٹ اور سلیقے سے جمے بال تھے۔

"یہ تصویر دکھانے کا موقع تھا۔" اس نے اس کے پیچھے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"تھینک یو کہ مجھے مدعو کیا۔" وہ اندر کی ہلچل پر قابو پاتی مسکرائی۔

"وجود میں آنے سے قبل ہی یہ آپ کی فیورٹ تھی، سو کیسے نہ بلاتا۔" وہ آہستہ بول رہا تھا۔

"بلکہ یہ تصویر ممکن ہی آپ کی وجہ سے ہوئی ہے۔" گہری باتیں، گہری نگاہیں اسے اچھی لگ رہی تھیں۔

"مجھے لگنے لگا تھا، آپ نمبر لے کر بھول گئے ہیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ زبان پر آگیا۔ کہنے کے بعد وہ خود ہی خجل ہو گئی جب کہ انتساب کے لیے حظ اٹھانے کا وقت تھا۔

"بعض اوقات مسلسل دستک کے بجائے ایک دستک کے بعد کی خاموشی دروازہ کھولنے پر مجبور کرتی ہے۔" وہ دلکشی سے مسکرایا۔۔

"مسٹر انتساب۔" تب ہی پیچھے سے کسی نے پکارا۔ اس نے مڑ کے دیکھا۔ اس کے گلے میں لٹکا شناختی کارڈ اسے صحافی بتا رہا تھا۔

"آپ باقی پینٹنگز دیکھیں، میں ابھی آیا۔" وہ یسریٰ سے معذرت کرتا اس کے ساتھ ایک گوشے میں چلا گیا۔

وہ سست روی سے چلتی تصویریں دیکھ رہی تھی مگر اندر کچھ ست رو نہ رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی تبدیلی سے گزر رہی تھی اور اس کے اندر کا جوش ڈر پر حاوی ہو رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی، یہ ڈر بھی ختم ہو جائے۔ وہ بھی اپنے اندر یقین کی وہ کیفیت محسوس کرنا چاہتی تھی۔ جس کے زیر اثر مما نے خطوط سنبھال کے رکھے تھے، صبیح الحسن نے 'یون نگری' کو چھوڑا نہیں تھا اور انتساب نے اسے روکا نہیں تھا۔

"یسریٰ!" قریب سے مانوس آواز آئی وہ چونک گئی۔ بھائی وہاں کسی کے ساتھ کھڑے اسے تعجب سے دیکھ رہے تھے۔

"تم یہاں جے پور میں کیسے؟" ان کے مطابق تو وہ اس وقت اپنے اسپتال میں تھی۔

"صبح ہی ایگزیبیشن کے لیے آئی ہوں۔" اس نے اعتماد سے کہا۔

"آپ آرٹسٹ کو جانتی ہیں؟" ان کے ساتھ کھڑے شخص نے پوچھا۔

"جی۔"

"یہ فاروق صدیقی ہیں، یہ ایگزیبیشن کے اسپانسرز میں سے ایک ہیں۔" بھائی نے تعارف

کروایا۔ یسریٰ منتظر تھی کہ وہ اس کا تعارف بھی کروائیں گے لیکن وہ آگے کہنے لگے۔

"ہم بزنس ایکسپو میں آئے تھے، فارغ ہوئے تو فاروق نے کہا ایگزیبیشن بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

"تم کب تک ہو؟"

"آج رات کی ریٹرن فلائیٹ ہے۔" انہیں اور جھٹکا لگا۔ یعنی وہ کان پور سے آئی تھی۔

"ڈنر ہمارے ساتھ کرو۔" فاروق کا فون بجا تو وہ معذرت کرتا ان سے دور ہو گیا۔ بھائی اس کے قریب ہوئے۔

"فاروق وہی ہے جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ تم آج مل کر تسلی کر لو تو پھر میں آگے کی تیاریاں کروں۔"

ذرا دیر پہلے وہ جو نصیب کی ستم ظریفیاں بھول کر اپنی زندگی کا موسم بدلنے کے لیے پرعزم تھی، یکایک پھر اسی خوف کے سائے تلے آ گئی۔

احتساب اس کے پاس آیا تو اس نے دونوں کو ملوایا۔

"آپ دونوں کیسے ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟"

ایک کان پور کے قریب چھوٹے سے شہر کی معروف ڈاکٹر اور دوسرا دہلی میں آباد آرٹسٹ، ان کا تجسس جائز تھا۔

"قسمت اور اتفاق سمجھیں۔" احتساب نے کہا۔ وہ تسلی بخش جواب کے لیے مزید سوال کرتے کہ فاروق صدیقی کی آمد نے انہیں روک دیا۔ وہ اور احتساب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ان تینوں کی گفتگو میں وہ چپ کھڑی تھی۔

کچھ دیر بعد شام کی ملاقات کی یاد دہانی کرواتے ہوئے بھائی نے فاروق صدیقی کے ساتھ وداع لی۔ وہ طویل ہال عبور کرتے ہوئے داخلی دروازے کی جانب جا رہے تھے۔ احتساب نے اسے دیکھا جو سنجیدہ شکل بنائے گہری سوچ میں ڈوبی تھی۔ چند پل وہ یونہی تکتا رہا۔

"کوئی بات ہوئی ہے؟" اس نے دھیرے سے سوال کیا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"میں ابھی آئی۔" وہ تیزی سے ہال کے دروازے کی سمت دوڑی اور دروازے کے پاس ہی بھائی اور فاروق صدیقی کو جا لیا۔ اس نے بھائی سے کچھ کہا اور وہ دونوں فاروق صدیقی سے کچھ دور جا کر بات کرنے لگے۔

وہ ٹھہر ٹھہر کے کچھ کہہ رہی تھی اور سننے والا اچنبھے سے جوابی سوال کر رہا تھا۔ پھر اس نے کچھ کہا اور بھائی نے احتساب کی سمت انگلی اٹھا کے کچھ پوچھا، اس نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ اسے دیکھنے لگے۔ وہ مسکرا دیا لیکن ادھر سے جوابی تبسم کی جگہ بے یقینی اور حیرت تھی۔ مزید جملوں کے تبادلے کے بعد وہ فاروق صدیقی کے ساتھ چلے گئے اور وہ اس کے پاس چلی آئی۔

"کوئی معرکہ سر ہوا ہے؟"

"ہاں۔" اس نے گہری سانس لی۔

"کانگریٹس۔" اس نے کون سا معرکہ پوچھنے کے بجائے مبارک باد دی۔

اسے اب تو حیران نہیں ہونا چاہیے تھا پھر بھی اسے تعجب ہوا کہ اسے یقین تھا اس معرکے کی سرکوبی پر وہ مبارک باد کی مستحق ہے۔

"ہم دونوں کو۔" احتساب نے آگے کہتے ہوئے بات مکمل کی۔ اس کے لہجے میں اور چہرے پر شوخی تھی۔

"یہ بہت ان فیئر ہے۔" چند پل بچوں کی طرح مچلتے دل کو سنبھالے، خفگی سے ہونٹ بند کیے وہ ناراض سی دیکھے گئی پھر آخر شکایت کر ہی دی۔

"نہیں تو۔" اس نے معصومیت سے انکار کیا۔

"دیکھیں! اب بھی آپ نے 'کیا ان فیئر ہے' نہیں پوچھا۔ پھر یہ فیئر کیسے ہوا؟" اس بار احتساب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"کیا یہ اچھا نہیں کہ میری سمجھ داری کے باعث بقیہ زندگی سمجھنے اور سمجھانے جیسے کاموں میں ٹائم ویسٹ ہونے سے بچ جائے گا۔" وہ دو قدم چلتا اس کے پاس آیا۔

"اور یہ وقت کچھ اور بھلے سے کاموں میں صرف ہوگا۔" وہ اس کی آنکھوں کے پیام پر سر جھکا گئی۔ کوئی

نہیں جانتا تھا کہ چھتیس سال میں پہلی بار اس کے چہرے پر پھیلی سرخی کا تعلق وارداتِ دل سے تھا۔

☆☆☆

وہ دروازے میں کھڑی جانے کہاں کھوئی تھی کہ انتساب نے آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی۔

''صبح بخیر ڈاکٹر!''

''صبح بخیر پینٹر!'' اسی کے انداز میں یسریٰ نے کہا۔

''ابا آئے نہیں؟'' گھر میں پھیلا سناٹا محسوس ہوتے ہی اس نے پوچھا۔

''میں ان ہی کا ویٹ کر رہی ہوں۔'' اس کی آنکھیں راستے پر ٹکی تھیں۔

''کوئی خاص بات؟''

''ہوں۔'' وہ کچھ سوچ کر زیرِ لب مسکرائی۔

''بندہ جان سکتا ہے؟''

''بندے کی شکایت کرنی ہے۔'' اس نے ذرا مصنوعی تیز سی نظر اس پر ڈالی پھر پگڈنڈی کو دیکھنے لگی۔ انتساب اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

''بندے کی خطا؟'' انداز میں لجاجت تھی۔

''یہ بندہ کل یہاں سے جانا چاہتا ہے۔''

''حق ہا!'' اس نے سر پیچھے کیا پھر بیوی کو گھورا جس کی بات جاری تھی۔

''اس بندے کو شادی کے بعد نئی نویلی بیوی اپنے ابا سے زیادہ عزیز ہوگئی ہے اسی لیے ابا کے پاس رکنا نہیں ہے۔''

''اُفف!'' اس نے بڑے انداز سے مزہ لیتے ہوئے اف کہا۔

''نئی نویلی کی خوش فہمی! اور ایسی شکایت تو مجھے کرنی ہے۔''

''ہاں؟'' یسریٰ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''کہ ڈاکٹر یسریٰ انتساب الحسن کام چور ہوگئی ہیں۔'' اس نے سزا کے طور پر یسریٰ کا کان پکڑا۔

''اپنے ہاسپٹل کا انا گریشن ٹالنا چاہ رہی ہیں۔''

پرسوں اسپتال کا افتتاح تھا اور دو دن پہلے انہیں یہاں سے نکلنا تھا تاہم وہ کسی نہ کسی وجہ سے کل پر ٹالے جا رہی تھی۔

''میں اور کام چور؟'' اس نے انتساب کا ہاتھ اپنے کان سے ہٹایا۔ ''ہو ہی نہیں سکتا۔'' انتساب سامنے سے ہٹ کر اس کے بازو میں آیا۔

''مانا اس جگہ کا حسن جادو کر دیتا ہے، یہاں سے جانے کا دل نہیں کرتا لیکن ہم اس وجہ سے کارِ جہاں تو نہیں روک سکتے ناں۔'' وہ یک بیک سنجیدہ ناصح بن گیا۔

''ایک دفعہ اس کارِ جہاں میں الجھی تو پھر پتا نہیں یہاں کب آسکوں گی۔ اب ملازمت تو ہوگی نہیں کہ چھٹی لی اور نکل گئے۔'' اس نے اصل وجہ بیان کی۔

''یہ کوئی مشکل نہیں، بندے کو ایسا بھی روٹین کا غلام نہیں ہونا چاہیے، تم جب کہوگی، وعدہ فوراً 'یون نگری' لے آؤں گا۔'' انتساب نے اس کے پیچھے بازو پھیلایا۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر سر اس کے شانے سے لگا دیا۔

''سب جانتے ہوئے بھی من کہتا ہے، ایک دن اور!'' اس نے ہلکا سا سر ترچھا اور اونچا کر کے انتساب کو دیکھا۔

''فرصت کے لمحات ڈھونڈے بنا 'بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے' والی لائف میں پہلی بار جی رہی ہوں، شاید اس لیے۔''

یسریٰ کی بات پر وہ زور سے ہنسا۔

''جاناں جب ساتھ اور پاس ہو تو تصور کا کیا کام؟''

''یہ بندی 'کری ایٹیو پرسن' نہیں تو الفاظ نہیں احساسات سمجھ کر درگزر کیا کریں۔'' اس نے گزارش کی۔ دونوں بے ساختہ مسکرا دیے۔

تبھی پگڈنڈی پر ابا اور کاکا کے سر دکھائی دیے۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی ان کے چہرے بھی کھل اٹھے تھے۔

پلاش کے درخت اور گیٹ کے دونوں جانب سے دیکھنے والوں کے لیے سامنے کا منظر خوب صورت اور پرسکون تھا۔

☆☆

بہنوں کا اپنا ماہنامہ شعاع

مئی 2024
کے شمارے کی ایک جھلک



مئی 2024
کا شمارہ شائع ہوگیا ہے

- "ماہ الملوک" نگہت سیما کا مکمل ناول،
- "والعصر" امتہ العزیز شہزاد کا ناول،
- "دستور وفا" مریم عزیز کا مکمل ناول،
- "مکتوب" عیشہ حسین کا مکمل ناول،
- ساجدہ لطیف اور عطیہ خالد کے ناولٹ،
- قرۃ العین خرم ہاشمی، سونیا ربانی، عارفہ فضل شاہ، نورین حفیظ، اُمِ رومان اور راضیہ سید کے افسانے،
- اداکار "خاقان شاہ نواز" سے ملاقات،
- "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" قارئین کے تجربات،
- "دستک" معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،
- "پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں" احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع ہر ماہ پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں، لیکن آپ کے خط ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم اپنی محنت میں کتنے کامیاب ٹھہرے، ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

شعاع مئی 2024 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

صوفیہ بٹ

احد

مکمل ناول

سترہویں قسط

ضامن مصطفیٰ کے لیے سانس لینا محال ہوا۔ کوئی شخص بھی کبھی کسی کے دل میں مرنا نہیں چاہتا۔ خود بھلے وہ دوسرے کے ساتھ کیسا بھی سلوک کر چکا ہو۔ یہی معاملہ ضامن کے ساتھ ہوا۔ انہیں لگنے لگا کہ انہوں نے خولہ کو تاج محل نہیں بنایا بلکہ خولہ نے اپنے دل میں ان کے لیے ایک قبر ضرور تیار کر لی تھی۔

"مجھے اس لڑکی کے دل میں زندہ ہونا ہے، پھر سے جینا ہے، پھر سے سانس لینی ہے۔ میں اپنے آپ کو یوں مرنے نہیں دوں گا۔" اس رات خاموشی سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے ضامن مصطفیٰ نے خود سے ایک عہد کیا۔

☆☆☆

کیا وہ ساری زندگی اسی طرح سوگ میں گزار دے گی۔

بابا اس کو کہہ رہے تھے کہ وہ کورٹ جائے۔ اقصیٰ اور دوسری دوستیں اسے چھیڑ رہی تھیں کہ اس کا ہنی مون پیریڈ کب ختم ہوگا۔ کولیگز اس سے پوچھ رہے تھے کہ وہ کورٹ کب آئے گی۔ جو کیسز اس کے پاس تھے، ان کلائنٹس کے فون آنے لگے تھے۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ ایڈووکیٹ خولہ بنت زید ہے، اس حیثیت سے اس کے کندھوں پہ ابھی بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا، اس کے بعد وہ باقی فرائض سے منہ نہیں موڑ سکتی تھی۔ ایک دن وہ اٹھی اور تیار ہونے لگی۔ اسے کورٹ جانا تھا۔ ہاں اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

ضامن مصطفیٰ نے اسے تیار ہوتے دیکھا اور ہلکا سا مسکرا دیے۔ انہوں نے اسے کورٹ تک چھوڑنے کی پیشکش کی تھی۔ ان کے ڈرامے میں اس گاڑی کا بھی بڑا رول تھا، اس لیے خولہ کو یہ گاڑی بھی بری لگنے لگی تھی۔ وہ اب اس میں بیٹھنا نہ چاہتی تھی اس لیے پیشکش رد کر دی۔ کورٹ پہنچی تو سب نے اسے مبارک باد دی تھی۔ جب دل خوش نہ ہو تو کتنا مشکل کام تھا، اسے اب سمجھ میں آیا۔

"مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تم نے یہ کیس کیوں چھوڑا؟" معظم ابھی تک اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ خولہ کے لیے یہ کیس کتنا اہم تھا۔ اس کیس میں وہ پہلی بار نیچرل لا آف جسٹس کے خلاف گئی تھی۔ ایسا فیصلہ کیریئر پہ بڑا داغ بھی ثابت ہو سکتا تھا پھر بھی اس نے یہ فیصلہ لیا۔ اور اب اس کیس کو چھوڑ کر وہ پھر سے اپنے کیریئر کے لیے بیوقوفانہ قدم اٹھا رہی تھی۔ معظم کو اس بیوقوفی کی امید خولہ بنت زید سے ہرگز نہیں تھی۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم یہ سوال مجھ سے بار بار نہ پوچھو۔"

معظم کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا تھا پھر سر ہلا کر سیدھا ہوا۔

"چائے یا کافی؟"

"میں تم سے امید رکھتی ہوں کہ تم اس کیس کو

دل سے لڑو گے۔" چائے کافی سے زیادہ بہت سی اور اہم چیزیں تھیں جنہیں ڈسکس کرنا بہت ضروری تھا۔

"ایسا ہی ہوگا۔" معظم ندیم ایک اچھا وکیل تھا، اس میں کوئی شک نہیں تھا۔

"عبدالہادی سے ملے تم؟"

"ہوں۔"

"کچھ کہا اس نے۔" وہ جھجکتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ وہ خود عبدالہادی سے جا کر ملنا چاہتی تھی مگر جانے کیوں اسے لگتا تھا کہ وہ اس کی نظروں کا سامنا نہیں کر پائے گی۔ اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دے پائے گی۔

"نہیں۔ بس جب میں نے اسے بتایا کہ تم یہ کیس چھوڑ چکی ہیں تو وہ ہنس دیا تھا۔" معظم کے بتانے پہ خولہ کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑا۔ اس کو لگا کہ ضامن مصطفیٰ نے اسے سنگسار کرنے کا جو عمل شروع کیا ہے، اس کا انت اب کوئی نہیں۔ اس کو یہ بھی لگا



کہ اب وہ کبھی عبدالہادی کا سامنا نہیں کر پائے گی۔

"نہیں۔ بس جب میں نے اسے بتایا کہ آپ یہ کیس چھوڑ چکی ہیں تو وہ ہنس دیا تھا۔"

یہ جملہ کل سے یوں بازگشت کر رہا تھا کہ اسے لگنے لگا تھا کہ باقی ہر آواز کے لیے وہ بہری ہو چکی ہے صرف یہی جملہ سننے کو اس کی حس سماعت باقی تھی۔ وہ سر اٹھا کر جینے والی انسان تھی اور ضامن مصطفیٰ نے اس کا سر جھکا دیا تھا۔

"ضامن مصطفیٰ میں تم سے حساب ضرور لوں گی۔" ساحل کے کناروں کو چھو کر واپس جاتی لہروں پہ نگاہ جمائے وہ دل میں اس شخص سے مخاطب تھی جس سے کلام کرنا اسے اپنی توہین لگنے لگا تھا۔

اسی وقت اس کی نگاہ نیچے لان میں پڑی اور وہ ٹھٹک گئی۔ آج اس نے اسے دوسری بار دیکھا تھا۔ آج بھی وہ کوئی زندہ لاش لگ رہا تھا۔ اس کے پاس ضامن مصطفیٰ، غلام نبی اور ایک مرد کھڑا تھا۔ وہ اس شخص کو نہ پہچانتی تھی مگر جلد اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی فزیوتھراپسٹ ہے۔ وہ اس فالج زدہ شخص کے ہاتھ پاؤں گردن ہلا کر مختلف مشقیں کروا رہا تھا۔ خولہ نے نوٹ کیا، وہیل چیئر پہ بیٹھا شخص کچھ بھی کرنے کے قابل نہ تھا مگر نگاہوں سے ضامن مصطفیٰ کو بتا رہا تھا کہ وہ تکلیف میں ہے۔

کون تھا یہ مفلوج شخص۔ جس کی شکل و صورت بتاتی تھی کہ غلامی میں زندگی گزاری ہے۔ سلیقے سے بنی ہوئی شیو، طریقے سے کاٹے ہوئے بال، بہترین لباس بھی اس کی غلام صورت پہ پردہ نہ ڈال سکے تھے۔

ضامن مصطفیٰ کیوں ہیں اس کے لیے اس قدر فکر مند؟ اسے تجسس ہوا۔

اگلے دن وہ چیمبر سے لوٹی تو گھر کے پچھلے حصے کی طرف چلی آئی۔ ضامن مصطفیٰ کی باغبانی کا شوق یہاں بھی پورا ہوتا نظر آتا تھا۔ خوش رنگ پھولوں کے ساتھ ساتھ پھلوں کے بھی کچھ پیڑ تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے وہ پچھلی طرف بنے کمروں کی جانب آئی۔ ایک کمرہ غالباً غلام نبی کا تھا کیونکہ اس کی رہائش اسی گھر میں تھی اور وہ اس گھر کا مالکوں جیسا غلام تھا۔ صفائی ستھرائی کے لیے کوئی اور اس کی بیٹی آتی تھی۔ کپڑے سب لانڈری کے لیے جاتے تھے۔ گل محمد چوکیدار تھا۔ غلام نبی کی ذمہ داری ضامن مصطفیٰ کی خدمت گزاری تھی اور یہ کام بھی لگتا تھا کہ وہ اپنے شوق سے کرتا ہے، ورنہ ضامن مصطفیٰ کی جانب سے ایسی کوئی پابندی نہ تھی۔

ایک کمرے کا دروازہ لاکڈ تھا۔ وہ دوسرے کمرے کی جانب آئی، اور اس کے ہینڈل پکڑ کر ہلکا سا اندر کی جانب دبایا تو وہ کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہوئی۔ کمرہ کھلا اور روشن تھا۔ جس کے وسط میں بیڈ رکھا تھا۔ اس نے اس بیڈ پہ پڑے شخص کو دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں خولہ کو دیکھ کر نامعلوم سا تاثر ابھر آیا تھا۔ وہ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اور پھر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کمرہ صاف ستھرا تھا۔ ہر شے دھلی دھلائی تھی۔ یہاں تک کہ اس بوڑھے کے بیڈ پہ بچھی اور اس کے جسم پہ پڑی چادر بھی بے شکن تو نہ تھی مگر بے داغ ضرور تھی۔ بیڈ کے ساتھ دو کرسیاں پڑی تھیں۔

بیڈ پہ زندہ لاش کی صورت پڑے شخص کے متعلق اس کے دل میں بڑے سوال تھے مگر وہ شخص اس کے سوالوں کا جواب دینے کے قابل نہ تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکلنے لگی جب باہر سے کوئی اندر داخل ہوا تھا اور اسے سامنے پا کر ہڑبڑا گیا تھا۔

"السلام علیکم۔" سامنے والے نے سنبھلتے ہوئے سلام کیا۔ خولہ نے سر ہلا کر جواب دیا اور پھر بوڑھے پہ نظر ڈال کر اس کی طرف مڑی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"عابد۔ عابد علی۔"

"ہوں۔ کون ہے یہ؟" اس نے بیڈ پہ پڑے وجود کی طرف اشارہ کیا۔

"میں ان کا اٹینڈنٹ ہوں۔" عابد کے جواب سے خولہ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اسے اور کچھ نہیں بتانے والا۔ یقیناً ضامن مصطفیٰ کی طرف سے حکم ہو گا۔ وہ چپ کر کے وہاں سے چلی آئی۔

☆☆☆

وہ کبھی عبدالہادی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اس دن ٹائمنگ کچھ غلط ہو گئی۔ وہ کورٹ کی سیڑھیاں

چڑھ رہی تھی، جب وہ گارڈز کے گھیرے میں سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

"کیسے ہو عبدالہادی؟" وہ نظر انداز کر کے آگے نہ بڑھ سکی۔

"ویسا ہی ہوں۔ لوگ بدل گئے۔" اس کا لہجہ عام سا تھا مگر بات عام سی نہ تھی۔ خولہ کے چہرے پہ خفت سے سرخی پھیلی۔

"آپ ٹھیک کہتی تھیں ایڈووکیٹ خولہ بنت زید۔ کسی پہ بھروسہ۔ وہ بھی آنکھیں بند کر کے۔ ٹھیک نہیں۔"

وہ کہہ کر چلا گیا تھا اور خولہ وہاں سے ہل تک نہ سکی تھی۔ اسے نئے سرے سے سب یاد آنے لگا تھا کہ ضامن مصطفیٰ نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ بھولتا تو خیر اسے کبھی نہ تھا مگر جب زخموں پہ نمک چھڑک دیا جاتا تو اذیت حد سے سوا ہونے لگتی۔ اس وقت بھی کورٹ کی سیڑھیوں پہ کھڑی وہ تکلیف کی اسی انتہا پر تھی۔ اور اس پہ مزید یہ ہوا کہ اس سے سمیع الحق ٹکرا گیا۔ ذلت کے احساس سے اس کا دماغ پھٹنے جیسا ہوا۔ اب وہ ضامن مصطفیٰ کی صورت بھی دیکھنا نہ چاہتی تھی۔ اس شام وہ گھر نہیں گئی۔ وہ ماما بابا کی طرف بھی نہیں گئی۔ ماما اس کی صورت دیکھتیں تو پریشان ہوتیں، سو سوال کرتیں۔ فی الحال وہ کچھ بولنا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ بھی نہیں، ایک لفظ بھی نہیں۔

وہ سمندر کے کنارے چلی آئی۔ اور ایک بڑے سے پتھر پہ آ بیٹھی۔ یہ وہ جگہ نہ تھی، رات کا وہ پہر نہ تھا، یہ وہ پتھر نہ تھا جس پہ وہ کبھی ضامن مصطفیٰ کے ساتھ بیٹھی تھی مگر حد تھی کہ یاد وہی رات آئی۔

"جب میں نے آپ سے کہا کہ بابا چاہتے ہیں کہ آپ کے والد رشتہ لے کر آئیں، آپ تو اپنے بابا سے خفا تھے۔ مجھے لگا آپ میرے لیے ان کے پاس نہیں جائیں گے۔"

"خولہ! میری زندگی میں بہت کم لوگ ہیں جو میرے لیے اہم ہیں، خاص ہیں۔ میں ان کو کبھی بھی کسی قیمت پر بھی کھونا نہیں چاہتا۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔" ضامن مصطفیٰ نے اس کی سیاہی مائل سبز چوڑیوں پہ اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تھا۔ "اور آپ میرے لیے بہت اہم بہت خاص ہیں خولہ۔ آپ کے لیے میری انا، جنگ یا ضد کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔"

اور اس وقت خولہ بنت زید اپنی بخت آوری پہ نازاں ہوئی تھی اور اس وقت خولہ بنت زید اپنی سیاہ بختی پہ ماتم کناں تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آئے اور وہ بانہوں میں سر دیے روتی چلی گئی۔ وہ کبھی زندگی میں یوں نہ روئی تھی مگر جس دن سے اس کے نام کے ساتھ ضامن مصطفیٰ کا نام جڑا تھا وہ بارہا ایسے روئی۔ اور ہر بار آنسو پونچھتے ہوئے یہ عہد کرتی کہ اب نہیں روئے گی، اب ضامن مصطفیٰ کی وجہ سے مزید آنسو نہیں بہائے گی۔ مگر اس شخص کا دھوکا بڑا تھا اور اس کا حوصلہ چھوٹا۔

جب رو رو کر تھک چکی تو سیدھی ہوئی۔ چہرہ صاف کیا اور موبائل اٹھایا جو بہت بار بجا اور خاموش ہوا تھا۔ اس کی طرف دیکھے بنا وہ گاڑی کی طرف آئی۔ گھر پہنچی تو لان میں بیٹھے ضامن مصطفیٰ اس کا چہرہ دیکھ کر ٹھٹکے۔ کپ سے چائے کا دوسرا گھونٹ بھرا نہ گیا۔ جبکہ ساتھ بیٹھے لوگ پکوڑوں، سموسوں اور کیک کی طرف سے توجہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے اس لیے زیادہ غور نہ کر سکے۔ ان کا دھیان ابھی بھی میز پہ موجود لوازمات کی طرف تھا۔

"ہائے بھابی۔" ایک لڑکی نے ہاتھ ہلایا اور میز پہ پلیٹ رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ خولہ ان کی طرف آ گئی۔ وہ ان کو پہچان تو نہ پائی تھی مگر ملنا تو لازم تھا ناں۔ اس کی گھٹی میں گھر آئے مہمان سے خوش اخلاقی سے پیش آنا شامل تھا۔

"ہم کب سے آپ کا ویٹ کر رہے تھے۔" لڑکی نے آگے بڑھ کر اس کے گال سے گال ملایا۔ ضامن سمیت باقی افراد بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے سب سے ہاتھ ملایا۔ جن میں ایک خاتون، ایک دس گیارہ سال کا لڑکا اور تین لڑکیاں شامل تھیں۔

"لگتا ہے آپ نے ہمیں پہچانا نہیں۔" ان میں سے ایک اور لڑکی بولی جس نے آنکھوں میں کاجل بھر رکھا تھا۔ "لونوشی! عجیب بات کرتی ہو۔ پہچانا کیوں نہیں ہو گا۔ ولیمے پہ ملے تھے ہم۔ ساتھ بیٹھے تھے، تصویریں بنوائی تھیں۔" عورت نے فخر کے ساتھ کہتے ہوئے بیٹی کی بات کو رد کیا۔ جب کہ اس نے کاجل بھری آنکھوں والی کی بات سے اتفاق کیا تھا وہ واقعی

ان کو نہیں پہچانی تھی۔ مگر ان پہ ظاہر نہ کرتے ہوئے خوش اخلاقی سے ملی۔

"تم روز اسی وقت گھر آتی ہو بیٹا؟" لڑکیاں چائے اور دیگر لوازمات سے لطف اندوز ہونے کے بعد لان میں موبائل سے تصویریں بنوانے لگیں تو خاتون نے غور سے خولہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ آج کچھ بزی تھی۔" اس نے آہستہ سے خاتون کے سوال کا جواب دیا۔ ضامن نے غور سے اسے دیکھا۔

"اتنی مصروفیت اچھی نہیں۔ گھر کو وقت دیا کرو زیادہ۔ شوہر کو وقت دیا کرو زیادہ۔ دیکھو ناں اتنے بڑے گھر میں پہلے ہی کوئی عورت نہیں، نوکروں کے سر پہ پڑا ہے۔ ضامن بے چارے نے بھی اکیلے ہی زندگی گزاری ساری۔ اب شادی کر کے بھی سب کچھ ویسا ہی چلے تو فائدہ۔ شوہر پہلے گھر آئے اور بیوی بعد میں تو اچھی بات تو نہیں ناں۔" خاتون میٹھی میٹھی زبان میں سمجھا رہی تھی۔ اور سمجھا کے رہی تھی ایک وکیل کو۔ جسے فوراً سمجھ آ گئی تھی کہ یہ عورت اس کی ساس بننے کے چکر میں ہے۔

"میں ذرا چینج کر لوں۔" اس نے وہاں سے اٹھنا مناسب جانا۔

"ذرا کچن بھی دیکھ لیجیے گا خولہ۔ مامی چاول نہیں لیتیں۔" ضامن نے کہا تھا کہ مامی جان ڈنر کر کے جائیں گی۔ وہ سر ہلا کر جانے لگی۔

"بھابی پلیز۔ ایک سیلفی۔" پیلی فراک والی لڑکی جلدی سے اس کی طرف بڑھی۔

"سوری۔ میں فریش نہیں اس وقت۔" صاف گوئی سے اسے منع کر کے خولہ اندر چلی گئی۔

"یہ اتنا کم بولتی ہے یا ویسے ہی ہم سے بولنا نہیں چاہتی۔" مامی جان کو اس کی کم گوئی بھائی نہ تھی بلکہ یوں کہیے کہ جو اہمیت ضامن مصطفیٰ انہیں دیتے تھے، وہ اہمیت ان کی بیوی کی طرف سے نہ ملی تو بے عزتی سی محسوس ہوئی۔

"نہیں۔ آپ کو یوں ہی محسوس ہوا ہے۔" ضامن نے ہلکا سا مسکرا کر انہیں تسلی دینی چاہی۔

حالانکہ ان کا اپنا دھیان خولہ کی روئی روئی آنکھوں میں اٹکا ہوا تھا۔

کاجل بھری آنکھوں والی نوشی نے بہت غور سے انہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

لباس تبدیل کر کے وہ آئینے کے سامنے آئی۔ دو تین دفعہ ڈھیرے ڈھیرے بالوں میں برش چلایا اور پھر بیڈ پر آ بیٹھی۔ اس وقت وہ اتنی دل گرفتہ تھی کہ ایک خوش اخلاق میزبان بننے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا، لائٹ آف کرے اور چادر تان کر سو جائے۔ کسی کا سامنا نہ کرے۔ مگر پھر اسے ماما یاد آئیں، بابا یاد آئے۔ ان کے اخلاق یاد آئے۔ وہ ثروت زید کی بیٹی تھی۔ وہ پروفیسر زید ابصار کی بیٹی تھی۔ یہ حرکت کر نہیں سکتی تھی۔ وہ اٹھی اور مرے مرے قدم اٹھاتی ہوئی نیچے آ گئی۔

کچن سے آوازیں آ رہی تھیں۔ غلام نبی وہیں تھا۔ اس نے فریزر میں سے گوشت کا پیکٹ نکال رکھا تھا، سبزی کاٹ رکھی تھی۔ اور کباب کا مسالا بھی تیار کر رہا تھا۔ وہ بھی مصروف ہو گئی۔

"مجھے غلام کہہ کر بلاتی تھیں۔ ایک دن میں نے کہہ دیا۔ مجھے غلام نبی کہا کریں۔ میں صرف اپنے نبی ﷺ کا غلام ہوں اور کسی کا نہیں۔ تب سے تو پیچھے ہی پڑ گئی ہیں میرے۔"

خولہ نے محسوس کیا تھا کہ غلام نبی ان مہمانوں کی آمد پہ کچھ خوش نہیں تھا۔ وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ حالانکہ یہ اس کا مزاج نہ تھا۔ وہ نہایت تمیز دار تھا اور خوش مزاج بھی تھا۔ زیادہ دیر نہیں لگی۔ یخنی تیار ہونے تک اس نے خود ہی اپنی چڑ کی وجہ بیان کر دی تھی۔ اس نے دل میں شکر کیا کہ بابا نے اسے ملازم کو تمیز کے ساتھ مخاطب کرنے کا درس دے رکھا تھا۔ ورنہ کبھی وہ بھی صرف غلام کہتی تو کس قدر دل دکھی ہوتا اس کا۔ سچ ہے کہ اکثر ہم بھول جاتے ہیں کہ ہمارے ملازم بھی دل، انا، عزت نفس رکھتے ہیں۔

پیلی فراک والی لڑکی کچن میں ایک بار آئی تھی۔ مدد کرنے کے لیے نہیں سیلفی لینے کے لیے۔ کبھی فریج

کے پاس کبھی واٹر ڈسپنسر کے پاس تو کبھی مائیکرو ویو کے پاس۔ خولہ کے پچھلے رویے کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے ساتھ سیلفی لینے کی کوشش نہ کی تھی مگر اس کی نگاہ سے بچ کر ایک تصویر میں بیک گراؤنڈ میں اسے لے لیا تھا تاکہ دوستوں کو دکھا سکے کہ اپنے امیر و کبیر کزن کی وکیل بیوی کے ساتھ وہ کس قدر بے تکلف ہے۔ خولہ اب خود پہ قابو پا کر اپنا غم اور غصہ کہیں پیچھے رکھ کر کوکنگ میں لگی ہوئی تھی اور مہمانوں کے بارے میں سوچ بھی رہی تھی۔

کیا یہ خاتون ضامن مصطفیٰ کے سگے ماموں کی بیوی تھیں؟

وہ جانتی تھی کہ غلام نبی کے پاس ہر سوال کا جواب ہے مگر اسے اس سے پوچھنا مناسب نہیں لگتا تھا۔ اور ضامن مصطفیٰ سے وہ خود سے اب کوئی بات نہیں کرتی تھی اس لیے کئی باتوں کئی رشتوں سے وہ اب تک ناآشنا تھی۔ ہاں۔ وہ مفلوج بوڑھا اب اس کے لیے پہیلی نہ رہا تھا۔ جس دن وہ اس کے کمرے میں گئی تھی۔ یقیناً ضامن مصطفیٰ کو اطلاع مل گئی تھی۔ اگلی صبح وہ اس بوڑھے کو وہیل چیئر پہ بٹھا کر لان میں لے کر آئے تھے اور خولہ کو بلوا کر اس کا تعارف کروایا تھا۔

"ماما سائیں۔ یہ میری کنوار ہے۔"

بوڑھے کی آنکھوں سے یا چہرے پہ کوئی تاثر نہ ابھرا۔ وہ یونہی ہلتے سر کے ساتھ کسی غیر مرئی نقطے کی طرف گھورتا رہا۔

"خولہ! یہ میرے ماما ہیں۔ میں انہیں ماما سائیں کہتا ہوں کیونکہ میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔"

"تو کیا اس خاتون کو بھی مامی اس لیے کہا جاتا ہے کہ ضامن مصطفیٰ ان کی عزت کرتے ہیں؟" خولہ نے اوون سے ڈرم اسٹکس کی ٹرے نکالتے ہوئے سوچا۔ کھانا سرو ہونے سے کچھ دیر پہلے مامی کی ایک اور بیٹی کچن میں آئی تھی۔ اور ہر شے کا ناقدانہ نگاہوں سے جائزہ لیا۔

"جب پتا چلا کہ اداسائیں کسی وکیل سے شادی کررہے ہیں تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔" اداسائیں کی اماں بھی بڑی پڑھی لکھی بی بی تھیں جی۔" غلام نبی کو جانے کیوں آج اچانک اس لڑکی کے سامنے اپنی خوشی کا اظہار کرنا یاد آیا تھا۔ خولہ تو نہ سمجھ پائی پر وہ لڑکی جس کا نام نوشابہ تھا، خوب سمجھ گئی اس لیے غلام نبی کو گھور کر رہ گئی۔

"کھانا بس تیار ہے۔" خولہ نے خوش دلی سے اس لڑکی سے کہا۔

"کھانا تو انسان اپنے گھر بھی کھا لیتا ہے۔ ہم تو آپ کے ساتھ کچھ وقت گزارنے آئے تھے۔"

"سوری۔ بس اب میں فری ہوں۔ کرتے ہیں گپ شپ۔" خولہ مسکرائی۔

"آپ تو ہماری طرف آئی نہیں۔ امی کا کتنا ارمان تھا کہ سسرال میں سب سے پہلے آپ ہماری دعوت کھائیں۔"

خولہ محض مسکرا کر رہ گئی۔ یہ سچ تھا کہ اس نے شادی کے بعد کی کوئی دعوت نہ کھائی تھی سوائے اقصیٰ اور تیمور کے ڈنر کے۔ اس نے کسی بھی دعوت میں جانے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ ضامن خود ہی شائستگی کے ساتھ سب کو منع کر دیتے تھے۔ اپنے خاندان کی طرف سے آنے والی دعوتوں کو وہ طریقے سے انکار کر دیتی۔

مامی اور ان کے بچے کھانا کھانے کے بعد گھنٹہ بھر بیٹھے پھر ضامن انہیں چھوڑنے گئے تھے۔ وہ غلام نبی کے ساتھ برتن سمیٹنے کے بعد اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆☆☆

"کہاں تھیں تم؟ میں نے اتنی کالز کیں۔" ضامن مصطفیٰ نے گھڑی اتارتے ہوئے پوچھا۔

خولہ کا اس شخص کی طرف دیکھنے کو جی چاہتا تھا نہ ہی اس کی آواز سننے کو اور نہ ہی اس کی کسی بات کا جواب دینے کو۔

"خولہ! کہاں تھیں تم؟" وہ اس کی طرف مڑے۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے ضامن مصطفیٰ کہ کہاں تھی میں۔ جہاں بھی چلی جاؤں مقدر نہیں بدلنا

"اس کی ڈبڈبائی آنکھیں، اس کا بھیگا لہجہ۔ تو وہ صحیح سمجھ رہے تھے۔ جب وہ گھر آئی تھی تب ہی اس کی آنکھیں دیکھ کر چونک اٹھے تھے۔ کھانے کی میز پر بھی وہ اس کی طرف غور سے دیکھتے رہے مگر خولہ ان کی طرف نہ دیکھ رہی تھی۔ وہ بظاہر نوشابہ، نبیلہ، زوبیہ اور شمسہ سے باتیں کرتی رہی۔ مسکراتی بھی رہی اور ہنستی بھی رہی مگر ضامن کو لگ رہا تھا کہ کچھ تو ہوا ہے۔ کچھ ایسا جس نے ان دونوں کی بیچ کی خلیج کو مزید بڑھا دیا۔

"خولہ!" ضامن نے اس کے قریب آ کر اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر اس کا رخ اپنی طرف پھیرا۔

"سمیع الحق ملا تھا آج مجھے۔" اس نے ان کا ہاتھ نہیں ہٹایا تھا بلکہ ان کی آنکھوں میں گلابی ڈوروں والی آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا۔

"کون سمیع الحق؟"

"وہی آپ کے کرم فرماؤں میں سے ایک۔ جن کے لیے آپ نے مجھ سے شادی کی۔"

"میں نے صرف اپنے آپ کے لیے تم سے شادی کی ہے۔" ضامن نے تصحیح کرنی چاہی۔

"اچھا۔" وہ ہنکارا بھر کر ہنسی۔

ضامن کو تکلیف ہوئی۔ اس کا رونا بھی انہیں تکلیف دیتا تھا اور ہنسنا بھی۔ یہ ہنسی اس کی تھوڑی تھی۔ اس کی ہنسی تو وہ تھی جس کو سن کر ان کا دل دھڑکنا بھول جاتا تھا۔ اور یہ ہنسی سن کر ان کا دل پھٹنے لگتا ہے۔

"سمیع الحق کہہ رہا تھا۔ بھابھی کیس چل رہے ہیں ایک دو۔ میں اس کا مقدمہ لڑوں تو وہ بےفکر رہے گا۔ میں نے کہا کہ بےفکر ہی رہیے۔ ضامن مصطفیٰ نے اپنے دوستوں کے لیے ہی تو شادی کی ہے مجھ سے۔ کسی کے لیے مقدمہ لڑوں۔ کسی کے لیے مقدمہ چھوڑ دوں۔"

ضامن کے ہاتھ اس کے کندھوں سے ہٹ گئے۔ اور خولہ پھر ہنسی تھی استہزائیہ سی ہنسی۔ ضامن نے سوچا یہ ہنسی سننے سے پہلے وہ روئی کیوں نہیں رکھ لیتے کانوں میں۔ یا ان کی حس سماعت کام کرنا کیوں نہیں چھوڑ دیتی۔

"اگر ہم بیٹھ کر آرام سے بات کر لیں تو سب مسئلے حل ہو سکتے ہیں خولہ!"

"بیٹھ کر آرام سے بات کرنے والا وقت چلا گیا ضامن مصطفیٰ!" وہ پھنکاری۔

"آپ مجھ سے بات کرتے، مجھے تھپڑ مار کر، پستول کنپٹی پر رکھ کر مجھ سے اپنی بات منواتے۔ شاید آپ کی بات مان لیتی شاید آپ کی مجبوری سمجھ لیتی۔ مگر آپ نے۔ ضامن مصطفیٰ! آپ نے میرے بابا کو وہ تکلیف دی جس کی شدت سے آج بھی راتوں میں اٹھ کر سینہ پکڑ کر بیٹھ جاتے ہوں گے۔ کبھی نہیں بھولوں گی۔ کبھی نہیں معاف کروں گی۔" اس کا ہر لفظ پتھر پہ لکیر جیسا تھا۔

"میں ان سے معافی مانگ لوں گا۔" وہ ہارے ہوئے سے لہجے میں بولے۔

"ہاں مانگ لیں۔ ہو سکتا ہے وہ معاف کر دیں۔ لیکن خولہ بنت زید کبھی معاف نہیں کرے گی۔" وہ اٹل لہجے میں کہتی ان کے پاس سے گزر کر جانے لگی۔

ضامن نے اس کا بازو تھام لیا۔

"میری ماں میری بہت بڑی کمزوری ہے خولہ! جن لوگوں نے مشکل وقت میں ان کا ساتھ دیا، میں ان کا مقروض ہو جاتا ہوں۔" وہ اپنی نصف بہتر کو بہت کچھ بتانا چاہتے تھے۔

"میرا باپ میری بہت بڑی کمزوری ہے ضامن مصطفیٰ! جن لوگوں نے انہیں مشکل وقت دیا، میں ان کی دشمن ہو جاتی ہوں۔" وہ اپنا بازو چھڑواتے ہوئے اپنے جیون ساتھی کو بہت کچھ جتا گئی۔

"تم ظالم ہو رہی ہو خولہ!"

"آپ ظالم ہو چکے ضامن مصطفیٰ!"

"خولہ! تم بھول گئی کہ ہمارے درمیان محبت کا رشتہ ہے۔"

"مجھے یاد ہے کہ ہمارے درمیاں صرف نفرت کا رشتہ ہے۔"

"نفرت۔ تم مجھ سے کر نہیں سکتیں۔" ضامن کے لہجہ پراعتماد تھا۔

"محبت۔ میں آپ سے کر نہیں سکتی۔" اس کا لہجہ پراعتماد نہیں تھا۔ زبان ڈگمگا گئی تھی۔ آنکھوں کے گلابی ڈورے مزید گہرے ہوئے تھے مگر ضامن مصطفیٰ سمجھ گئے تھے کہ وہ اپنے کہے لفظوں کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ وہ ڈر گئے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں دو عورتوں سے شدید محبت کی۔ ایک کو کھو چکے تھے، دوسری کو کھونے سے ڈر گئے تھے۔

☆☆☆

دیوار پہ تصویریں۔ ہر تصویر مہندی والی رات کی۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی دیوار گیر تصویر کے پاس آئی۔

تصویر میں ضامن مصطفیٰ اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اور وہ منہ پہ ہاتھ رکھے ہنس رہی تھی۔ وہ شاید عباس کی کسی بات پر ہنس رہی تھی یا ربیعہ مامی کے کسی چٹکلے پر۔

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ یاد نہ آیا تو ضامن مصطفیٰ کی طرف والی بیڈ ٹیبل پہ رکھی تصویر کو دیکھا۔

پیلے دوپٹے نے گھونگھٹ کی طرح اس کا آدھا چہرہ چھپا رکھا تھا، اور بے اختیار کسی بات پہ ہنستے ہوئے اس کے موتیوں جیسے دانت نظر آرہے تھے۔ شاید وردہ نے اس کے کان میں شرارت بھرے لہجے میں کوئی سرگوشی کی تھی۔ کیا سرگوشی تھی وہ، تصویر کے نزدیک آتے ہوئے اس نے وردہ کے الفاظ یاد کرنے چاہے۔

ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھی تصویر میں سر پیچھے کو گرائے بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔ اس کا دوپٹہ پیچھے کو سرک گیا تھا اور جھومر صاف دکھائی دیتا تھا۔ شاید انصی یا شاید مُرک کی کسی بات پہ وہ یوں ہنسی تھی، اس نے ایک بار پھر یاد کرنے کی کوشش کی۔

اسے لگا اسے مرض نسیاں لاحق ہو گیا ہے۔ ایسی کوئی بات یاد نہ آئی بس یہ وہ یوں بے دم ہو کر ہنسا کرتی تھی۔ بہت دیر وہ ان تصویروں کو تکتی رہی۔

"البم دیکھے تم نے؟" ضامن کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ کب کمرے میں آئے تھے، اسے پتا ہی نہ چلا۔

"ان یادگاروں کو دیکھ کر خود کو اذیت دینے کا مجھے شوق نہیں۔" اس نے پرس ایک طرف ڈالا اور خود ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ پھر واش روم میں۔ ضامن انتظار کرتے رہے۔ وہ اس کا یونہی انتظار کیا کرتے تھے۔ آج تو وہ اپنے بابا کے گھر گئی تھی۔ انتظار بنتا تھا۔ عام دنوں میں بھی رات کے کھانے کے بعد جب تک وہ کمرے میں آ نہ جاتی، وضو کر کے نمازِ عشاء نہ ادا کر لیتی، ڈھیلا ڈھالا سا رات کا لباس پہن کر بیڈ پر نہ لیٹ جاتی، وہ اس کا انتظار کرتے رہتے۔ اس کو دیکھتے رہتے۔ اور جب وہ سو جاتی تو اٹھ کر باہر ٹیرس پہ آجاتے۔

"ماما اور بابا کیسے تھے؟" وہ بیڈ پر آکر لیٹی تو انہوں نے پوچھا۔ ہاں۔ اس طرح بہانے بہانے سے اس سے مخاطب ہونا بھی ان کی روٹین میں تھا۔

"ٹھیک تھے۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔ اور ان سے رخ موڑ کر لیٹ گئی۔ جب ضامن بیڈ پہ ہوتے تو وہ بائیں کروٹ پہ لیٹتی۔ پھر دائیں کروٹ پہ آجاتی کیونکہ عادت جو یہ بنی ہوئی تھی۔ اور اس کروٹ سے ضامن جو سامنے نظر آتے تو پھر کروٹ پھیر لیتی۔

"بائیں کروٹ سونا صحت کے لیے ٹھیک نہیں۔" انہوں نے ایک بار اس سے کہا تھا۔

"ضامن مصطفیٰ کا چہرہ دیکھنا بھی صحت کے لیے ٹھیک نہیں۔"

"پیار سے دیکھو تو یہ چہرہ دوا ہے۔"

"میرے لیے یہ چہرہ دعا تھا۔" اس کے جواب نے ایسی چپ رچائی کہ پھر دونوں میں سے کوئی نہ بولا تھا۔

کچھ دیر ان کی نگاہ اس پہ جمی رہی پھر سامنے

تصویر پہ جا ٹھہری۔ وہ منہ پہ ہاتھ رکھے ہنس رہی تھی اور ضامن محبت بھری نگاہ سے اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ وہ بڑے انمول لمحے تھے مگر وہ رات بڑی ظالم رات تھی۔

انہوں نے سر جھٹکا۔ وہ اس رات کا ستم یاد کرنا نہ چاہتے تھے۔ وہ بس ان لمحوں کو یاد کرنا چاہتے تھے جن لمحوں میں ان کی خولہ ہنس رہی تھی اور ان کی سماعتیں گیت سن رہی تھیں۔ انہوں نے ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھی تصویر کی طرف دیکھا۔ وہ سر پیچھے گرائے ہنس رہی تھی۔ انہوں نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھی تصویر اٹھالی۔

گھونگھٹ میں اس کا آدھا چہرہ چھپا تھا۔ وہ ہنس رہی تھی۔

کتنا ہنستی تھی یہ لڑکی۔ اور اب؟

انہیں اپنا آپ قاتل لگنے لگا۔

خولہ نے کروٹ بدلی۔ اس کی نگاہ اپنی تصویر پہ پڑی جس پہ ضامن ہاتھ پھیر رہے تھے۔ اس نے جلدی سے پھر کروٹ بدل لی۔ آنکھوں میں جانے کہاں سے نمی آٹھہری۔

☆☆☆

"بی بی جی! میرے خاوند کو جیل میں ڈال دیں کچھ دن۔"

خولہ کو چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اچھو لگا۔ اس نے کھانستے ہوئے انوکھی فرمائش کرنے والی مسمات ممتاز کو گھورا۔

"بڑا تنگ کرتا ہے مجھے اور بچوں کو۔ جو کماتی ہوں، پہلے ہاتھ پھیلا کے کھڑا ہوتا ہے۔ یہ بھی نہیں سوچتا کہ بچوں کے پیٹ کہاں سے بھروں گی۔ جیل میں چند دن چھترول ہوگی تو شاید سدھر جائے۔"

"تم چھوڑ کیوں نہیں دیتیں اسے؟" اقصیٰ نے کپ اٹھا کر لبوں سے لگاتے ہوئے قصہ ہی مکانے کا مشورہ دیا۔

"خاوند کو چھوڑنا آسان کام نہیں۔" ممتاز نے اپنی انگلیاں چٹخائیں۔ خولہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"ظلم سہتی رہو۔ باقی چھوڑنا نہیں ہے۔" اقصیٰ بڑبڑائی۔

"وہ میرے بچوں کا باپ ہے۔" اس نے مجرموں کی طرح سر جھکایا۔

"بچوں کا باپ ہونے کا کون سا فرض نبھاتا ہے وہ۔ کماتی تم ہو، کھلاتی تم ہو، پہناتی تم ہو، پڑھاتی تم ہو۔ پھر فائدہ ایسے باپ کا جو اپنے بچے کے منہ کا نوالہ چھین کر کھا جاتا ہو۔" اقصیٰ کو اس کے گھر کے حالات، اس کے نکمے میاں کی خودغرضیاں سب کی خبر تھی۔ دو سال سے وہ اس کے گھر میں کام کر رہی تھی اور آج تک اسے پورا کھانا کھاتے نہ دیکھا تھا۔ کچھ نہ کچھ بچا لیتی اور اپنے بچوں کے لیے لے جاتی مگر بچے کے پیٹ تک پہنچتا کم ہی تھا۔ شاپر یا پلیٹ میں جو کچھ بھی ہوتا، دروازے پہ بیٹھا اس کا میاں دبوچ لیتا۔ اس کی تنخواہ پہ بھی وہ یوں ہی اپنا حق جتاتا۔ شروع میں تو وہ پہلی تاریخ کو اقصیٰ کے گھر پہنچ جاتا تھا بیوی کی تنخواہ لینے مگر اقصیٰ اور تیمور نے جو جھاڑا تو پھر یہ ہمت نہ کی۔

"بس باجی۔ نام تو ہے اس کا کہ ممتاز کا گھر والا ہے۔ ورنہ اکیلی عورت کو لوگ کہاں جینے دیتے ہیں۔" ممتاز نے زندگی کو جس رنگ ڈھنگ میں دیکھا، اس کے اپنے تجربے تھے اور وہاں بیٹھی بظاہر اس کے دکھڑے سنتی خولہ کے اپنے تجربے تھے۔

کیوں تھی وہ اب تک ضامن مصطفیٰ کے ساتھ؟ کیا وہ بھی لوگوں کی، ان کی باتوں کی، ان کی نظروں کی پرواہ کرنے لگی تھی۔

ایسا ہی تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنے لیے ہر آنکھ میں رشک دیکھا تھا، ہر جملے میں ستائش سنی تھی۔ اسے ڈر تھا۔ ہاں وہ ڈرتی تھی کہ کوئی اسے ترس بھری نگاہ سے تکے۔ کوئی اسے "چچ چچ۔ بے چاری" کہے۔

چائے کا کپ خالی ہوتے تک اسے ادراک ہو گیا تھا کہ وہ بہت کمزور ہے۔ اور اپنے آپ کو بہت بہادر جاننے والی کو بڑا دھچکا لگا تھا۔ وہ یہ سہہ نہ پائی۔

"ایسے مرد کا نام بھی بھلا کس کام کا۔ چھوڑ دو

آئے۔ ممتاز کی طرف دیکھتے ہوئے جب وہ بولی تو لہجہ بہت سنجیدہ تھا۔اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ عام عورت نہیں بنے گی۔وہ دوسروں کے لیے لڑتی آئی تھی۔اب اپنے آپ کے لیے لڑے گی۔بھلے کہے دنیا اسے۔

''چچ چچ۔۔بے چاری۔''

دل میں کہیں شور سا اٹھ رہا تھا۔کیا محض یہی وجوہات تھیں جن کی بنا پر وہ ابھی تک ضامن مصطفیٰ کے ساتھ تھی۔یا کوئی اور وجہ بھی تھی۔

''نن۔نہیں۔اور کوئی وجہ نہیں۔دل ول کا مزید کوئی قصہ نہیں۔محبت وحبت کی اور کوئی کہانی نہیں۔''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دل کے شور کو دبانے کی کوشش کرنی چاہی۔اور دوپٹے کے پلو سے آنکھیں اور ناک پونچھتی ممتاز کو دیکھا۔ممتاز تو نہیں لگتا تھا کہ اقصیٰ یا اس کے مشورے پہ عمل کرے گی مگر وہ اب ضرور کچھ نہ کچھ کرے گی۔اور ایسے ہی عام سے انداز میں ضامن مصطفیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر اس سے یہ نہیں کہے گی۔

''مجھے طلاق چاہیے۔''

بلکہ وہ اپنے نکاح کی طرح طلاق کو بھی ضامن مصطفیٰ کے لیے ایسا ''خاص'' بنائے گی کہ وہ مرتے دم تک یاد رکھیں گے اور خولہ بنتِ زیدان کی زندگی سے جا کر بھی موت تک ان کی اکھڑی سانس بنی رہے گی۔

بڑے بڑے فیصلے کرتے ہوئے وہ گھر آئی۔ماما سائیں کو اس کا اٹینڈنٹ عابد لان میں لیے گھوم رہا تھا۔اس نے ایک نظر انہیں دیکھا۔عابد کے سلام کا سر ہلا کر جواب دیا اور اندر آ گئی۔اس وقت اس نے مصطفیٰ امین کو تیزی سے لائبریری سے نکلتے دیکھا۔اسے دیکھ کر وہ رکے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر فوراً چلے گئے۔اس ایک لمحے میں ہی اس نے ان کی آنکھوں میں نمی دیکھ لی تھی۔

ضامن مصطفیٰ کی نفرت اور محبت ڈس ڈالنے والی تھی۔یہ انسان تھا یا سنکچور؟

تاسف اور دکھ سے سر ہلاتے ہوئے وہ اندر آئی تو ضامن مصطفیٰ اپنی ماں کی تصویر کے سامنے کھڑے تھے۔

''کیوں کرتے ہیں آپ اپنے بابا کے ساتھ ایسا؟'' وہ ان کے پیچھے آ کر کھڑی ہوئی۔

''مصطفیٰ امین کا چہرہ دیکھ کر میرا خون کھولتا ہے۔''

''وہ آپ کی محبت میں یہاں آتے ہیں اور آپ ان کے ساتھ یہ ناروا سلوک رکھتے ہیں۔اگر ان سے کوئی غلطی بھی ہوئی ہے تو آپ انہیں معاف۔۔۔''

''معاف نہیں کر سکتا میں اس شخص کو جس نے میری ماں کو تکلیف دی۔'' وہ اس کی طرف پلٹے اور سخت لہجے میں اس کی بات کاٹی۔

''تکلیف۔'' وہ استہزائیہ ہنسی ''تکلیف تو آپ نے بھی دی ضامن مصطفیٰ مجھے۔'' وہ پشت پہ ہاتھ باندھے سنجیدگی سے اسے دیکھتے رہے۔ ''پھر خود کو معاف کیوں کیے بیٹھے ہیں آپ؟ کیا آپ کی کوئی چارج شیٹ نہیں بنتی'' اس کا لہجہ زہر خند تھا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے، میں نے خود کو معاف کر دیا۔نہیں، خود کو کٹہرے میں بھی کھڑا کیا ہے، خود پہ فرد جرم بھی عائد کی ہے اور سزا ابھی بھگت رہا ہوں''

''سزا آپ نے ابھی بھگتی کہاں ضامن مصطفیٰ۔''

''یہ سزا ہی تو ہے۔تم میرے اتنے قریب ہو۔''

انہوں نے اس کی لٹ اس کے چہرے سے ہٹائی۔خولہ بدک کر پیچھے ہوئی۔ضامن تھکی تھکی سی ہنسی ہنسے۔

''یہ سزا ہی تو ہے خولہ، تم میرے اتنے قریب ہو اور مجھ سے اتنی دور ہو۔''

''میں آج بابا کی طرف جا رہی ہوں۔'' اس نے ان کی طرف دیکھا نہیں تھا۔

''ہم دونوں چلتے ہیں۔''

''نہیں۔'' خولہ نے ہاتھ اٹھا کر منع کیا۔ ضامن مصطفیٰ کا چہرہ دیکھ کر میرے بابا کا خون کھولتا ہے۔''

"اور ضامن مصطفیٰ کا چہرہ دیکھ کر تمہیں کیا کیا ہوتا ہے؟" وہ مسکرا کر پھر اس کے قریب آئے۔

"مجھے۔ مجھے یہ چہرہ دیکھ کر۔" اس نے ان کی طرف دیکھا تھا۔ سبز سنہری آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ کر وہ گڑبڑائی۔ "مجھے لگتا ہے جیسے زہر کا گھونٹ پی لیا۔" اس نے جلدی سے نظریں پھیر لی تھیں۔ اسے ڈر سا ہوا تھا کہ ان آنکھوں میں جو رنگ تھے، وہ پھر انہیں محبت کے رنگ سمجھنے کی بھول نہ کر بیٹھے۔ وہ پھر سے نہ ڈس لی جائے۔ ضامن ہلکا سا ہنسے تھے۔

"اور میں بتاؤں مجھے اپنی خولہ کا چہرہ دیکھ کر کیا لگتا ہے؟" انہوں نے گھمبیر لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے جاننے کی ضرورت نہیں۔" خولہ نے جلدی سے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ ضامن نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"باتوں کو ادھورا چھوڑ کر نہیں جاتے۔" مصطفیٰ امین کو دیکھ کر مزاج جو برہم ہوا تھا، اس کے آثار اب نظر نہ آتے تھے۔ جب وہ سامنے ہوتی تھی تو ان کے مزاج پہ اتنا ہی اثر رکھتی تھی۔

"فکر نہ کریں، ادھورے سلسلے جلد مکمل ہو جائیں گے۔" عجیب سے انداز میں کہتے ہوئے اس نے ان کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اس وقت ضامن مصطفیٰ بالکل سمجھ نہ پائے تھے کہ اس کے کہے کا مطلب کیا ہے۔

☆☆☆

خولہ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور ماتھے پہ ابھی سے یوں پسینہ آنے لگا تھا جیسے چوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔ کن اکھیوں سے ضامن مصطفیٰ کو دیکھتے ہوئے اس نے ماتھا صاف کیا۔ اس کے ہاتھوں میں ہلکی کپکپاہٹ تھی۔ جیسے ہی ضامن واش روم گئے وہ سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھی۔ ٹائم اس نے تین چار دن نظر رکھ کر کیلکولیٹ کر رکھا تھا۔ شیو بنانے اور باتھ لینے میں وہ پچیس سے تیس منٹ لیتے تھے۔

اس نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا ان کا کی چین لیا، جس میں ایک ان کی گاڑی اور دوسری الماری کی چابی تھی۔ اسی الماری کے اندر باقی چابیوں کا گچھا تھا۔ اس نے جلدی سے الماری کھول کر وہ گچھا نکالا اور اندازہ کرنے لگی کہ لاکر کی چابی کون سی ہو گی۔ اندازے سے ایک چابی اس نے لاکر میں لگائی، وہ نہیں لگی۔ اس نے دوسری ٹرائی کی، ناکام رہی۔ اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ شاید اسی لیے کوئی چابی لگ نہیں رہی تھی۔ اس نے جھنجلا کر ایک چابی واپس نکالتے ہوئے دوسری لگانی چاہی جب اس کے جسم نے ایک جھٹکا کھایا اور پھر وہ وہیں کی وہیں منجمد ہوئی۔

دو ہاتھ اس کے اطراف سے آئے اور نرمی سے اس کے ہاتھ سے وہ گچھا لے لیا۔ اسے لگا وہ ساری زندگی ہل نہ پائے گی۔ اس وقت ضامن مصطفیٰ اس کے پیچھے یوں کھڑے تھے کہ وہ ان کے بازوؤں کے گھیرے میں تھی۔ ان کے آفٹر شیو کلون کی مہک تک وہ محسوس کر سکتی تھی۔ ان کی سانسوں کی حرارت تک اس کے آس پاس تھی۔

انہوں نے گچھے میں سے ایک چابی سیف میں لگائی اور لاکر کھول کر اس کے سامنے کر دیا۔

"ضامن مصطفیٰ اور اس کی ہر شے تمہاری ہے خولہ۔ جیسا چاہو سلوک کرو، جسے چاہو اٹھا لو، جسے چاہو پھینک دو۔" مدھم سے لہجے میں کہتے ہوئے وہ پیچھے ہٹ گئے۔

وہ لاکر اس کے سامنے تھا۔ جو چیز وہ چاہتی تھی وہ بھی شاید اسی میں تھی مگر وہ اس لاکر کی کسی شے کو چھو تک نہ سکی۔ وہ واقعی رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔ چہرے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے وہ مڑی اور حواس بحال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے تن کر کھڑی ہوئی۔

"مجھے۔ مجھے کچھ لینا تھا۔" اس نے اپنے لہجے کو ہر ممکن طرح سے ہموار رکھنے کی کوشش کی مگر ہلکی سی لرزش برقرار رہی۔

ضامن چونکے اور پھر غور سے اس کی طرف

دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا؟"

"ہر شے پہ میرا حق ہے تو مجھے بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں کیا اٹھا رہی ہوں، کیا پھینک رہی ہوں۔" اس کا ازلی اعتماد بحال ہونے لگا تھا۔

ضامن ہنس دیے۔ اور لاکر کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اسے جو چاہیے، وہ لے، لے اور خود شاور لینے چلے گئے۔ اس وقت انہیں قطعی اندازہ نہ تھا کہ وہ کتنی بڑی غلطی کر رہے ہیں۔

اور پھر تین دن بعد لاکر میں سے کچھ ضروری کاغذات نکالتے ہوئے وہ دھک سے رہ گئے۔ انہوں نے خولہ کو لاکر کھول کر دینے کے بعد ایک بار بھی نہ سوچا تھا کہ اس نے کیا نکالا ہوگا۔ محبت واقعی اندھا کر دیتی ہے۔

انہوں نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے ایک بار پھر سارے پیپرز کو ادھر ادھر کر کے دیکھا۔ وہاں وہ پیپر نہ تھا۔ وہ حقیقت میں پریشان ہوئے اور خولہ کو ڈھونڈتے ہوئے لان کی طرف آئے۔

"خولہ! وہ پیپر کہاں ہے؟"

"کون سا پیپر۔" اس نے موتیا کی کلیوں پہ جھکے جھکے اطمینان سے پوچھا۔ سفید پاجامے کے ساتھ پہنی ہوئی لان کی سفید اور ہری پھول دار قمیص اس کے جھکے ہونے کی وجہ سے زمین کو چھو رہی تھی۔ اسی طرح انہوں نے پہلے جب اسے دیکھا تھا تو سحر زدہ سے دیکھتے چلے گئے تھے اور پھر سحر زدہ سے اس کی کئی تصویریں لیتے چلے گئے۔ مگر آج ان کی پریشانی نے انہیں زیادہ دیر سحر زدہ نہیں رہنے دیا۔

"تم جانتی ہو۔ میں کس پیپر کی بات کر رہا ہوں۔"

"نہیں میں نہیں جانتی۔" اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہ آیا۔

"خولہ! میں اس اگریمنٹ کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔" انہوں نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر ہر لفظ ادا کیا۔

"کس اگریمنٹ کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟" موتیا کی مہک اپنے اندر اتارتے ہوئے اس نے بظاہر سکون سے پوچھا یہ اور بات کہ اندر تلاطم برپا تھا۔

"میں۔ میں اس معاہدے کی بات کر رہا ہوں جو۔ جو۔"

"رک کیوں گئے ضامن مصطفیٰ۔ جملہ مکمل کیجیے۔" اس نے موتیا کی کلی توڑ کر اپنے بالوں میں لگائی۔ اور اٹھلا کر ان کی طرف دیکھا۔ ضامن کو خولہ پہ کبھی غصہ نہ آیا تھا مگر آج جھنجلانے لگے تھے۔

"وہ پیپر کہاں ہے خولہ؟" انہوں نے اس کا بازو پکڑ کر جھٹکا دے کے اسے اپنے قریب کیا اور سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"اسے تو میں نے اپنے نکاح نامے کے ساتھ Staple کر کے رکھ دیا ہے۔" وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ "اور فکر نہ کریں، بڑی ترتیب سے رکھا ہے۔ پہلے اگریمنٹ پھر نکاح نامہ۔"

"تم کیا کرنا چاہتی ہو خولہ؟" انہیں پہلی بار اس کی مسکراہٹ سے ڈر محسوس ہوا۔

"انتظار کیجیے۔ بے خبر نہیں رہیں گے آپ؟" موتیا کی ایک اور کلی ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

کوئی اور وقت ہوتا تو ضامن مصطفیٰ اس کی اس ادا پہ سب کچھ نچھاور کر ڈالتے مگر اس وقت تو انہیں اس کے انداز، اس کی آنکھوں، اس کی مسکراہٹ سے خوف سا محسوس ہوا تھا۔ کلی تھامتے ہوئے انہوں نے اسے بہت غور سے دیکھا تھا۔ وہ مسکراتی رہی۔ پھر بھی۔ پھر بھی جانے کیوں انہیں اس کی آنکھوں کی سطح گیلی محسوس ہوئی۔

☆☆☆

شام اپنے مخصوص رنگوں میں رنگی ہوئی تھی۔ سورج دن بھر اپنا جلال دکھانے کے بعد دھیما پڑ گیا تھا۔ ایسی ہی ایک شام انہوں نے خولہ کو پہلی بار دیکھا تھا

اور آج بھی دیکھ رہے تھے۔ آج اس کے عارض کی سرخیاں ماند پڑی سی محسوس ہوتی تھیں۔ چھوٹی قبر کو موتیا کی کلیوں سے ڈھکنے کے بعد اس نے کھڑے ہوتے ہوئے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

ضامن مصطفیٰ آج بھی بے خود سے ہو کر اسے دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ دعا کے بعد منہ پہ ہاتھ پھیر کر اماں کی قبر کی طرف آئی۔ ضامن نے بے خودی سے باہر آتے ہوئے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ وہ ان کے ساتھ آ کر کھڑی ہو گئی۔ دعا مانگی اور قبرستان سے باہر نکل آئی۔ ضامن کی اپنی ماں کے لیے دعا لمبی ہوتی تھی۔ بہت ساری باتیں کر لینے کے بعد انہوں نے اپنی ماں کو الوداع کہا اور قبرستان سے باہر جانے والے رستے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے دیکھا کہ خولہ گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ وہ شاید ان کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ حیران ہوئے۔ بہت دفعہ وہ انہیں کہہ چکے تھے کہ اگر اسے قبرستان آنا ہو تو ان کے ساتھ آیا کرے۔ مگر باقی اور بہت سی باتوں کی طرح وہ ان کی یہ بات بھی نہ مانتی تھی۔ وہ اپنی گاڑی میں آتی جاتی تھی اور اگر کبھی ان کا یہاں آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو وہ انہیں نظر انداز کر دیتی۔ مگر آج اس کا دعا مانگنے کے بعد واپس جانے کے بجائے یوں کھڑے ہونا انہیں اچنبھے میں ڈال رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے طرف آنے لگے۔ خولہ نے چہرہ پھیر کر ان کی طرف دیکھا اور پھر ڈوبتے سورج کو دیکھنے لگی۔ وہ اس کے قریب آ کھڑے ہوئے۔ وہ جاتے سورج کو دیکھتی رہی۔ ضامن اس کے رخساروں کی وہ سرخیاں ڈھونڈتے رہے۔

"میں نہیں جانتی تھی ضامن مصطفیٰ۔ قبرستان سے شروع ہونے والے رشتے بھی یہاں کے باسیوں کی طرح مردہ ہوتے ہیں۔" کچھ دیر بعد انہیں اس کی آواز سنائی دی۔ کیا کچھ نہ تھا اس آواز میں۔ تکلیف، تڑپ، دکھ، یاسیت اور بہت کچھ۔

ضامن کچھ بول نہ پائے تھے۔ وہ بس اسے دیکھتے رہے۔ اور وہ سورج کو دیکھتی رہی۔

سورج ڈوب رہا تھا، ان کا رشتہ بھی ڈوب رہا تھا۔

اس نے سورج سے نگاہ ہٹا کر ضامن کی طرف دیکھا اور ہاتھ میں پکڑے کاغذ ان کی طرف بڑھا دیے۔ انہیں جانے کیوں لگا یہ کاغذ نہیں، بچھو ہیں۔ انہوں نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

"قبرستان سے شروع ہونے والے رشتے کو پھر قبر میں تو اترنا ہے ناں ضامن مصطفیٰ۔"

اس نے ہاتھ بڑھائے رکھا۔ انہوں نے نہیں تھاما۔

"اچھی لگتی ہے ناں آپ کو اپنے حق کے لیے لڑتی عورت۔ چلیں پھر سامنا کریں اس عورت کا۔"

وہ یہ بچھو تھامنے پہ مجبور ہوئے۔ وہ اسٹیپل ہوئے تین پیپرز تھے۔

"میں ترتیب پسند ہوں۔ بہت ترتیب کے ساتھ لگائے ہیں میں نے یہ پیپرز۔"

ضامن مصطفیٰ نے پہلے پیج پہ نظر دوڑائی۔ بچھو نے پہلا ڈنک مارا۔

یہ وہ معاہدہ تھا جس پہ نکاح سے پہلے خولہ بنت زید سے دستخط لیے گئے تھے۔ یہ وہ پتھر تھا جو ہر روز ان کے منہ پہ پڑتا تھا۔

انہوں نے صفحہ پلٹا۔

سامنے نکاح نامے کی کاپی تھی۔ بچھو کے ڈنک سے اندر جو زہر سرائیت کرنے لگا تھا، اسے اس کاغذ کی سیاہی نے چوس لیا۔

انہوں نے خولہ کو دیکھا اور پھر یہ کاغذ بھی پلٹ دیا۔

تیسرا کاغذ، کاغذ نہیں تھا، بچھو نہیں تھا، وہ سنپولا تھا جس کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔ ان کا چہرہ اس کے زہر سے نیلا پڑنے لگا۔

خولہ نے سورج کو الوداع کہہ کر ان کی طرف دیکھا اور ٹھٹھک گئی۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا کہ وہ عبدالہادی کا چہرہ دیکھ رہی ہے۔

دور ایک قبر پر سے پتے چنتا ہوا گورکن بننا تو چاہتا تھا گیت کار مگر بنتے کچھ اور جا رہا تھا۔

سفید اور گلابی پھولوں سے ہی وہ بیل آج بھی ویسی تھی بس خولہ بنت زید ویسی نہ رہی تھی۔ وہ ریلنگ کے ساتھ کھڑی اس کے پھولوں پہ ہاتھ پھیرتی رہی۔ یہ پھول جب کھلتے تو سفید ہوتے اور اگلی دوپہر تک رنگ بدل کر گلابی ہو جاتے۔ بہت اچھا لگتا تھا ان کا رنگ بدلنا لیکن انسان کا رنگ بدلنا بالکل اچھا نہیں لگتا اور بدلا تھا ضامن مصطفیٰ کے چہرے کا رنگ بھی جب اس نے یہی بات ان سے کہی تھی۔ اس شام وہ ریلنگ کے ساتھ کھڑی اس بیل کے پتوں کو دیکھ رہی تھی جو اب ریلنگ کے بیچ تک پہنچ گئے تھے۔ ضامن مصطفیٰ کب اس کے پاس آ کھڑے ہوئے اسے پتہ نہیں چلا۔ اب وہ ان کی خوشبو محسوس نہیں کرتی تھی۔

"یہ رنگون کریپر ہے۔" وہ چونکی۔

"مجھے گرین وائن کریپر پسند ہے۔ پہلے وہی تھی یہاں۔ مگر جس دن بابا نے مجھے قبول کیا تھا۔ اس صبح قبرستان جانے سے پہلے جب تمہیں لینے آیا تھا۔ تو ان پھولوں کے بیچ گھرے دیکھا تو کچھ نہیں آیا۔ مجھے پھول زیادہ اچھے لگ رہے تھے یا تم لیکن وہ منظر بہت خوبصورت تھا۔ تب ہی میں نے یہ کریپر لگوائی۔"

اسے ضامن مصطفیٰ کے منہ سے اب ایسی باتیں سن کر کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔

"ضامن مصطفیٰ! آپ کو پتہ ہے یہ پھول رنگ بدلتے ہیں؟"

"ہاں ...... شاید ان میں کچھ پگمنٹس ایسے ہوتے ہیں جو تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

"انسان میں بھی کیا ایسے پگمنٹس ہوتے ہیں جو اس کا رنگ بدل دیتے ہیں ضامن مصطفیٰ!" وہ ان کی طرف مڑی۔ ان کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا۔ اور کہنے کے بعد دیکھتی رہی۔ تب بدلا تھا ضامن مصطفیٰ کے چہرے کا رنگ۔

"کبھی کبھی رنگ نہیں بدلتے۔ آنکھ رنگوں کی پہچان کرنے سے قاصر ہو جاتی ہے۔" انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا تھا۔

وہ "ہونہہ" کرکے ایک ہنکارا بھر کر بیڈروم میں چلی آئی تھی۔ کیا یونہی "ہونہہ" کر کے ایک ہنکارا بھر کر وہ ضامن مصطفیٰ اور اپنی راہیں جدا کرنے جارہی تھی۔ کیا اس کی بصارت قائم تھی۔ وہ جلد بازی تو نہیں کر رہی تھی۔ ممتاز شاید ٹھیک کہتی تھی۔ خاوند کو چھوڑنا آسان کام تھوڑی ہے۔

اسی پل اس کی نگاہ کے سامنے بابا کا چہرہ آیا۔ مرتعش ہاتھ، مرتعش لہجہ۔

"وہ کہتا ہے نکاح نامے پہ سائن کرنے سے پہلے اس پیپر پہ سائن کرو ورنہ...... ورنہ۔" ایک باپ پہ یہ کیسا وقت آیا تھا کہ لفظوں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

"ورنہ کیا بابا!"

"ورنہ وہ بارات واپس لے جائے گا۔"

اس نے آنکھیں میچ لیں۔ یہ منظر ایسا تھا کہ جب یاد آتا پھر کچھ اور یاد نہ رہتا۔ نگاہ باقی ہر رنگ کی پہچان کرنے سے قاصر ہو جاتی۔

"میں نے ٹھیک کیا۔ قبرستان سے شروع ہونے والے رشتے کو دفنا دیا۔" اس نے خود کلامی کرتے ہوئے خود کو تسلی دی۔ وہ ممتاز تھوڑی تھی۔ وہ خولہ بنت زید تھی۔

ماما دو دفعہ اسے رات کے کھانے کے لیے بلا چکی تھیں۔ وہ انہیں جواب دیتی۔

"آرہی ہوں ماما" اور پھر جانا بھول جاتی۔ اور پھر وہ ماما کے تیسرے بلاوے پہ پلٹنے والی تھی، جب اس نے رنگ بدلنے والے کو دیکھا۔ اس کا رنگ اڑا۔

ایوب چاچا گیٹ پہ نہیں تھے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہ تھی دو دن سے۔ اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ بابا نے زید کو کل سے گیٹ کی ڈیوٹی دے رکھی تھی مگر وہ کام چور غائب تھا۔ گاڑی کا ہارن بج رہا تھا، گیٹ کھولنے والا کوئی نہ تھا۔ خولہ نے جلدی سے کمرے میں آکر انہیں کال کی۔

"کیوں آئے ہیں آپ؟"

"تم سے ملنے نہیں آیا۔ مجھے ماما بابا سے ملنا ہے۔"

وہ اور بابا کے ... میں نے ان سے ابھی
کوئی بات نہیں کی۔ ان سے بات میں ہی کروں گی۔ آپ...... آپ چلے جائیں۔"

"تم کو کیا لگتا ہے کہ میں تمہاری ہر بات ماننے کے لیے پیدا ہوا ہوں؟" ضامن مصطفیٰ کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"نہیں آپ مجھے مارنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔"

"کون کس کو مار رہا ہے...... یہ بند آنکھوں والے کو نظر نہیں آئے گا خولہ ضامن مصطفیٰ!"

"آپ میرے نام کے ساتھ اپنا نام نہیں لگا سکتے۔" وہ چلائی۔ وہ بات قصہ کہانی کوئی تاریخ ہی ہوئی جب وہ اپنے نام کے ساتھ "ضامن مصطفیٰ" لکھا کرتی تھی کبھی بے دھیانی میں اور کبھی پورے ہوش وخرد سے۔

"تم اپنے نام کے ساتھ سے میرا نام ہٹا نہیں سکتیں۔"

"زبردستی ہے کیا؟"

"نہیں...... حقیقت ہے یہ۔"

"دیکھ لیں گے۔"

"دیکھ لیں گے۔" فوراً جواب آیا۔ ساتھ ہی گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ کمرے سے نکل کر پھر بالکونی میں آئی۔ ضامن کی گاڑی آگے بڑھ آئی تھی اور پیچھے بابا اب گیٹ بند کر رہے تھے۔

"میرے بابا کو سمجھ کیا رکھا ہے آپ نے؟" وہ تلملا اٹھی۔ اسے بالکل اچھا نہیں لگا تھا کہ اس کے بابا نے ضامن مصطفیٰ کے لیے گیٹ کھولا۔

"تم ہمیشہ سے ایسی تھیں یا اب ایسی ہو جاتی ہو؟"

"کیسی؟" اس کے منہ سے نکلا۔

"غصے میں دیوانی سی۔" گاڑی سے اتر کر انہوں نے اوپر دیکھا تھا اس کی طرف اور مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ اس نے لب بھینچے۔

اب وہ بابا سے ملنے لگے تھے۔ بابا ہلکا سا مسکرائے تھے۔

کیا بابا وہ تکلیف بھولنے لگے ہیں، جو اس شخص نے انہیں دی تھی، ان کی بیٹی کو دی تھی۔

بابا سے مصافحہ کرتے ہوئے انہوں نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ منظر بہت خوبصورت تھا۔

وہ دو مرد جن سے اس نے ٹوٹ کر محبت کی، اس کے سامنے تھے۔ اور اب وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہونے کے لیے قدم بڑھا رہے تھے۔ منظر بہت خوبصورت تھا۔ مگر عارضی تھا۔

وہ جلدی سے نیچے آئی۔ اور ضامن کو تنبیہی نظروں سے دیکھا۔ وہ جو کچھ آج کر آئی تھی، ہوش و حواس میں یا جلد بازی میں۔ اس کا ذکر ابھی گھر میں نہ چلا تھا۔ وہ علیحدگی میں بابا کو بتانا چاہتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ بابا اس کا ساتھ دیں گے۔ پھر ماما کو بھی وہ دونوں مل کر سمجھا لیتے۔ وہ پڑھی لکھی باشعور عورت تھیں، دکھ تو ہوتا مگر سمجھ جاتیں۔ لیکن ضامن مصطفیٰ ڈائریکٹ ایسی کوئی بات کر دیتے تو شاید ان کے لیے بہت مشکل ہوتا۔

ماما ہمیشہ کی طرح داماد کو خاص توجہ دیتی ہوئیں ان دونوں باپ بیٹی کو بھولی ہوئی تھیں۔ حیرت کی بات یہ نہ تھی بلکہ یہ تھی کہ بابا کا ضامن مصطفیٰ کے ساتھ جو سرد رویہ ہوتا تھا، اس میں آج کمی سی تھی۔

"بابا! میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" کھانے کے بعد ماما چائے بنانے کے لیے اٹھیں تو ضامن بابا سے مخاطب ہوئے۔ ان کے سنجیدہ لہجے پہ بابا نے چونک کر انہیں دیکھا اور پھر خولہ کو۔

"خولہ! ہماری چائے اسٹڈی بھجوا دینا۔" ضامن نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ ضامن مصطفیٰ کی نوکری تھی کیا وہ۔ کمرے میں آکر ادھر سے اُدھر چکر کاٹنے لگی۔ پھر کبھی بیٹھ جاتی کبھی کھڑی ہو جاتی اور کبھی وہی چکر کاٹنا شروع۔

"بھلا ضامن مصطفیٰ کیا بات کریں گے بابا

ہے...... اور کس انداز میں کریں گے...... اور بابا کیا ری ایکٹ کریں گے۔ مجھے بابا کو پہلے اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔" وہ انہی سوچوں میں غلطاں، ہمکلامی کرتے اسٹڈی تک آئی مگر واپس مڑ گئی۔

☆☆☆

رات کے ماتھے پہ سجا گول جھومر بتاتا تھا کہ رات چاندنی ہے مگر ضامن مصطفیٰ کو لگتا تھا کہ رات اماوس کی ہے۔

ایک اور سگریٹ سلگاتے ہوئے انہوں نے اس ستمگر بے حال من کہنے کی کوشش کی جو موبائل بند کر کے بیٹھی تھی۔ اس دفعہ بھی "دی نمبر یو ہیو ڈائلڈ......" سن کر موبائل کان سے ہٹا لیا۔ وہ ہونٹ بھینچے ہوئے اضطراب میں ٹانگ ہلانے لگے۔

دو عورتوں کی محبت میں ڈوبا یہ شخص اپنی زندگی کی مشکل ترین تیسری رات گزار رہا تھا۔

☆☆☆

سر کٹا مرد، خون کے فوارے اور نو سال کا وہ بچہ جو خوف و دہشت سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"میں کہاں جاؤں گی اس وقت اپنے بچے کو لے کر۔" ایک عورت ہاتھ جوڑے گڑگڑا رہی تھی، رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ بچے نے دیکھا، وہ تو اس کی ماں تھی۔ اس نے کبھی ماں کو اس عالم میں دیکھا جو نہ تھا اس لیے پہچاننے میں کچھ لمحے لگے۔ اس کی تمکنت جانے کدھر گئی تھی اس سے۔

کسی کمرے سے مسلسل دروازہ دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔

باپ کے بستر پہ مردہ پڑا مرد، ماں کی التجائیں، باپ کی بے رحمی، دور کمرے سے آوازیں۔

نو سالہ بچے کو کچھ سمجھ نہیں آیا کہ ہو کیا رہا ہے۔ دہشت سی دہشت طاری تھی اس پہ۔

زمین پہ خدا بنے مرد نے عورت کی کوئی فریاد نہ سنی اور بچے سمیت دھکیل کر اندھیری رات کے حوالے کرتے ہوئے ہر دروازہ اس پہ بند کر دیا۔ وہ ایک ایک دروازہ ایک ایک کھڑکی بجاتی رہی۔ وہ جانے کو تیار نہ تھی۔ مرد باہر نکلا اور چلا کر تین الفاظ ادا کیے۔ ان تین لفظوں نے اس عورت کو چپ لگا دی۔ ایسی چپ کہ جب تک زندہ رہی، مردہ ہی لگتی رہی۔

اس کے بعد اس نے کوئی فریاد نہ کی، کوئی التجا نہ کی اور بچے کا ہاتھ تھام کر چل دی۔ اسے کہاں جانا تھا، کس رستے پہ چلنا تھا، اسے اس بات کا ہوش نہ تھا۔ وہ بے جان سی چلتی رہی، چلتی رہی۔ اس رات کئی آنکھوں نے ایک ایسی عورت کو مفلسوں کی طرح گوٹھ سے باہر جاتی سڑک پہ بھٹکتے دیکھا جس کا چہرہ جس کی چال اس کے اعلیٰ حسب نسب پہ مہر تھے۔

وہ چلتی رہی، چلتی رہی یہاں تک کہ بچے کی طاقت جواب دینے لگی۔ پہلی بار اس نے بچے کی صورت دیکھی اور جیسے ہوش میں آئی۔ اسے سینے سے لگا کر رو دی۔ خوف و دہشت سے کانپتا بچہ بھی رو دیا۔ ماں نے اس کے آنسو صاف کیے اور پھر اپنے۔ اور اسے لیے سڑک کے کنارے پہ بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت اس قابل نہ تھی کہ کچھ سوچ سکتی۔

ایک گاڑی ان کے قریب رکی، اس میں سے ایک مرد باہر آیا اور ان کو منزل تک پہنچانے کی پیشکش کی۔ عورت اپنی ہر منزل کھو چکی تھی، ورنہ یوں در بدر ہوتی بھلا۔ وہ خالی آنکھوں سے مرد کو دیکھتی رہی۔

"دیکھیں، اس وقت یہاں آپ کا اس طرح سے بیٹھنا مناسب نہیں۔ خدانخواستہ کسی بھی طرح کا مس ہیپ ہو سکتا ہے۔"

مرد کے لفظوں میں ہمدردی تھی مگر آنکھوں میں نہیں۔ وہ نو سال کا بچہ بھی سمجھ رہا تھا۔ وہ ماں کا بازو مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دور کہیں سے جرس سنائی دی۔

مرد کو جب لگا کہ عورت نہیں اٹھے گی تو بچے کی طرف متوجہ ہو کر اسے پچکارا۔

"آؤ بیٹا! تم اور تمہاری امی میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔"

بچہ خوفزدہ ہو کر ماں سے لپٹ گیا۔ ماں نے اسے اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے مرد کو سختی سے

وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ مرد نے شناسائی کا چولہ اتار کر کچھ ایسے الفاظ کہے کہ عورت نے پاس پڑا پتھر اسے دے مارا تھا۔ پہلے تو اچانک حملے پہ مرد بوکھلایا پھر ماتھے پہ چوٹ کا احساس ہوتے ہی وہ اپنے آپے سے باہر ہوا۔ اس نے عورت کو گالی دی تھی۔ نو سال کا بچہ یہ سہہ نہ پایا اور اس نے ایک اور پتھر اٹھا کر اسے دے مارا۔ مرد اسے گالی دیتے ہوئے اس کی طرف تیزی سے بڑھا جب بچہ "چاچا" کہتا ہوا سامنے سے آنے والی بیل گاڑی کی طرف بھاگا۔ ماں اس کے پیچھے بھاگی اور مرد نے مڑ کر دیکھا۔

بیل گاڑی پہ دو مرد تھے۔ ایک کے ہاتھ میں کلہاڑی نظر آ رہی تھی۔ جس کا پھل اندھیرے میں چمکتا تھا۔ وہ مرد چھلانگ لگا کر بیل گاڑی سے اترا اور مرد کی طرف بڑھا۔

"ماتھے پہ پتھر پڑا ہے، سانس لے رہے ہو۔ گردن پہ کلہاڑی پڑی تو......"

دیہاتی لہجے میں بولتے ہوئے اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر کلہاڑی کے دستے پہ ہاتھ پھیرا۔

تنہا عورت اور ایک کمزور بچے کے سامنے مردانگی دکھانا آسان تھا۔ دو ہٹے کٹے مرد دیکھ کر اس نے دم دبا کر بھاگنے میں عافیت جانی۔ کلہاڑی والا مرد واپس بیل گاڑی کی طرف آیا۔ بیل گاڑی والا سینے پہ ہاتھ رکھے جھکا ہوا احترام سے عورت سے کہہ رہا تھا۔

"اوی! آپ بیٹھو گاڑی میں۔ جدھر جانا، ہم چھوڑ کے آئیں گے۔"

عورت نہیں جانتی تھی کہ اس نے کدھر جانا ہے پھر بھی وہ بچے کو لے کر بیل گاڑی میں چڑھ گئی۔ کم سے کم وہ یہاں خود کو اور بچے کو محفوظ پاتی تھی۔

بچہ چاچا سے بہت باتیں کیا کرتا تھا۔ جب وہ مویشیوں کے لیے اپنی بیل گاڑی پہ چارہ ڈال کر لاتا تھا، تو بچے کی خواہش پہ اسے بیل گاڑی پہ جھولا بھی دیتا تھا۔ مگر احتیاط کرتا تھا کہ مالکوں میں سے کوئی دیکھ نہ لے ورنہ اس جرم کی پاداش میں بڑی سزا بھگتے گا۔

بچہ چاچا سے بہت باتیں کیا کرتا تھا مگر آج وہ بالکل چپ تھا۔ ہاں اب خوف کچھ کم ہونے لگا تھا۔

اس رات کئی آنکھوں نے اس عورت کو ایک کمدار کی بیل گاڑی میں بیٹھ کر نظریں جھکا کر، اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اس گاؤں سے نکلتے دیکھا جس گاؤں میں جب وہ آئی تھی تو بڑی شان سے آئی تھی۔ جس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا نہ ہوتی تھی، آنکھوں سے چمک خفا نہ ہوتی تھی۔

"اوی! کدھر جاؤ گی؟" رستم نے گاؤں سے نکل کر بجھی ہوئی سی آواز میں پوچھا تھا۔ اس وقت تک عورت کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گئی تھی۔ اس نے ایک پتہ بتایا تھا۔

رات کے آخری پہر ایک عالی شان گھر کے سامنے ایک بیل گاڑی آ کر رکی تھی۔ گیٹ کھلنے تک عورت نے احسان کا ذرا سا بدلہ ادا کرنا چاہا۔ اس نے اپنے کانوں سے جھمکیاں اتار کر رستم کی طرف بڑھائی جسے اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ عورت نے کلہاڑی والے کو وہ بالیاں دینی چاہیں، اس نے بھی انکار کر دیا۔

گیٹ کھل چکا تھا۔ قبل اس کے کہ ایک بیل گاڑی والے کو رات کے اس وقت گھنٹی بجانے پہ سبق سکھایا جاتا۔ ہوا کا جھونکا آیا اور عورت کے چہرے سے چادر سرکی۔ عورت کے چہرے پہ ایسا رعب اور انداز میں ایسی تمکنت تھی کہ گارڈ جمائی لیتے لیتے سیدھا ہوا۔

"مجھے تمہاری مالکن سے ملنا ہے۔" عورت بچے کا ہاتھ تھام کر آگے آئی۔

"آپ کا نام؟"

"نزل زہرا۔"

دروازہ کھولنے والے کی نیند سے بھری آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔

"آپ کو لگتا ہے کہ آپ صحیح جگہ آئی ہیں؟"

"اوئے ہماری مالکن کو اندر بٹھاؤ۔ سوال جواب جو کرنے ہیں، ہم سے کرو۔" کلہاڑی والا اپنی

مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا آگے بڑھا تو اونچے عالی شان مکان کا ملازم جلدی سے اندر غائب ہوا۔ دس منٹ بعد وہ آیا اور عورت کو اندر آنے کو کہا۔ وہ بچے کو لے کر سیڑھیاں چڑھی، آخری سیڑھی پہ کھڑے ہو کر اس نے مڑ کر دونوں مردوں کی طرف دیکھا۔ رستم چاچا نے اپنی بھیگی آنکھیں صاف کرتے ہوئے جلدی سے آگے بڑھ کر بچے کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ اور پھر ہاتھ باندھ کر پیچھے ہوا۔ عورت بچے کو لیے اندر چلی آئی۔

سرخ اینٹوں سے بنے اس گھر میں بچہ پہلی بار آیا تھا، اس لیے سر اٹھا کر ہر شے کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں کچھ چیزیں تھیں جو اس کی دلچسپی کا باعث بن رہی تھیں۔ اسے سرکٹا مرد اس وقت بھول گیا تھا۔

گارڈ باہر ہی رک گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے ملازم کی معیت میں ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوئے جس کی سجاوٹ بتاتی تھی کہ وہ ڈرائینگ روم ہے۔

''نرمل۔'' ایک عورت تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔

''مجھے ...... مجھے تمہاری مدد چاہیے۔'' بچے کی ماں نے اس عورت کے سامنے ہاتھ جوڑے جس کی کلائیوں میں سونے کے بھاری کنگن تھے۔

☆☆☆

کھانے کی میز پہ اشتہا آمیز خوشبوئیں پھیلی تھیں۔ چمچوں اور کانٹوں کی آواز تھی۔ ماما اور تائی کی خاندان میں ہونے والی کسی شادی کو لے کر گفتگو چل رہی تھی۔ تایا اور ان کا بیٹا رغبت سے کھانے میں مصروف تھے۔ بابا بھی بظاہر تو کھا ہی رہے تھے، جب ماما کی اس پہ نظر پڑی۔

''خولہ! تم کھا کیوں نہیں رہی؟''

وہ چونکی اور اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوئی۔ ایک نوالہ منہ میں ڈالا اور دوسرا ڈالنا بھول گئی۔ بابا نے کڑی چاولوں پہ ڈالتے ہوئے اس کی طرف ایک نگاہ کی اور پھر کھانا کھانے لگے۔

''ضامن اسلام آباد نہ گیا ہوتا تو اسے بھی بلا لیتے۔ اسے بہت پسند ہیں میرے ہاتھ کے کڑی چاول۔'' ماما جس انداز میں داماد کا ذکر کیا کرتی تھیں، سننے والا انہیں رشک بھری نگاہ سے دیکھنے پہ مجبور ہو جاتا۔ انہیں ضامن مصطفیٰ پہ اتنا فخر محسوس ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک ان کا مان توڑ نہ پائی تھی۔ وہ انہیں بتانے کی ہمت نہ کر پائی تھی کہ وہ کیا کر آئی ہے اور کیا کرنے جا رہی ہے۔

''اپنی ماں کو یہ خبر تم خود دو گی۔'' کل رات بابا نے صاف الفاظ میں یہ ذمہ داری اس پہ ڈال تھی۔

''بابا پلیز......''

''خولہ۔'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اس کو مزید بولنے سے روکا تھا۔ ''میں ہر فیصلے میں تمہارے ساتھ ہوں مگر ان فیصلوں کا ردعمل تم خود فیس کرو گی۔'' ان کا لہجہ دوٹوک تھا۔

''میں انہیں خود کیسے بتاؤں گی؟'' وہ روہانسی ہوئی تھی۔

''جیسے خود یہ فیصلہ لے لیا۔''

''آپ خفا ہیں ناں کہ میں نے کیوں آپ کو اعتماد میں نہیں لیا، پہلے آپ کو کیوں نہیں بتایا...... بابا اس دفعہ میں اپنا فیصلہ خود کرنا چاہتی تھی۔ فیصلے کا بوجھ آپ پر نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔''

''مجھ پر اور بوجھ بھی مت ڈالو...... وہ کمزور دل کی مالک ہے اور مجھے عزیز ہے۔ کسی ڈرامے میں کوئی مر جائے یا کسی کو طلاق ہو جائے تو ہفتہ ہفتہ غم زدہ رہتی ہے وہ۔ فون پہ بہنوں، نندوں کے ساتھ افسوس کا سلسلہ چلتا ہے۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ وہ اس خبر کو کس طرح لے گی۔'' پروفیسر زید ابصار ایک بہادر انسان تھے۔ بڑی سے بڑی، بری سے بری خبر سن سکتے تھے مگر کمزور اتنے تھے کہ متاثرین کو سنا نہیں سکتے تھے۔

''ٹھیک ہے بابا! میں موقع اور وقت دیکھ کر بات کرتی ہوں۔ ابھی کچھ دن ہیں۔''

اٹھارہ دن بعد عبدالہادی کے کیس کی سماعت تھی۔ ویسے تو شروع میں میڈیا نے اس کیس میں جتنی دلچسپی دکھائی تھی، اب کافی کم ہو گئی تھی۔ کوئی ایک دو

ریورٹرز ہی آئے ہوتے تھے۔ اس نے ایڈووکیٹ معظم ندیم کو کہہ دیا ہے کہ پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کے کان میں سرگوشی کر دے کہ اس ساعت میں اس کیس کی سابقہ وکیل صفائی ایک گواہ کے طور پہ پیش ہوں گی۔ اس سرگوشی کو دھماکہ خیز کیسے بنانا تھا، یہ ان کا اپنا کام تھا۔ اور خولہ...... ایڈووکیٹ خولہ بنت زید کا کام تھا اپنے زخم دنیا کو دکھانا...... کیا یہ اتنا آسان تھا۔ سوچتی تو جان پیروں کی راہ باہر نکلتی محسوس ہوتی۔

معظم بھی تو بہت دیر تک کچھ کہنے کے قابل نہ رہا تھا۔

"تمہیں نہیں لگتا خولہ! کہ تم نے مجھ سے شادی نہ کر کے بڑی غلطی کی؟" وہ ان گنی بندوں میں سے ایک تھا جو ایڈووکیٹ خولہ بنت زید کے ساتھ کی خواہش رکھتے تھے۔

"نہیں...... مجھے ایسا بالکل نہیں لگتا۔" اس نے صاف گوئی کے ساتھ جواب دیا تھا۔ "تم ایک اچھے ساتھی وکیل ہو۔ مگر مجھے کبھی نہیں لگا کہ اچھے لائف پارٹنر بھی بن سکتے ہو۔"

"اور جس کو اچھا سمجھ کر لائف پارٹنر بنایا...... اس کا کیا؟"

"میں نے تمہیں ساری بات طعنے مارنے کے لیے نہیں بتائی معظم! میرا ڈائیورس کیس زینب دیکھے گی۔ اس لیے مزید اس پہ بات بھی نہیں پلیز۔" اس نے عبدالہادی کی فائل سامنے کھسکاتے ہوئے کہا تھا۔ اور اس کیس کو ڈسکس کرنے لگی تھی۔

"خولہ! کھانا کیوں نہیں کھا رہی ٹھیک طرح سے؟" ماما نے پھر اسے ٹوکا تو وہ چونکی۔ اور پھر یونہی پلیٹ میں چمچ گھمانے لگی۔

"ضامن بھائی کو مس کر رہی ہیں۔" تایا زاد شرارت سے بولا تو تائی نے گھورا۔ آج کل تو بچوں میں ادب، لحاظ، تمیز نام کی کوئی چیز نہ رہی تھی۔ چلو ان کا نہیں تو باپ اور چچا کا لحاظ تو کر لے۔

"ماما! سونے جا رہی ہوں۔ میرے سر میں درد ہے۔" اس نے پلیٹ پرے کھسکائی۔

"اپنا ڈول لے لینا۔" ماما نے پریشانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ کل رات بھی اس کے سر میں درد تھا۔ وہ سر ہلا کر چلی گئی۔ بابا کی نگاہوں نے اس کا پیچھا کیا۔

☆☆☆

گھر میں رونق لگی ہوئی تھی۔ بڑے عرصے بعد امی ابو، بڑے بھائی، بھابی اور ان کے بچے آئے تھے۔ مرتضیٰ خوش تھا اور گپ شپ میں لگا ہوا تھا جبکہ فائقہ لاتعلق سی ایک طرف بیٹھی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ یہاں ہو کر بھی یہاں نہیں۔ ساس اور جٹھانی کو اس کا رویہ کھٹکتا تھا۔ ان کو لگتا تھا کہ وہ ان کی آمد پہ خوش نہیں ہوتی۔

"کھانا کب تک تیار ہوگا؟ تمہارے ابو نے دوا لینی ہے پھر۔" امی نے گھڑیال پہ نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"جی امی بس ریڈی ہے...... فائقہ!" اس نے امی کو جواب دے کر بیوی کی طرف دیکھا لیکن وہ تو جیسے کسی اور ہی جہاں میں پہنچی ہوئی تھی۔ وہ کھڑا ہوا اور ایک دفعہ پھر اسے پکارا۔ وہ چونکی اور پھر اسے دیکھتی گئی۔

"میرا خیال ہے، اروی تیار ہو گئی ہوگی...... چلو کھانا لگاتے ہیں۔"

وہ خاموشی کے ساتھ اٹھ کر اس کے ساتھ چل دی۔ امی روایتی ساس نہ تھیں مگر انہیں برا لگا۔ اتنے عرصے بعد آئے تھے وہ سب اور بہو کو خود کہنا پڑ رہا تھا کہ اب کھانا لگا بھی دو۔ کھانے کی میز پہ پہنچ کر انہیں اور برا لگا۔ مٹن کڑاھی، بریانی، فش سب کچھ باہر کا تھا۔ گھر کی بنی صرف ایک سبزی نظر آ رہی تھی۔

"تمہارے ابو ہوٹل کا نہیں کھاتے، تمہیں پتہ ہے۔" انہوں نے بیٹے بہو کو جتا ہی دیا۔

"جی جی امی۔ پتا ہے...... ابو یہ آپ کی پسند کی اروی۔ سوری آپ کی بہو نے بریانی بھی بنائی تھی مگر دم لگا کر اس کا دم نکال دیا۔" اس نے جلدی سے سبزی کا ڈونگا ابو کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب چاچو؟" اس کی بھتیجی کو سمجھ نہیں آیا تو پوچھ لیا۔

"مطلب یہ کہ بھول گئی کہ چولہے پہ کچھ رکھا ہے، نتیجے میں جو ہو سکتا ہے وہی ہوا۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو سب ہنس دیے سوائے امی اور فائقہ کے۔

"دھیان کہاں تھا تمہارا؟" امی نے بہو کو گھورا۔

"میری طرف۔" مرتضیٰ فوراً بولا تو پھر قہقہہ پڑا اور گفتگو کسی اور موضوع کی طرف چل پڑی مگر وہ آج شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ ابو نے رغبت کے ساتھ سبزی کھائی تھی۔ کھانا بھی سب نے اچھے سے کھایا۔ مسئلہ کھانے کا نہیں تھا مسئلہ فائقہ کے رویے کا تھا۔ جس میں تبدیلی سب محسوس کرنے لگے تھے۔ اور اپنے اپنے طور پر نتیجہ بھی اخذ کرنے لگے تھے۔ جیسے کہ امی کو لگ رہا تھا کہ وہ ان کے آنے پہ خوش نہیں۔ وہ انہیں کیا بتاتا کہ وہ ویسے ہی خوش نہیں۔ یہ لفظ اس کی زندگی سے نکل گیا ہے۔

"کسی گائناکولوجسٹ کے پاس نہیں گئی تم؟"

اگلے دن روانگی سے کچھ دیر پہلے امی ان کے کمرے میں آئی تھیں اور فائقہ سے سوال کیا تھا۔ وہ پہلے تو ان کی طرف دیکھتی رہی جیسے سمجھ نہ آیا ہو کہ اس سے کیا پوچھا گیا اور جب سمجھ آئی تو چہرے کا رنگ بدلا۔ اس نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

"کیا کہتی ہے؟"

"کہتی ہے لائف انجوائے کریں۔ جب اللہ کی رضا ہو گی تو اولاد کی خوشی بھی عطا ہو گی انشاءاللہ۔" جواب ان کے بیٹے نے دیا۔

"لائف انجوائے کریں...... اس کی باتوں میں نہ آنا فائقہ! مردوں کا کیا ہے وہ اس معاملے کو سیریس نہیں لیتے۔ تم صحیح طرح سے ٹریٹمنٹ لو۔ عمر گزر گئی تو پھر تو اور بھی مسئلے شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی لیڈی ڈاکٹر پہ نہ رہو۔ کسی اور کو بھی چیک کرواؤ۔ میری کزن کی بیٹی ہے کینیڈا میں گائنی کی ڈاکٹر اس کا نمبر دوں گی، اس سے بھی بات کرو۔"

فائقہ نے سر ہلایا۔ اس کے چہرے پہ شدید اضطراب تھا۔ امی لوگ چلے گئے اور وہ انہیں الوداع کر کے پلٹے ہی تھے کہ مرتضیٰ کو پیچھے سے اس کی آواز سنائی دی۔

"مرتضیٰ! یہ گائناکولوجسٹ مجھے اتنی قابل نہیں لگ رہی...... ہمیں کسی اور کے پاس جانا چاہیے۔"

وہ امی کی باتوں کو سیریس لے گئی تھی۔ اس نے پلٹ کر اسے تسلی دینی چاہی مگر اس کے چہرے پہ پھیلا اضطراب محسوس کر کے فقط سر ہلا دیا۔

☆☆☆

زندگی آدھی ہے، ادھوری ہے
تیرا آنا بہت ضروری ہے
سامنے تُو ہے لحہ لمحہ میرے
اور زمیں آسماں کی دوری ہے
کوئی منطق، کوئی دلیل نہیں
تُو ضروری تو بس ضروری ہے
کون سیکھا ہے صرف باتوں سے
سب کو ایک حادثہ ضروری ہے
لکھتے لکھتے گزر گیا ابرک
داستاں آج بھی ادھوری ہے

"میں نہیں جانتی تھی ضامن مصطفیٰ! قبرستان سے شروع ہونے والے رشتے بھی یہاں کے باسیوں کی طرح مردہ ہوتے ہیں۔"

اظہار و اقرار کے تمام لمحے فراموش کر کے کتنی آسانی کے ساتھ کہہ دیا تھا اس نے۔ ضامن مصطفیٰ کے کانوں میں ہر لفظ بازگشت بن کر گونج رہا تھا۔ ماں کے لیے دعا کرتے ہوئے انہوں نے سر جھٹک کر ان لفظوں کو بھولنا چاہا مگر ایسا ناممکن تھا گیا۔

"قبرستان سے شروع ہونے والے رشتے کو تو پھر قبر میں تو اترنا ہے ناں ضامن مصطفیٰ۔"

اتنی سنگ دل ہو گئی تھی وہ۔ احساس تک نہیں کرتی تھی کتنی بڑی بڑی باتیں کر جاتی تھی دونوں کی سہنے کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف دہ۔ ضامن مصطفیٰ کا

ظلم یاد رہ گیا تھا اور اپنا......

انہوں نے ''آمین'' کہتے ہوئے چہرے پہ ہاتھ پھیرا اور ایک بار پھر ماں کے سرہانے بیٹھ کر ان کی آخری آرام گاہ پہ نرمی سے ہاتھ پھیرنے لگے، وہ ماں سے کچھ اور باتیں کرنا چاہتے تھے مگر اس سنگ دل کے لفظ تھے کہ کان میں آ کر شور مچانے لگتے۔

''اچھی لگتی ہے ناں آپ کو اپنے حق کے لیے لڑتی عورت ...... چلیں پھر سامنا کریں اس عورت کا۔''

کیسے تن کر کھڑی تھی وہ ان کے سامنے۔

وہ ماں سے یہ باتیں نہیں کہہ سکتے تھے اس لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی آنکھ میں آئی ہلکی سی نمی جلدی جلدی پلکیں جھپکانے سے غائب ہوئی۔

''ہاں مجھے اچھی لگتی ہے...... اپنے حق کے لیے لڑنے والی عورت۔ اپنی بربادی کے لیے لڑنے والی نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھے۔ اور قدم قبرستان سے باہر جانے والے رستے پہ تھے۔

گورکن نے ان کے قدم ناپے۔

گیارہ دن ہو گئے تھے اسے گئے ہوئے اور گیارہ دن سے ان کی بھی آوارگیاں تھیں۔ خولہ کے بنا وہ گھر انہیں ستاتا تھا۔ وہ یونہی گاڑی دوڑاتے رہتے۔ خالی خالی نظروں سے لوگوں کو دیکھتے رہتے۔ کسی ایسے جوڑے کو دیکھتے جن کی نگاہ میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور چہرے پہ ہنسی تھی تو خالی نگاہ کے پیمانے میں حسرت سی بھرنے لگتی۔

اس رات وہ یونہی بے مقصد خاک چھان رہے تھے جب انہوں نے پیروں کو چھوتی لہر محسوس کی اور خود کو اس پتھر کی جانب بڑھتے پایا جس پہ اس مہ کامل کی رات وہ خولہ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ جب پورا چاند سمندر کو دیوانہ سا کیے جاتا تھا۔ ایک منظر سا ان کے سامنے واضح ہوا۔

''ڈر تو ایک دفعہ میں آپ کی طرف سے بھی گئی تھی۔'' وہ چاندنی چاندنی ہوتی لڑکی کہہ رہی تھی۔

''کیسا ڈر خولہ؟'' انہوں نے پوچھا تھا۔

''جب میں نے آپ سے کہا کہ بابا چاہتے ہیں کہ آپ کے والد رشتہ لے کر آئیں، آپ تو اپنے بابا سے خفا تھے۔ مجھے لگا آپ میرے لیے ان کے پاس نہیں جائیں گے۔'' اس کی نظریں دودھیا پانیوں پہ تھیں۔

''خولہ! میری زندگی میں بہت کم لوگ ہیں جو میرے لیے اہم ہیں، خاص ہیں۔ میں ان کو کبھی بھی کسی قیمت پر بھی کھونا نہیں چاہتا...... کسی قیمت پر بھی نہیں۔ انہوں نے اس کی سیاہی مائل سبز چوڑیوں پہ اپنی انگلیاں پھیریں۔ ''اور آپ میرے لیے بہت اہم بہت خاص ہیں خولہ! آپ کے لیے میری انا، جنگ یا ضد کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔'' انہوں نے جواب دیا تھا۔

وہ اب بھی ان کے لیے بہت خاص تھی، بہت اہم تھی۔ وہ ان کو کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتے تھے ...... کسی قیمت پر بھی نہیں۔ پہلے بھی انہوں نے اسے پانے کے لیے اٹھائیس برس بعد اس حویلی میں قدم رکھا تھا جہاں ان کی ماں اور ان پہ ہر دروازہ بند کر کے انہیں ایک بے رحم اندھیری رات کے حوالے کیا گیا تھا۔ جہاں پھر قدم نہ دھرنے کی انہوں نے قسم کھائی تھی۔

مصطفیٰ امین کی منتوں نے بھی پھر کوئی اثر نہ کیا۔ وہ ان کی ماں کے انتقال کے بعد بار بار آتے رہے مگر بیٹے کو ساتھ نہ لے جا سکے۔ اور پھر بیٹا ایک دن اپنی کھائی قسم توڑ کر حویلی بھی گیا اور باپ کے سامنے حاضر بھی ہوا۔ کس کے لیے اس لڑکی کے لیے جس کو وہ کھونا نہیں چاہتے تھے۔ اور اسی لڑکی کو وہ کھو رہے تھے۔ اس رات کی وجہ سے جب انہوں نے آخری بار خولہ کی ہنسی سنی تھی...... ہاں وہ رات یوں آئی تھی کہ پھر دن نہ چڑھا۔

ضامن مصطفیٰ کو اپنی زندگی کی دوسری مشکل ترین رات یاد آئی۔

''مجھے ...... مجھے تمہاری مدد چاہیے۔'' ان کے سامنے اس عورت نے ہاتھ جوڑے تھے جس کی

کلائیوں میں سونے کے بھاری کنگن تھے۔

"آہ......" انہوں نے کراہ کر چہرے پہ ہاتھ پھیرا اور شور مچاتی لہروں کو دیکھا۔ کاش وہ اس ستم گر رات کو ان لہروں کے حوالے کر سکتے جو ان سے ان کی زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ چھیننے پہ تلی ہوئی تھی۔

"اب میں چاہتی ہوں کہ لوگ خولہ بنت زید کو دیکھنے آئیں۔ محبت کا ایک عظیم الشان مقبرہ بنا ڈالا ہے جسے آپ نے۔" دل کی، احساس کی، جذبات کی باتیں کرنے والی زبان اب ایسا زہر اگلنے لگی تھی کہ ضامن مصطفیٰ کا وجود نیلا پڑنے لگتا۔ وہ مرنا نہیں چاہتے تھے اور زندگی اس کے بغیر موت ہی تھی۔

"اے اللہ! میری مدد فرما۔ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اس کے دل کو واپس میری طرف موڑ دے۔"

جب بندے کو لگنے لگتا ہے کہ کوئی کام اس کے بس کا نہیں تو وہ اس ذات کی طرف رخ کرتا ہے جس کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ ان تجربوں سے دور ایک چھوٹی سی مسجد میں نماز ادا کرنے کے بعد انہوں نے گڑگڑا کر اپنے مالک سے یہ دعا مانگی۔

باہر نکل کر پھر سے وہی بے مقصد گاڑی دوڑانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ مگر کب تک...... آخر کب تک۔ گھر تو جانا ہی تھا۔ رات گئے انہوں نے بھی گھر کی راہ لی۔ غلام نبی ان کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اس کے سلام کو جواب دے کر کوٹ اور بریف کیس اسے تھما کر کھانے کے لیے منع کر کے وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے۔ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مار کر لائٹ جلائی۔ کمرہ روشن ہوتے ہی ان کی نگاہ سامنے پڑی اور ٹھٹک کر وہیں رک گئے۔

☆☆☆

وہ بہت بے چین لگ رہا تھا۔ ہمیشہ سے زیادہ۔

"میں مرجانا چاہتا ہوں۔" تھک کر وہ مولوی عبدالرحیم کے پاس آبیٹھا۔

"خالی پیٹ جتنے چکر ادھر سے اُدھر تو نے کاٹے ہیں۔ صبح تک یہی عمل کر۔ مر جائے گا۔" واحد نے مشورہ دیا۔

"مرنا تو ہر کسی کو ہے بیٹا! چاہے یا نہ چاہے۔" مولوی عبدالرحیم نے دعا پڑھ کر اس پہ پھونک ماری اور واحد کی طرف بڑھنے لگے۔

"بس مولوی...... اس بڑھاپے میں مشقت نہ کر۔ تیری پھونک پہنچ گئی ہے مجھ تک۔" واحد نے وہیں سے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکنے کی کوشش کی مگر وہ رکے نہیں تھے۔

"میری زندگی نے کبھی کسی کو نفع نہیں دیا۔ صرف نقصان دیا۔ دکھ دیا۔ میری ذات کسی کے لیے خوشی بنتی نہیں۔" عبدالہادی نے سر دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔

ایڈووکیٹ خولہ بنت زید...... اس کی محسن...... اس کی وجہ سے برباد ہو گئی۔ اور کس کس کو ختم کرے گا تباہ کرے گا وہ۔

"تمہاری ذات کسی کے لیے خوشی اور نفع بنی نہیں یا تم نے بننے نہیں دی۔"

مولوی عبدالرحیم کے الفاظ پتھر تھے، جو اس پہ پڑے تھے۔ یہ الفاظ ہاتھ تھے جو اس کے گریبان پکڑ کر اس کو جھنجوڑ گئے تھے۔

ہاں...... جب وہ کسی کے لیے مسکراہٹ بن سکتا تھا۔ فائدہ مند ہو سکتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے موقع گنوایا۔ اپنی طرف بڑھا ہاتھ تھاما نہیں۔ نراش لوٹا دیا اسے۔

"اتنا بدنصیب کوئی نہیں ہوتا بیٹا! کہ اسے کبھی کوئی موقع ہی نہ ملا ہو۔ منفی سوچ یہ مواقع ضائع کر دیتی ہے۔ کسی کو نفع خوشی دینے کے لیے بڑے موقع کی تلاش نہیں کرتے۔ چھوٹے سے عمل سے آپ کسی کے لیے مسکان بن سکتے ہیں۔ امید بن سکتے ہیں۔ دعا بن سکتے ہیں۔"

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نمرہ احمد

مالا

تیسویں قسط

"میں حیران تھی کہ مالا تمہیں ہینڈسم کیوں سمجھتی ہے۔ لیکن پھر تمہاری چالکیٹس درمیان میں آگئیں، اور انہوں نے میری بصارت دھندلا دی۔"

زیاد نے جواب نہیں دیا۔ اسی طرح اکتاہٹ سے سامنے دیکھتا رہا۔

"کتنی ہی دفعہ مجھے ریڈ فلیگو نظر آئے۔ تمہیں دیکھ کے ایک بے چینی سی ہوتی تھی۔ لیکن تمہاری ماں کے جادو جیتتے گئے۔"

"ہوں۔ انٹرسٹنگ۔" وہ کوفت سے تبصرہ کررہا تھا۔

"میرے بچے کو بھی تمہاری ماں نے مارا تھا۔ میرے دوسرے بچے کو۔"

"اونہوں؟" زیاد نے سرد سا ہنکارا ابھرا۔

"میں ان سے ملی تھی۔ ائیرپورٹ پر۔ انہوں نے کچھ پھونکا تھا مجھ پر۔ یا ان کی نظر بد تھی۔ جو بھی تھا۔ انہوں نے کیوں مارا میرے بچے کو؟ میں نہیں جانتی۔ شاید جادوگروں کو بچے مار کے طاقت ملتی ہے۔ لیکن میں اس بچے کے لیے بہت روئی تھی۔"

"سوسیڈ۔" اس نے تلخی سے سر جھٹکا۔

"حالانکہ مجھے لگا تھا کہ میں نہیں روؤں گی۔ میں پہلے بچے کے لیے ایسے نہیں روئی تھی۔ اس کی دفعہ میں اپنے غم سے روئی تھی۔ مجھے اولاد چاہیے تھی۔ لوگ کیا کہیں گے کہ ماہی ماں نہیں بن سکی۔ کہیں عباد دوسری شادی کا نہ سوچے۔ کہیں میں ساری عمر بے اولاد نہ رہ جاؤں۔" وہ سلاخیں پکڑے کھڑی اس کو دیکھ کے کہہ رہی تھی۔

"لیکن اس دوسرے بچے کے لیے میں ایک عمر روتی رہی۔ وہ مجھے ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ حورعین کو کھانا کھلاتے، اس کے کپڑے خریدتے، مجھے اپنا وہ دوسرا بچہ ہمیشہ یاد آجاتا ہے۔"

وہ دھیرے دھیرے پنجوں کے بل نیچے بیٹھتی گئی۔ اب وہ اس کے عین سامنے تھی۔

"جانتے ہو کیوں؟"

چند لمحے ہوا سا کن رہی۔

"کیونکہ میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔"

زیاد نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ آنسوؤں سے بھرا چہرہ لیے کہہ رہی تھی۔

"اس مردہ فیٹس کو دفنانے سے پہلے انہوں نے مجھے وہ دکھا دیا تھا۔ وہ چند ماہ کا تھا۔ بہت چھوٹا، لیکن اس کا جسم بنا ہوا تھا اور جب میں نے اسے دیکھ لیا تو وہ مجسم ہوگیا۔ وہ میرے دل میں کھب گیا۔" اس نے بند مٹھی دو بار سینے پر ماری۔

"سارا مسئلہ اس نظر کا ہے، زیاد۔ جو اس میں سما گیا، وہ دل سے نہیں نکل سکتا۔"

زیاد آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں بچے نہیں چاہیے تھے۔ مالا نے مجھے بتایا تھا۔ پھر جب اس نے ابارشن کروایا تو تم خوش تھے یہ بھی جانتی ہوں۔"

وہ رکی۔

"لیکن اس نے ابارشن نہیں کروایا تھا۔"

زیاد نے چونک کر اسے دیکھا۔ کندھے

سیدھے ہوئے۔

"مالا نے جھوٹ بولا تھا۔ مجھے اس کے کمرے سے یہ ملا ہے۔" اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔ ایک سفید لفافہ۔

"اسے ڈر تھا کہ تم اس کے بچے کو مار دو گے کیونکہ تمہیں بچے نہیں چاہیے تھے۔"

وہ ایک لمحے کے لیے کچھ بول نہ سکا۔ پھر گہری سانس لی۔

"یعنی وہ اب بھی پریگنٹ ہے؟ اور تمہیں لگتا ہے یہ سن کے میں تمہیں اس کے بارے میں کچھ بتا دوں گا؟" اس کے انداز میں کچھ نہ تھا۔ کوئی رحم نہیں۔ کوئی خوف نہیں۔

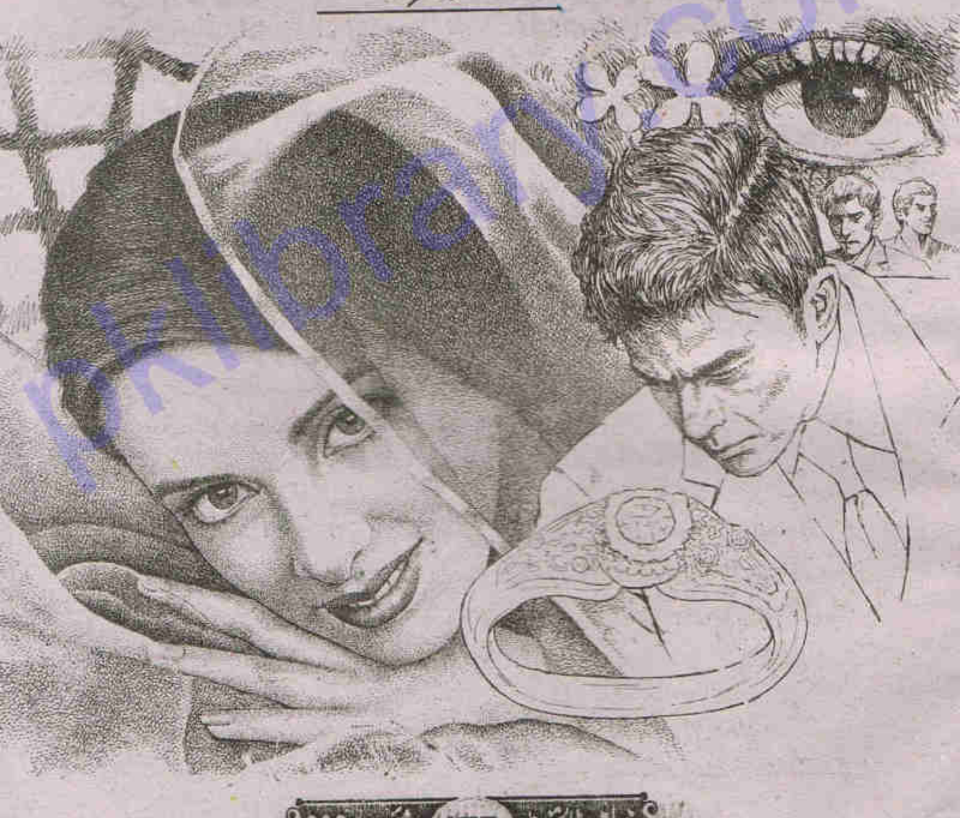
"کیا تم اب بھی اسے مرنے دو گے؟"

زیاد سلطان نے دھیرے سے شانے اچکا دیے۔ اس کے چہرے پہ کچھ بدلا تھا لیکن جب وہ بولا تو آواز ہموار تھی۔

"مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہے۔ لیکن مجھے اس کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں ہوگا۔" اس نے چہرہ پھیر لیا۔ اب وہ سرمئی دیوار کو دیکھ رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں۔ تم یہی چاہو گے کہ مالا کے ساتھ وہ بھی مر جائے۔ اسی لیے میں تم سے مالا کی

مکمل ناول



لوکیشن نہیں پوچھوں گی۔ میں تمہیں صرف اس اذیت میں ڈالنے آئی ہوں جس میں تمہاری ماں نے مجھے ڈالا تھا۔" اس نے لفافے سے ایک ننھا سا کارڈ نکالا اور اس کی طرف سلائیڈ کیا۔ زیاد چونکا۔ پھر اس نے کارڈ اٹھایا۔ اور اسے الٹا کے دیکھا۔

اگلے ہی لمحے اس کا سانس رک گیا۔

وہ ایک سیاہ سفید تصویر تھی۔

گیارہ ہفتے کا فیٹس۔

ایک ننھا سا بے بی جو اپنا سر اپنے پیروں میں دیے ہوئے تھا۔

اس کی آنکھیں اس تصویر پر جم گئیں۔

سانس تھم گیا۔

ساری دنیا رک گئی۔

سارا مسئلہ اس نظر کا تھا۔

جو اس میں سما گیا۔

وہ دل سے نکل ہی نہ سکا۔

چند منٹ بعد ماہ بینہ مبین باہر آئی تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔

"یہ مالا اور ہلال کی لوکیشن ہے۔ وہ ایک فریزنگ یونٹ میں ہیں۔ اور ایک سے ڈیڑھ گھنٹے میں وہ مر جائیں گی۔"

"یہ جگہ یہاں سے دور ہے۔ ہمیں لوکل پولیس کی مدد لینی ہوگی۔" وکرم وہ کاغذ لیے تیزی سے ایک طرف بھاگا۔

اور وہ جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔

"اس نے تمہیں بتا دیا؟"

ماہی نے بھیگے چہرے کے ساتھ شانے اچکائے۔

"ایک تصویر ہزار الفاظ پہ بھاری ہوتی ہے، ماہر بے۔"

☆☆☆

وہ جالی سے سر لگائے، نیم وا پلکوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔

دروازہ بند تھا۔

فریزر کی یخ بستہ ہوا میں ہلال کے الفاظ منجمد ہو گئے تھے۔

اب ہر طرف خاموشی تھی۔

مالا نے پلکیں جھپکائیں۔

اس نے شور سنا تھا۔

کوئی آ گیا تھا۔

دروازہ اب ٹوٹ رہا تھا۔

بہت سے لوگ اندر داخل ہوئے تھے۔ ساتھ ہی سورج کی تیز روشنی بھی آئی تھی۔

اس نے پلکیں جھپکائیں۔

کوئی اسے بازوؤں سے اٹھا رہا تھا۔

پھر پلکیں جھپکائیں۔

اب کوئی اسے اسٹریچر پر لٹائے آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے آسمان نظر آ رہا تھا۔ درخت۔ اونچے درخت اور ان کے درمیان سے جھانکتا آسمان۔

اس نے پلکیں جھپکائیں۔

اب اسے سفید چھت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ہسپتال کے کمرے میں تھی اور اس کے جسم سے نالیاں لگی تھیں۔

اس نے پلکیں جھپکائیں۔

سرد رات ختم ہو چکی تھی۔

ایک روشن دن طلوع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

ماہر فرید کے لیے وہ دن عام نہ تھا۔ وہ ڈرائیو اس کی زندگی کی سب سے طویل ڈرائیو تھی۔

راستے میں کار فون سے اس کو سب معلوم ہوتا رہا تھا۔

لوکل پولیس پہنچ چکی ہے۔

ان کو فریزنگ ٹرک مل گیا تھا۔

وہ دونوں زندہ تھیں۔
انہیں ہسپتال لے جایا گیا تھا۔
مطلوبہ ہسپتال تک کا راستہ پل صراط کے جیسا تھا۔

راستے میں بارش شروع ہو چکی تھی۔ کار کے وائپرز بار بار چل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ بار بار ناک سے گیلی سانس کھینچتا۔

اتنے برس سے وہ کہتا آرہا تھا کہ ہلال زندہ ہے۔ کوئی اس کا یقین نہیں کرتا تھا۔

آج وکرم نے کال پہ بتایا تھا کہ اس کی بہن ہلال، واقعی زندہ تھی اور اسے آج خود بھی یقین نہیں آرہا تھا۔

وہ کار پارکنگ میں روک کے تیزی سے باہر بھاگا۔ ہسپتال کی عمارت میں داخل ہوتے تک بارش نے اسے بھگو دیا تھا۔ لیکن آج اسے پرواہ نہ تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ ایک طرف پولیس آفیسرز دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ان کی جانب بھاگا۔ یقیناً ہلال بھی وہیں کہیں ہوگی۔

"ماہر..." وہ چونک کر پلٹا۔

وہ مالا تھی۔ وہ مخالف سمت ایک دوسرے کاریڈور میں کھڑی تھی۔ اس نے ہسپتال کا لباس پہن رکھا تھا۔ بال پونی میں بندھے تھے۔ اور ہاتھ کی پشت پر آئی وی لگی تھی۔

مالا کو دیکھ کے بہت کچھ یاد آیا۔ اس نے تھوک نگلا۔

"تم ٹھیک ہو؟" پھر بے چینی سے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ کسی اور سے ملنے آیا تھا۔

"ماہر، میری بات سنو۔" وہ تیزی سے اس کے قریب آئی۔ اس کے انداز میں کچھ تھا۔ بے چینی، پریشانی۔

"ہلال... ہلال کہاں ہے؟" اس کی آواز کپکپائی۔ وہ دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔

"وہ ٹھیک ہے۔ وہ اندر ہے۔ مگر پہلے بیٹھ کے میری بات سنو۔" وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کا انداز... کچھ پریشان سا تھا۔

"میں تم سے بات کروں گا لیکن بعد میں، مجھے ہلال کو دیکھنا ہے۔" اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ اس کے راستے میں کھڑی تھی۔ وہ اسے سامنے سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔

"پہلے میری بات سنو۔" اس نے اپنا بازو دیوار پر رکھ دیا تا کہ وہ گزر نہ سکے۔

"بعد میں۔" وہ تیزی سے دوسری طرف نکل گیا۔ وکرم اس طرف تھا۔ ایک کمرے کے باہر۔ اسے دیکھ کے سر کو خم دیا اور اس کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"ماہر..." وہ بے بسی سے اس کی طرف گھومی۔

لیکن وہ نہیں سن رہا تھا۔ آج اسے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تو ساری دنیا جیسے رک گئی۔

ماہر فرید نے کئی برس اس منظر کا تصور کیا تھا۔ کسی دن وہ ہسپتال کے کمرے کا دروازہ کھولے گا اور ہلال اسے کسی بستر پر لیٹی دکھائی دے گی۔ پٹیوں سے جکڑا وجود ہوگا۔ یا شاید... وہ کسی سرد خانے میں داخل ہوگا اور وہ اس کے سامنے ایک لاش سے کپڑا ہٹائیں گے۔ اور وہ ہلال کا چہرہ ہوگا۔

لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ نہ وہ زخمی تھی نہ اس کے چہرے پر کوئی نشان تھا۔

وہ بستر پر بھی نہیں لیٹی تھی۔ وہ کھڑکی کے ساتھ کھڑی باہر آنکھیں جمائے ہوئے تھی۔ گھنگریالے بال کھلے تھے۔

وہ بڑی ہوگئی تھی۔ لمبی بھی، کمزور بھی لیکن زیادہ خوب صورت بھی۔

وہ ہلال ہی تھی۔ بیربل اور اس کی لالی۔

"ہلال۔" اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

"ماہر بھائی۔" ہلال نے چونک کر گردن موڑی۔

وہ تیزی سے اس تک آیا۔وہ رو رہا تھا۔وہ ہنس رہا تھا۔اس نے اسے گلے سے لگایا۔کیا وہ واقعی ہلال تھی؟

وہ یقین کرنا چاہ رہا تھا کہ یہ اس کی ہلال ہے۔

وہ اس سے الگ ہوا۔وہ وہی تھی اور وہ مسکرا رہی تھی۔

یہ اس کی ہلال تھی۔وہ زندہ تھی۔ وہ ٹھیک تھی۔اب وہ اس کے ہاتھ چوم رہا تھا۔منظر بار بار اس کے آنسوؤں سے دھندلا جاتا۔وہ ہنس رہا تھا۔وہ رو رہا تھا۔

"ماہر بھائی..." وہ مسکرا رہی تھی۔پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ نرمی سے ماہر کی گرفت سے نکالا۔

ماہر نے بھیگی آنکھوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔

آنسوؤں کی دھند درمیان میں حائل تھی۔

اس نے پلکیں جھپکائیں۔

منظر قدرے واضح ہوا۔ہلال مسکرا رہی تھی۔

لیکن...

لیکن کچھ غلط تھا۔

"ماہر بھائی... یہ آپ ہو؟" وہ اپنے دائیں ہاتھ سے اس کے چہرے کو چھو رہی تھی۔

وہ اس کو نہیں دیکھ رہی تھی۔

اس کی آنکھیں سامنے دیوار پہ جمی تھیں۔

وہ منجمد ہو گیا۔

"You have a beard now."

(آپ کی ابھی داڑھی ہے)وہ مسکرا کے دوسرے ہاتھ سے اس کے ماتھے کو ٹٹول رہی تھی۔

اس کی آنکھیں...

اس کی بھوری خوب صورت آنکھیں خلا میں دیکھ رہی تھیں۔

اس کی آنکھیں بے نور تھیں۔

وہ کرنٹ کھا کے پیچھے ہٹا۔

کسی نے اس کا دل الٹی چھری سے ذبح کر دیا تھا۔

ہلال دیکھ نہیں سکتی تھی۔

اس کی کنپٹی کے قریب ایک زخم کا مندمل سا نشان تھا۔

ہلال... اندھی ہو چکی تھی۔

وہ قدم قدم پیچھے ہٹتا گیا۔

بے یقینی سے۔خوف سے۔

ہلال دائیں بائیں ہاتھ کرتی،اسے ڈھونڈنا چاہ رہی تھی۔ایک سفید چھڑی اس کے ساتھ رکھی تھی۔

وہ پیچھے ہٹتا گیا یہاں تک کہ وہ دیوار سے جا لگا۔اس کی آنکھیں ساکت تھیں۔

"ماہر بھائی؟ آپ کہاں ہو؟"

وہ پوچھ رہی تھی۔گردن دائیں بائیں گھماتی۔

وہ کسی مجسمے کی طرح دیوار سے لگا تھا۔

اس کی ساری دنیا بے نور ہو چکی تھی۔

☆☆☆

باہر کاریڈور میں ایک بنچ پہ بیٹھی مالا نے افسوس سے اس کمرے کے بند دروازے کو دیکھا تھا۔

"اسے میری بات سننی چاہیے تھی۔" وہ ساتھ بیٹھی ماہی سے کہہ رہی تھی جو اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔

"یہ کیسے ہوا؟"

"اسے زیاد نے چھت سے دھکا دیا تھا۔اس کی جان بچ گئی لیکن اس کی آنکھیں ڈیمج ہوئی تھیں جس کے باعث اس کی بصارت چلی گئی۔جو آنکھیں اب ہیں،وہ پروستھیٹک آئی بالز ہیں۔وہ بظاہر دیکھنے میں ٹھیک لگتی ہیں لیکن وہ بے نور ہیں۔"

"ماہر کے پاس اتنا پیسہ ہے۔وہ اس کا علاج کروا لے گا۔شاید اس کو کوئی آنکھیں ڈونیٹ کر دے تو......" ماہی نے امید باندھنے کی کوشش کی۔

"اس کے نابینا پن کا کوئی علاج نہیں ہے، ماہی۔دنیا کی ساری دولت بھی اس کی آنکھیں واپس نہیں لا سکتی۔چھت سے گرنے کے باعث اس کی آنکھوں میں نوکیلی چیزیں چبھ گئی تھیں۔آنکھ کا اسٹرکچر ختم ہو چکا ہے۔آپٹک نروڈیمج ہو چکی ہے۔"

"اگر وہ دیکھ نہیں سکتی تو اس نے وہ ڈرائنگو

کیسے بتائیں جو پولیس کو زیاد کی بیسمنٹ سے ملی تھیں؟"

"چونکہ وہ ایک زمانے میں دیکھ سکتی تھی اور وہ آرٹ بناتی تھی، سو اس کے ہاتھ کام کرتے ہیں۔ دنیا میں بہت سے بلائنڈ آرٹسٹ اور پینٹرز ہوتے ہیں، ماہی۔ وہ بھی انہی کی طرح تھی۔" وہ بار بار اس بند دروازے کو دیکھتی تھی۔

"اور تم؟" ماہی نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

وہ ہلکا سا مسکرائی۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ اور میرا بے بی بھی۔"

ابھی ماہی کے دوسرے سوال بھی شروع ہونے تھے لیکن اس میں ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

"کشمالہ مبین؟"

کسی نے اسے پکارا تو وہ پلٹی۔ پیچھے سفید سوٹ میں ملبوس ڈاکٹر کھڑی تھی۔

"مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔"

وہ اس کے پیچھے چلتی اس کے آفس تک چلی آئی اور سفید دروازے بند کردیے۔

☆☆☆

ہلال کے کمرے میں وہ ابھی تک، دیوار سے لگا کھڑا تھا اور وہ کھڑکی کے ساتھ کھڑی اس کو پکار رہی تھی۔

پھر وہ وہیں نیچے بیٹھ گیا۔ اور سر گھٹنوں میں دے کر پھوٹ پھوٹ رونے لگا۔

وہ سفید چھڑی سے چلتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ پھر پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھی۔ ہاتھوں سے اسے ٹٹولا۔ وہ سر جھکائے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

"ماہر بھائی؟" اس نے نرمی سے اس کا کندھا چھوا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

ماہر نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھایا۔

"تم مجھے دیکھ نہیں سکتیں، لالی۔ تم مجھے کبھی نہیں دیکھ سکو گی؟" وہ بے یقین تھا۔ قسمت اس کے ساتھ ایسا مذاق کیسے کر سکتی تھی؟

ہلال نے اپنا چہرہ اس کے کان کے قریب کیا۔

"جو میں دیکھ سکتی ہوں، وہ کوئی نہیں دیکھ سکتا۔"

ماہر نے اپنے بازو اس کے گرد پھیلا دیے۔ وہ زمین پر بیٹھے بیٹھے اس کے گلے لگ گئی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی بے نور آنکھیں دور کہیں کسی منظر نامے پہ جمی تھیں۔ اور وہ اس کے گھنگریالے بالوں میں چہرہ چھپائے رو رہا تھا۔

وہ اس کا چھوٹا بھائی تھا۔

اور وہ اس کی بڑی بہن تھی۔

☆☆☆

ایک ہفتے بعد۔

ماہر نے کار سڑک کنارے بنے پارکنگ ایریا میں روکی۔ پھر باہر نکلا اور متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا۔

وہ اسے جلد ہی دکھائی دے گئی۔

اس خالی احاطے کے سرے پہ وہ ایک بنچ پر بیٹھی تھی۔ اس کی ماہر کی جانب کمر تھی۔ بال کھلے تھے اور وہ گردن اٹھائے روشن آسمان کو دیکھ رہی تھی۔

وہ گھاس پہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے قریب آیا۔

وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اوپر دیکھ رہی تھی۔ مالا کے عین سامنے ایک باڑ بنی تھی اور اس کے پار ایک کھلے سبزہ زار میں بہت سے رن وے بنے تھے۔ وہ ایئر پورٹ کا احاطہ تھا۔ جہاز اتر رہے تھے۔ جہاز اڑ رہے تھے۔ جہاز فضا میں تیر رہے تھے۔

"تمہیں پلین لینڈنگز اچھی لگتی ہیں؟" وہ اس کے قریب بنچ پہ بیٹھا۔ مالا نے چونک کے اسے دیکھا۔ پھر اسی مسکراہٹ کے ساتھ شانے اچکا دیے۔

"بہت۔ میں اکثر یہاں آتی ہوں۔" پھر دائیں بائیں گردن گھمائی۔ "اکثر لوگ اپنے بچوں کے ساتھ یہاں آتے ہیں۔ آج کوئی نہیں ہے۔"

زیاد جیل میں تھا۔ سرکار مر چکی تھی۔ اور اس کے

چہرے کے تینوں دانے اس ایک ہفتے میں غائب ہو چکے تھے۔ وہ بالآخر پرسکون لگ رہی تھی۔

چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ وہ سر جھکائے جوتے سے گھاس کے تنکے کو مسلتا رہا۔ اس کا چہرہ، ایک ہفتے پہلے پولیس اسٹیشن میں رات گزارنے والے ماہر فرید سے بہتر لگ رہا تھا۔ بظاہر تازہ دم، صاف لباس، تراشیدہ شیو، لیکن اس کی آنکھیں ویران تھیں۔

"تم نے مجھے نہیں بتایا کہ سرکار کون تھی۔ بدر کون تھا۔" وہ بولا تو اس کی آواز میں کرب تھا۔ "تم نے مجھ پہ اعتبار کیوں نہیں کیا؟"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں تم پہ اعتبار نہیں کرتی، ماہر! اور یہ بھی کہ میں تمہیں سب نہیں بتاؤں گی۔"

وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔ دور سے ایک جہاز گڑگڑاتی آواز کے ساتھ ان کی طرف آ رہا تھا۔

"تم بتا سکتی تھیں۔"

"جیسے تم بتا سکتے تھے جب تم لاہور آئے تھے۔" اس نے چہرہ موڑ کے ماہر کو دیکھا۔ "اب تمہیں معلوم ہوا ماہر فرید کہ کسی کو دھوکہ دینا کیسا ہوتا ہے؟"

ماہر نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ کوئی ملال نہ تھا۔

"چلو... ہمارا حساب برابر ہوا۔ لیکن...." اس کی آواز میں گلہ در آیا۔ "تم مجھ پہ بھروسا کر سکتی تھیں۔"

"تم نے کبھی ہمارے درمیان بھروسے کا رشتہ بننے ہی نہیں دیا۔ پھر میں کیسے تم پہ بھروسا کرتی؟" وہ سامنے دیکھنے لگی۔ وہ جہاز عین ان کے سروں کے اوپر سے گزر کے رن وے کی طرف چلا گیا تھا۔

"اپنے بچے کی محبت مختلف ہوتی ہے، ماہر۔ اس میں کچھ حیوانی سا ہوتا ہے۔ مجھے اپنے بچے کو بچانا تھا۔ مجھے معلوم تھا اس کا نتیجہ دو ہی صورتوں میں نکلے گا۔ یا میں مر جاؤں گی۔ یا تم لوگ مجھے ڈھونڈ لو گے اور زیادہ گرفتار ہو جائے گا۔ مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے تھی جس میں وہ آزاد پھرتا رہے۔"

"وہ تمہیں مار سکتا تھا۔"

"وہ مجھے کبھی نہ مارتا۔ ماہی اسے وہ سب نہ کہتی، تب بھی اس نے ہماری لوکیشن بتا دینی تھی۔ اگر اسے مجھے مارنا ہوتا تو گولی مار دیتا۔ اتنی بھی مہلت نہ دیتا۔ اسے امید تھی کوئی ہمیں بچا لے گا۔" دور سے جہاز کا شور سنائی دینے لگا۔ مالا نے سر اٹھایا۔ شمال سے ایک نیلا جہاز اس طرف آ رہا تھا۔

"مجھے تمہارے اوپر بہت غصہ ہے، مالا۔" وہ دکھ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "تم نے مجھ پہ بھروسا نہیں کیا۔ تم نے مجھ سے سچ چھپایا۔ میں اس کے لیے شاید تمہیں کبھی معاف نہ کر سکوں۔"

جہاز عین ان کے سر پر سے گزر رہا تھا۔ اتنا بڑا اتنا قریب ہوا سے اس کے بال پیچھے کو اڑنے لگے۔ وہ مسکرا دی۔

"لیکن میں تمہارا احسان مند بھی ہوں۔ تم نے ہلال کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالی۔"

جہاز زن سے بینچ پہ بیٹھے دو نفوس کے اوپر سے گزرا اور سیدھا رن وے پہ جا کے اترا۔

"یاد ہے میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ لاہور میں۔"

"مجھے یاد ہے۔" ایک دوسرے جہاز کی آواز پہ بے اختیار اس نے گردن موڑی۔ آنکھوں میں اشتیاق اور ایکسائٹمنٹ تھی۔ دل جوش سے بھر گیا تھا۔ اسے لگا تھا وہ بہت عرصے بعد خوش ہوئی تھی۔

"اگر تم ہلال کی مدد کرو گی، تو تم مجھے خرید لو گی۔ تم بدلے میں مجھ سے جو مانگو گی، میں دوں گا۔" وہ رکا اور تنبیہ میں ابرو اٹھائی۔ "سوائے معافی کے۔ میں تمہیں اس چیز کے لیے معاف نہیں کروں گا۔"

جہاز اتر گیا تو اس نے مسکرا کے ماہر کو دیکھا۔

"مجھے تمہاری معافی چاہیے بھی نہیں۔"

وہ بھی ہلکا سا مسکرا دیا اور سر جھکا لیا۔

"اگر تمہیں کچھ چاہیے....."

"مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے' ماہر۔ میں نے کہا تھا نا' بنا مانگے تم میری مدد نہیں کرو گے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ تم نے زندگی میں پہلی دفعہ میری بات مانی۔"

ماہر چپ ہو گیا۔ چند لمحے وہاں خاموشی چھائی رہی۔ ایئرپورٹ کی فضا بھی ساکن رہی۔ جیسے سارے جہاز یہاں کا راستہ بھول بیٹھے ہوں۔

"ہلال کیسی ہے؟" اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" ماہر نے سر جھکا دیا۔ "میں اس کا کیس اس ایک ہفتے میں بہت سے ڈاکٹرز کو بھیج چکا ہوں۔ نگینہ سلطان نے مجھ سے پہلے ہر طرح سے ہلال کا علاج کروانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی مسخ شدہ آنکھوں میں پروستھیٹک آئی بالز تک لگوا دیے تھے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ زیاد سلطان نے جو ظلم میرے ساتھ کیا ہے' اس کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا۔"

"اور بیربل؟ تم نے اسے بتایا؟"

ماہر نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ اب سر جھکائے جوتے سے گھاس مسل رہا تھا۔

"جب مالک کو معلوم ہوا کہ نگینہ سلطان کے ساتھ سفر کرنے والی بچی کی پروستھیٹک آئیز تھیں' یعنی وہ نابینا تھی' تو اس نے مجھے نہیں بتایا۔ ویسے ہی میں نے ابھی بیربل کو نہیں بتایا۔ تاکہ اس کی تکلیف کے دن کم ہوں۔ واپس جا کے بتاؤں گا۔"

"واپس؟" وہ چونکی۔ ماہر نے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

"میں ہلال کو لے کر استنبول جا رہا ہوں۔ سرکار مر چکی ہے۔ زیاد جیل میں ہے۔ میں واپس جا کے گرفتاری دے دوں گا۔"

اور تب اسے یاد آیا۔ وہ استنبول میں پولیس کو مطلوب تھا۔

اس کے تاثرات دیکھ کے وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "ڈونٹ وری۔ میں چند دن میں باہر آ جاؤں گا۔ میری وکیل بہت اچھی ہے۔"

"اور تمہارے پاس اتنا پیسہ ہے کہ تم جج خرید سکو۔" وہ مسکرا کے شانے اچکا کے رہ گیا۔

"اور تم؟ تم کیا کرو گی؟"

اب کے اس نے غور سے مالا کو دیکھا۔

وہ اب گردن اٹھائے آسمان کو اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ افق سے ایک زرد رنگ کا جہاز طلوع ہو رہا تھا۔

"میرا اسائلم کیس مزید مضبوط ہو گیا ہے۔ میرا وکیل خوش ہے۔ مجھے جلد پی آر مل جائے گا اور چند سال بعد نیشنیلٹی۔ باقی مسئلے بھی میں ہینڈل کر لوں گی۔" وہ مسکرائی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے اپنا اسائلم کیس مضبوط کرنے کے لیے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ اس کو اپنے شوہر سے جان کا خطرہ ہے۔ اور یہ بات اب پتھر پہ لکھی جا چکی تھی۔

"کیا تم زیاد سے ملیں؟"

"نہیں۔ اس نے کسی سے بھی ملنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کی ماں نے مرنے سے پہلے ایک خط چھوڑا تھا جس میں اس نے ہلال کے اغوا کی ذمہ داری لی تھی۔ اور اپنے بیٹے کو بری الذمہ قرار دیا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس نے اپنے بیٹے سے کہا ہے کہ وہ اسے یوتھنائز کر دے۔ (یعنی اس کو مار کے زندگی کی اذیت سے بچا لے)"

"جانتا ہوں۔ تمہیں لگتا ہے وہ جلد رہا ہو جائے گا؟"

"زیاد نے ہماری لوکیشن پولیس کو بتا دی تھی۔ پھر اس کی ماں کا خط۔ ہاں۔ وہ چند سالوں میں رہا ہو جائے گا۔ لیکن اس کے وکیل نے مجھے کہا ہے کہ زیاد میرے بچے سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ اور وہ اس کی ذمہ داری نہیں لے گا۔"

"اور؟" وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور وہ آسمان کو۔

"اس نے مجھے طلاق دینے سے انکار کیا ہے۔ لیکن پاکستان میں ہمارا کیس چل رہا ہے۔ اس کے پیش نہ ہونے کی وجہ سے چند دن میں مجھے خلع مل

جائے گی۔"

اس نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی۔ چند دن بعد وہ زیاد سلطان سے آزاد ہو گی۔ اور بچے کی پیدائش کے بعد اس کی عدت ختم ہو جائے گی۔

"اور ماہی؟ وہ تم پہ غصہ ہے؟"

اس نے آنکھیں کھولیں۔ دنیا زیادہ خوش گوار لگ رہی تھی۔

"نہیں۔ وہ بس یہ سمجھتی ہے کہ میں اس بچے کو دنیا میں لا کے غلطی کر رہی ہوں۔" اس نے چہرہ موڑ کے سوچتی نگاہوں سے ماہر کو دیکھا۔

"تمہیں بھی لگتا ہے کہ میں غلط ہوں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تمہیں یہ حق نہیں ہے مالا، کہ تم باپ کے جرم کی سزا اس کے بچے کو دو۔"

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

صفورا، ماہی، ثمر خالہ... سب نے کہا تھا اب بھی وقت ہے۔ وہ اس بچے کو ختم کر دے۔ لیکن وہ پہلا انسان تھا جس نے اس کے فیصلے کا ساتھ دیا تھا۔

اتنے عرصے بعد پہلی دفعہ اسے ماہر فرید برا نہیں لگا تھا۔ "تم اس سرد ملک میں کیوں رہنا چاہتی ہو؟" وہ اب سامنے دیکھ رہا تھا۔ دور سے ایک جہاز اڑتا ہوا ان کی طرف آ رہا تھا۔

"تم استنبول آ سکتی ہو۔ تم وہاں بھی اپنی نئی زندگی شروع کر سکتی ہو۔"

مالا نے گردن موڑ کے غور سے اسے دیکھا۔

"مجھے استنبول کی امید پر اپنی نئی زندگی نہیں شروع کرنی، ماہر۔ مجھے اپنے اور اپنے بچے کے لیے اپنی زندگی شروع کرنی ہے۔"

وہ کیا کہہ رہی تھی، وہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ ابھی تک زیاد کی بیوی تھی۔ اور وہ اس سے طلاق کسی دوسرے مرد کی امید پہ نہیں لے رہی تھی۔ یاسمین درست کہتی تھی۔ اسے مالا کی زندگی سے نکل جانا چاہیے تھا۔ وہ ایک طلاق کے ٹراما سے گزرتی لڑکی کو کنفیوز نہیں کر سکتا تھا۔

"کیا تم ہمیں سی آف کرنے آؤ گی؟" وہ اب بھی سامنے دیکھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔

اس ایک لمحے میں مالا کے اس شخص سے سارے گلے شکوے دور ہو گئے۔ وہ صرف ایک بھائی تھا جس کو اپنی بہن کی تلاش تھی۔ اس نے جو کچھ کیا، اپنی بہن کے لیے کیا۔ جیسے اس نے جو کچھ کیا، اپنے بچے کے لیے کیا۔

"میں آؤں گی۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔

"اور اگر...." وہ سوچ سوچ کے کہہ رہا تھا۔ "کبھی میں تمہیں ٹیکسٹ کروں تو کیا تم جواب دو گی؟"

وہ اپنی امید زندہ رکھنا چاہتا تھا۔

اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "میں جواب دوں گی۔"

وہ بھی مسکرا دیا۔ شاید یاسمین غلط تھی۔ شاید اسے ایک کوشش کرنی چاہیے۔ ابھی نہیں۔ جب تک وہ زیاد کی بیوی ہے اور وہ اس کیس میں پھنسا ہوا ہے، تب تک نہیں۔ اس کے بعد۔ شاید۔ اگر وہ مختلف حالات میں ملے... تب شاید...

وہ اسے خدا حافظ کہہ کے اب اٹھ گئی تھی۔ ماہر خاموشی سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ بس اسٹاپ تک جا رہی تھی۔ وہ اسے ڈراپ کرنے کی پیشکش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس کی وہ مدد قبول نہ کرتی جو اس نے مانگی نہیں تھی۔

☆☆☆

پلین لینڈنگ ایریا سے وہ سیدھی بس اسٹاپ تک آئی تھی۔ اور اس وقت وہ بس میں بیٹھی موبائل اسکرول کر رہی تھی جب خیال آیا۔ کیا لوگ ابھی تک اس کو ٹک ٹاک پہ گالیاں دے رہے تھے؟ اسے وہ ویڈیو مٹا دینی چاہیے۔ اس وقت جوش میں بنا لی۔ اب شرمندگی ہونے لگی۔

اس نے ٹک ٹاک فون سے مٹا دیا تھا۔ اب دوبارہ انسٹال کیا۔ اپنی ویڈیو کھولی۔ شرمندگی بڑھ گئی۔ ہزاروں کمنٹس آ چکے تھے۔ گالیاں۔ باڈی

شیمنگ۔ وہ لوگ اس کے اوپر چڑھ دوڑے تھے۔

اف۔ اس نے سر اٹھایا۔ بس میں موجود سواریاں روبوٹس کی طرح باہر دیکھ رہے تھے۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ شکر ہے وہ اس کو نہیں پہچانتے تھے۔

اس نے ڈیلیٹ کا بٹن دبایا۔ پھر وہ رک گئی۔ لائیکس اور فالوورز کافی بڑھ چکے تھے۔

اس کی انگلی انباکس پر رینگ گئی۔

وہاں بھی میسجز کی بھرمار تھی۔ وہی گالیاں۔ وہی باتیں۔ اف اتنے ٹاکسک میسجز۔ اس کے سر میں درد ہونے لگا۔ سوشل میڈیا شدید ٹاکسک تھا۔ وہ اس ایپ کو پھر سے ڈیلیٹ کردے گی۔ میسجز پہ اس کی انگلی نیچے جارہی تھی۔ یہ لوگ جو اس کو اتنے ہفتے سے گالیاں دے رہے تھے، وہ نہیں جانتے تھے کہ چند دن پہلے وہ ایک فریزنگ یونٹ میں تھی۔ وہ مرنے والی تھی۔ اگر وہ مرجاتی تو یہی لوگ اس کو femicide victim (صنف کی بنیاد پر قتل) قرار دے کر اس کے لیے شمعیں جلاتے۔ دو رخ والے منافق۔

اس کا ہاتھ ٹھہر گیا۔

ایک میسج مختلف تھا۔

"میری ایک ماہ بعد شادی ہے اور مجھے موٹا نہیں لگنا۔ کیا آپ میری تصویریں کھینچ سکتی ہیں جیسے اس موٹی لڑکی کی کھینچی تھیں؟"

وہ بالکل ساکت ہوگئی۔ اور پھر اس کی آنکھوں نے میسجز کو اسکین کرنا شروع کیا۔ جیسے ریت سے سیپ چنتے ہیں۔

"میری ناک درست نہیں۔"

"میرے شوہر کا قد مجھ سے چھوٹا ہے لیکن وہ تصاویر میں لمبا لگنا چاہیے۔"

"آپ جو پیسے مانگیں گی میں دوں گی۔ میں پریگنٹ ہوں لیکن میری شادی کی پکچرز ایسی ہوں کہ انڈیا بھیجوں تو پریگنٹ نہ لگوں۔"

میسجز ہی میسجز۔ وین کوور اور کینیڈا کے دوسرے شہروں کے کتنے ہی لوگوں کے میسجز تھے۔

ان سیکیورٹیز کا شکار خوف زدہ لوگ۔ وہ تصاویر میں وہ لگنا چاہتے تھے جو وہ حقیقت میں نہیں تھے۔ اور اگر لوگوں کی انسیکیورٹیز اس کے بلز پے کرسکتی تھیں، جیسے پلاسٹک سرجنز اور میک اپ آرٹسٹ کے کرتی ہیں، تو اس کی آراء اور ویلیوز ایک طرف چلے جانے چاہیے تھے۔ اسے اس سرد ملک میں سروائیو کرنا تھا۔ اسے اپنا بچہ پالنا تھا۔

وہ تلخی سے مسکرادی۔ اور اس کی انگلیاں تیزی سے کی پیڈ پہ چلنے لگیں۔

☆☆☆

سوموار کی صبح وہ مسکراتے ہوئے جے پی کے دروازے کی بیل بجا رہی تھی۔ وہ نکلی تو اس کا چہرہ حیران تھا۔

"مالا؟ تم اس وقت؟" پھر جے پی کے چہرے پہ شرمندگی اتری۔ "آئی ایم سو سوری جو تمہارے ساتھ ہوا۔"

"نیور مائنڈ۔ یہ رہے تمہارے پیسے۔" اس نے ایک پھولا ہوا لفافہ اس کی طرف بڑھایا جس میں زیادہ تعداد ان نوٹوں کی تھی جو اس انڈین دلہن نے دیے تھے جو وقت سے پہلے پریگنٹ ہوچکی تھی۔ اور اسے اپنی شادی کی تصاویر سارے خاندان کو انڈیا میں بھیجنی تھیں۔

"اب تم اس عورت کے ساتھ سیٹل منٹ کرسکتی ہو۔ باقی میں تمہاری جاب چھوڑ رہی ہوں۔ مجھے باریستا بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ایک دوسرا کیریئر چن لیا ہے۔" وہ تمتماتے چہرے کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ آزاد تھی۔ وہ بالآخر آزاد تھی۔

جے پی نے لفافہ تھامنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھائے۔ اس کے چہرے پہ ندامت تھی۔

"مالا تم رہنے دو پلیز۔ تم پہلے ہی اتنے پرابلم سے گزری ہو۔ پھر تم پریگنٹ ہو۔"

"میں جانتی ہوں تمہیں کیف جمال نے یہ

کرنے کو کہا تھا۔ لیکن خیر۔ یہ میری غلطی تھی۔ میری وجہ سے ایک عورت سلپ ہوئی۔ سو مجھے پیسے دینے ہیں۔ اب تمہارا میرا معاملہ ختم۔" اس نے جتا کے کہتے ہوئے لفافہ دوبارہ بڑھایا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے' مالا۔ آگے تمہارے بہت اخراجات ہوں گے۔ اس ملک میں بچہ پالنا آسان نہیں ہے۔" اس نے زاہر کا ہاتھ واپس پلٹا دیا۔ کشمالہ ٹھہر گئی۔ مسکراہٹ غائب ہوئی۔ غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

"لیکن جے پی... تم نے اس عورت کو پیسے دینے ہیں نا۔ تو یہ اس کو دے دو۔ بات ختم۔"

جے پی نے نگاہیں جھکا لیں۔ جے پی پیسے کیوں نہیں لے رہی تھی؟

وہ ٹھہر گئی۔ ایک دم جیسے دماغ میں جھماکا ہوا۔

"کسی نے تمہیں پہلے ہی ادائیگی کر دی ہے۔ ہے نا؟" وہ پلک تک نہ جھپک سکی۔

"مالا..." جے پی نے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری۔ "کوئی میری جگہ پیسے ادا کر چکا ہے۔ اسی لیے تم نے اتنے دن سے اصرار نہیں کیا۔"

اس کے جسم کا سارا خون آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ "کس نے دیے ہیں پیسے؟ کس نے؟" وہ لفافے بھینچے بلند آواز میں پوچھ رہی تھی۔

گو کہ اسے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ جانتی تھی۔

☆☆☆

ماہر گیلے بال تولیے سے رگڑتا کمرے سے نکلا ہی تھا جب ڈور بیل بجی۔ اور اگلے ہی لمحے دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ جیسے کوئی اپنی مٹھی اس پہ مار رہا ہو۔ وہ چونکا۔ ماتھے پہ بل پڑ گئے۔ تولیہ ایک طرف اچھالا اور سیدھا دروازے تک آیا۔ میجک آئی سے باہر جھانکا۔ اس کا چہرہ دیکھ کے تعجب ہوا۔

"مالا؟ سب خیریت ہے؟"

دروازہ کھولا تو دیکھا... وہ سرخ چہرہ لیے چوکھٹ میں کھڑی تھی۔

"تم خود کو کیا سمجھتے ہو؟ بہت پیسہ ہے تمہارے پاس؟" اس نے دونوں ہاتھوں سے ایک لفافہ اس کے سینے پہ اچھالا تھا۔ وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہوا۔ ایک نظر ان نوٹوں کو دیکھا جو لفافے سے نکل کے بکھر گئے تھے۔ اور پھر اس کے چہرے کو۔

اس کے گال گلابی اور آنکھیں گیلی تھیں۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا۔ منع کیا تھا کہ تم میری زندگی میں مداخلت نہیں کرو گے۔" وہ دبا دبا سا چلا رہی تھی۔

"بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔" اس نے نرمی سے کہنا چاہا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔

"تم نے پھر سے وہی کیا جو تم کرتے آئے ہو۔ تم نے پھر سے اپنا پیسہ استعمال کیا۔ تم سمجھتے کیا ہو خود کو؟" "کیونکہ تم رو رہی تھیں۔" وہ دونوں ہاتھ اٹھا کے ایک دم بولا تو اس کی آواز میں بے بسی تھی۔ "میں تم سے ملنے آیا اور تم رو رہی تھیں۔ باتھ روم کے فرش پہ۔ اور اس میں تمہارا قصور نہیں تھا۔ زیاد نے تمہیں اس میں پھنسایا تھا۔"

"اور تمہارا گاڈ کمپلیکس زندہ ہو گیا اور تم نے سمجھا کہ تم مجھے بچا لو گے؟" وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں میری اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آئی ماہر فرید؟ تمہیں میری خواہش کا ذرا سا احترام نہیں آیا؟" "پھر تم کیا کرتیں؟" اس کی آواز بلند ہونے لگی۔ "جو بھی کرتی، میں تمہارے پاس پیسوں کے لیے نہ آتی۔" وہ دکھ سے کہہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

"میں تمہیں آزما رہی تھی۔ میں دیکھنا چاہ رہی تھی کہ تم وہی ہو یا بدل گئے ہو۔ لیکن تم نے وہی کیا جو تم ہمیشہ کرتے ہو۔ تم نے پھر سے مجھے دھوکہ دیا۔"

دروازہ ابھی تک آدھا کھلا تھا۔ چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ وہ چوکھٹ میں کھڑی چند لمحے گہرے گہرے سانس لیتی رہی۔

"آئی ایم سوری۔" وہ شکستہ سا بولا۔ گیلے بال اس کی شرٹ کے کندھوں کو بھگو رہے تھے۔

"مجھے تمہاری مدد چاہیے ہوتی تو میں مانگ لیتی۔" وہ اب کے بولی تو اس کی آواز آہستہ تھی لیکن سانس ہنوز پھولا ہوا تھا۔ "پیسے میں اپنی بہن سے بھی لے سکتی تھی۔ تم دنیا کے واحد پیسے والے شخص نہیں تھے۔ مگر مجھے یہ پیسے خود کمانے تھے، ماہر۔ مجھے اپنے پیروں پہ کھڑا ہونا تھا۔ اور میں نے وہ کر کے دکھایا۔ مجھے اپنے آپ پہ مان تھا کہ میں کسی مرد کی مدد کے بغیر خود اس مسئلے سے نکل آؤں گی۔ اسی لیے میں نے تمہیں مداخلت کرنے سے منع کیا تھا۔ لیکن تم نے مجھ سے میرا مان بھی چھین لیا کہ میں اپنے بل پہ کچھ کر سکتی ہوں۔ تم نے مجھے یہ احساس دلایا کہ مجھے ہمیشہ ایک مرد کی ضرورت رہے گی۔"

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن نہیں کہہ سکا۔ یاسمین درست کہتی تھی۔ اسے اس مرحلے میں کشمالہ سے دور رہنا چاہیے تھا۔

"تم میری ایک خواہش کا احترام نہیں کر سکے۔" وہ زخمی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اب بتاؤ میری کیا سزا ہے؟" وہ شکستگی سے پوچھ رہا تھا۔ اس کا سر درد کرنے لگا تھا۔

"مجھے تمہیں کوئی سزا نہیں دینی۔" اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کیے اور فرش پہ بکھرے کاغذوں کو دیکھا۔ "یہ رہے تمہارے پیسے۔ اب ہمارا حساب برابر ہوا۔"

پھر وہ رکی۔

وہ جانتا تھا وہ کیا کہنے والی ہے۔ وہ مالا کو بہت اچھے سے جانتا تھا۔

"میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔ میں تمہارے کسی میسج کا جواب نہیں دوں گی۔ نہ میں تم سے رابطہ رکھنا چاہوں گی۔ ہلال سے میری طرف سے معافی مانگ لینا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ جانتا تھا، وہ اس کا اعتبار پھر سے کھو چکا تھا۔

"کیونکہ تم ہمیشہ یہی کرو گے۔ تم میری زندگی اسی طرح کنٹرول کرنے کی کوشش کرو گے۔ تم ہمیشہ اپنے پیسے سے سب فکس کرنے کی کوشش کرو گے۔ اور میں تمہاری ان گیمز سے تھک چکی ہوں۔ میں تمہاری manipulation (جوڑ توڑ) تھک چکی ہوں۔ تم ایک بزنس مین ہو اور رہو گے۔" اس کا دل بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔

"ہلال اندر ہے۔ وہ سب سن رہی ہے۔ بتاؤ میں اسے کیا کہوں گا؟"

"یہی کہ وہ اور بدر ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملیں گے۔"

وہ اسے شکوہ کناں نظروں سے دیکھتی پلٹ گئی۔ ماہر تیزی سے اس کے پیچھے آیا۔

"مالا...." اس نے پکارا۔ "میرا وعدہ قائم ہے۔"

وہ لفٹ کے دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ چہرہ نہیں موڑا۔

"میں تمہارا مقروض ہوں۔ تمہارا احسان ہے میرے اوپر۔ تم جب مجھے پکارو گی میں تمہارے لیے آؤں گا۔ لیکن تمہارے پکارے بنا نہیں آؤں گا۔"

کشمالہ نے پلٹ کے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پہ افسوس بھی تھا اور ملال بھی۔

"اور میں قسم کھا کے کہتی ہوں، ماہر فرید! کہ میں نہ کبھی تمہیں مدد کے لیے پکاروں گی اور نہ کبھی تمہارے پاس آؤں گی۔ تم زندگی میں دوبارہ میری شکل نہیں دیکھو گے۔"

لفٹ کے دروازے کھلے اور وہ اس کے اندر چلی گئی۔ وہ آزردگی سے اسے دیکھے گیا۔ وہ بھی بھیگی آنکھوں میں ملامت لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

دھاتی دروازے آپس میں مل گئے۔ وہ ان کے پیچھے غائب ہو گئی۔

وہ کافی دیر چوکھٹ میں کھڑا رہا۔ پھر زور سے دیوار کو ٹھوکر ماری۔ اتنے زور سے کہ پیر کا انگوٹھا درد کرنے لگا۔

اور یہ وہ دن تھا جب کشمالہ مبین ماہر فرید کی زندگی سے چلی گئی۔

☆☆☆

چار سال بعد۔

استنبول۔

ایئر پورٹ کے باہر ٹیکسی ز کی لائن لگی تھیں۔ایک بوڑھا اہلکار جو وردی میں ملبوس تھا' باری باری قطار میں کھڑے لوگوں کو arrivals کے دروازے سے نکال کے ٹیکسی میں بٹھا رہا تھا۔

اس نے ایک بوڑھے جوڑے کو بٹھا کے ٹیکسی روانہ کی۔ پھر چہرہ موڑا تو اب اس لڑکی کی باری تھی جو قطار میں سب سے سامنے کھڑی تھی۔ سن گلاسز بالوں پہ ٹکائے' کانوں میں ایئر پوڈز لگائے 'ایک ہاتھ سے مسلسل موبائل پہ کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے سلور کیری آن بیگ کا ہینڈل تھام رکھا تھا جس کے راڈ کے ساتھ ڈیزائنر بیگ اٹکا تھا۔اس نے کہنی تک آتی آستین والا سفید منی کوٹ پہن رکھا تھا اور نیچے ٹخنوں سے ذرا اونچا سیاہ ڈریس تھا جو ہوا کے باعث پھڑ پھڑا رہا تھا۔ پیروں میں سفید ہائی ہیلز تھیں۔

"حانم آفندی....." اس نے اسے پکارا۔ اس نے چہرہ اٹھایا۔ اس کی آنکھیں سبز تھیں۔ کانوں میں ڈائمنڈز تھے۔ بیگ پر بزنس کلاس کا ٹیگ لگا تھا۔اس نے ٹیکسی کی طرف اشارہ کر دیا۔وہ شکریہ کہہ کے آگے بڑھ گئی۔ڈرائیور نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اس کا بیگ لے لیا۔وہ اسی طرح موبائل پہ جھکی پچھلی سیٹ پہ بیٹھی۔

نوجوان ڈرائیور نے کار سڑک پہ ڈالتے ہوئے بیک مرر میں اس کا چہرہ دیکھا۔اس کے بال کندھوں تک آتے تھے اور بالکل سیدھے تھے۔ ہلکا میک اپ۔سیٹ پہ رکھے بیگ کے اندر ایک کیمرہ جھلک رہا تھا۔

"کہاں جائیں گی؟"

"فور سیزنز۔"

وہ خاموشی سے کار ڈرائیو کرنے لگا۔ کار ایئر پورٹ سے شہر کی طرف جا رہی تھی۔ یہ پون گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔

"ہاں۔ابھی ٹچ ڈاؤن کیا ہے۔" وہ اب کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے فون پہ کسی سے کہہ رہی تھی۔

"نہیں ابھی نہیں۔ مجھے ہوٹل میں چیک ان کرتے ہی کہیں جانا ہے۔وہاں سے میں تمہارے پاس آ جاؤں گی۔۴ بجے تک۔" رک کے کچھ سنا۔"نہیں مجھے سات بجے تک فری ہونا ہے۔میری ایک اہم میٹنگ ہے سات بجے۔میں نے کسی کو وقت دے رکھا ہے۔" کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔"نہیں' کھانا ابھی مجھے کسی جگہ پہنچنا ہے۔ بہت اہم ہے۔" سپاٹ لہجے میں کہہ کے فون رکھ دیا۔اب وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔اس کی سبز آنکھوں کے گرد مدھم سی لکیریں تھیں۔نوجوان ڈرائیور نے آئینے میں اسے دیکھا۔

"آپ سیاح ہیں؟"

"نہیں۔"

"کیا کرتی ہیں؟"

"تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔

"بلنت۔"

"بلنت' میں فوٹوگرافر ہوں۔الوژن فوٹوگرافر۔" وہ نرمی سے مسکرائی۔

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"فوٹوگرافرز کے جادوگر۔وہ ایسا الوژن کری ایٹ کرتے ہیں جو ایگزسٹ نہیں کرتا۔وہ دکھاتے ہیں جو حقیقت نہیں ہوتی۔"

اس نے نہ سمجھنے کے باوجود اثبات میں سر ہلا دیا۔کار ہوٹل کے سامنے رکی تو وہ جلدی سے بولا۔

"آپ کو کہیں جانا ہے؟" اسے اس کی کال کی تھوڑی بہت سمجھ آئی تھی۔

"ہاں۔ میں چیک اِن کر کے آتی ہوں۔تم میٹر آن رکھو بے شک۔"

وہ بے نیازی سے کہہ کے اندر کی طرف بڑھ

گئی۔ ہوٹل کے داخلی دروازے پہ ویلے نے اس کا سامان لے لیا تھا۔

وہ پارکنگ میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ میٹر چلتا رہا۔

قریباً پندرہ منٹ بعد وہ واپس آتی دکھائی دی۔ اب اس کے پاس بس وہی ہینڈ بیگ تھا۔ وہ دوبارہ پیچھے بیٹھی اور ڈرائیور سے اس کا موبائل مانگا۔ پھر اس کے گوگل میپس پہ ایک لوکیشن کھولی۔

"مجھے یہاں جانا ہے۔"

بلنت نے سر ہلایا اور کار سڑک پہ ڈال دی۔ یہ لیونت کی ایک عمارت تھی۔

کیف آر ٹیچر ان نزم۔

کار استنبول کے اونچے نیچے راستوں سے گزرتی رہی۔ کئی گلیاں پار کیں۔ کئی دکانوں اور قہوہ خانوں کے سامنے سے گزری۔ اس شہر کے رنگ ویسے ہی تھے۔ وہی خوشبو۔ وہی رونق۔ وہی قہقہے۔

وہ خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھے گئی۔ چہرے پہ کوئی تاثر نہ تھا۔

کار اس ولا نما عمارت کے سامنے رکی تو ڈرائیور نے کارڈ مشین سامنے کر دی۔

"کیا میں آپ کا انتظار کروں؟"

"نہیں۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔" اس نے کارڈ مشین پہ کارڈ ٹیپ کیا اور اس کو دیکھے بنا باہر نکل آئی۔

سیاہ جنگلے کے سامنے رک کے مالا نے گہری سانس لی۔

("میں قسم کھا کے کہتی ہوں، ماہر فرید، کہ میں نہ کبھی تمہیں مدد کے لیے پکاروں گی، اور نہ کبھی تمہارے پاس آؤں گی۔ تم زندگی میں دوبارہ میری شکل نہیں دیکھو گے۔")

اس نے سفید ہیلو سے قدم اندر رکھے۔ ایک ایک قدم بھاری تھا۔ لیکن اب اسے فرق نہیں پڑتا تھا۔

لابی میں داخل ہوتے ہی وہ ریسپشن تک آئی۔ ریسپشنسٹ چار سال پہلے والی نہیں تھی۔ بدل چکی تھی۔ وقت بھی بدل چکا تھا۔

"مجھے ماہر فرید سے ملنا ہے۔"

"کیا آپ کے پاس اپائنٹمنٹ ہے؟" اس نے میکانکی انداز میں مسکرا کے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیا وہ جانتے ہیں کہ آپ آ رہی ہیں؟"

"نہیں۔" وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ کھڑی تھی۔

"آپ کا نام؟"

"میں اس کو خود بتاؤں گی۔" وہ اسی طرح اٹل کھڑی تھی۔ ریسپشنسٹ نے گہری سانس لے کر صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ مالا بنا کسی احتجاج کے سامنے دیوار سے لگے کاؤچ پہ بیٹھ گئی۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمالی۔

ریسپشنسٹ نے انٹرکام اٹھایا۔

انٹرکام کی گھنٹی کانفرنس روم میں بجی۔

کانفرنس روم اس وقت خالی تھا۔ طویل میز کے گرد بہت سی کرسیاں رکھی تھیں۔

وہ سربراہی کرسی پہ تنہا بیٹھا تھا۔ گرے سوٹ میں ملبوس۔ سامنے کھلی اسکرین کو دیکھتا، وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ بال جیل سے پیچھے تھے۔ چہرے پہ زیادہ کچھ نہیں بدلا تھا۔ سوائے کلین شیو ہونے کے۔ البتہ گال کا زخم ویسا ہی تھا۔

انٹرکام بجا تو ماہر نے ناگواری سے اس کو دیکھا۔ پھر ہاتھ بڑھا کے فون اٹھایا۔

"میں نے کہا تھا مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔"

"ایک خاتون آپ سے ملنے آئی ہیں۔" ریسپشنسٹ نے کہتے ہوئے مسکرا کے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔ وہ بھی اسے دیکھ کے رسماً سا مسکرائی۔

"اس کے پاس اپائنٹمنٹ ہے؟"

"نہیں۔"

"کیا تم نے اسے پہلے کبھی مجھ سے ملتے دیکھا ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر مجھے ڈسٹرب مت کرو۔"

رکھائی سے کہہ کے اس نے ریسیور واپس رکھا۔ پھر اسے قدرے ٹیڑھا کر کے رکھا تا کہ وہ انگیج ہو جائے۔ اور واپس اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

نیچے ریسپشن کے کاؤچ پہ بیٹھی مالا خاموشی سے سامنے دیکھتی رہی۔ دیوار پہ لگے وال کلاک کی سوئی آگے بڑھتی گئی۔ ایک گھنٹہ۔ سوا گھنٹہ۔ وہ وہیں بیٹھی رہی۔ ورکرز اس کے سامنے باہر سے لابی تک آتے ۔لفٹ کے دروازے کھولتے ۔اندر جاتے' کارڈ سوائپ کرتے ۔لفٹ چل پڑتی اور انہیں اوپر لے جاتی۔ ریسپشنسٹ وہیں بیٹھی اسے نظر انداز کیے کام کرتی رہی۔

تین بج گئے جب وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ ایک آرکیٹکٹ لفٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ اسی سکون سے چلتی اس کے ساتھ سوار ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ ریسپشنسٹ اسے روک سکتی۔ وہ وہیں کھڑی ہو گئی۔ آرکیٹکٹ نے اپنا کارڈ سوائپ کیا۔ پھر بٹن پریس کیا۔ اور سوالیہ نظروں سے مالا کو دیکھا۔

"ماہر فرید۔" اس نے مسکرا کے بتایا۔ اس کے انداز میں رعب تھا۔ حاکمیت تھی۔ آرکیٹکٹ نے سر ہلا دیا۔ دروازے بند ہو گئے۔ ریسپشنسٹ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی لیکن تب تک لفٹ کے دروازے باہم مل رہے تھے۔ مالا نے مسکرا کے اسے ہاتھ ہلا دیا۔

لفٹ نے اسے جس ہال میں اتارا' وہ اسے پہچانتی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ بھرا ہوا تھا۔ ڈیزائنر فرنیچر۔ بدلا ہوا انٹیریئر۔ چھت کی فالس سیلنگ بھی ہو چکی تھی۔ وہ دائیں بائیں دیکھتی اندر داخل ہوئی۔ ایک ڈیسک کے پاس رکی۔

"ماہر فرید کہاں ہے؟" سوالیہ ابرو اٹھایا۔

"وہ میٹنگ میں ہیں۔ آپ...." ایک لڑکا بوکھلا کے اٹھا لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔ وہ رک گیا۔ اب وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اس کی نگاہوں کے زاویے سے دیکھ چکی تھی کہ وہ کہاں ہے ۔اسے آگے کا راستہ معلوم تھا۔

زینے آدھے ہوئے جب دیوار پہ لگا آئینہ دکھائی دیا۔ اندر لگا نیلا مخملیں پردہ ویسا تھا۔ وہ ہٹا ہوا تھا۔ سامنے ایک کانفرنس ٹیبل کے گرد بہت سے افراد دکھائی دے رہے تھے۔

مالا دو زینے اوپر چڑھی۔

اور تب وہ اسے دکھائی دیا۔

وہ سربراہی کرسی کے پیچھے کھڑا' ناخوشی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ چڑچڑا سا' اکتایا ہوا۔ ایک لڑکی نے سر اٹھا کے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے اسے ڈپٹ کے چپ کروا دیا۔

تین زینے اوپر۔

وہ ہاتھ میں پین پکڑے اسے ہلاتے ہوئے' اپنی بات سمجھاتا دائیں بائیں ٹہل رہا تھا۔ سفید شرٹ۔ سیاہ پینٹ۔ شرٹ کے کف موڑے۔ وہ بار بار بالوں میں ہاتھ پھیرتا۔ وہ مضطرب تھا۔ ناخوش۔ پھر وائٹ بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ پلٹا۔ نگاہ سیڑھیوں کے وسط میں لگے آئینے پہ پڑی۔

وہ تھم گیا۔

ساری دنیا تھم گئی۔

وہ قدم بقدم چلتی اوپر آرہی تھی۔

وہ ہاتھ میں قلم لیے.... بالکل منجمد سا کھڑا تھا۔

وہ نیلے پردوں کے ساتھ آرکی۔

انگلی کی پشت سے دستک دی۔ شیشے کا دروازہ کھولا۔

آواز پہ سب نے گردن موڑ کے دیکھا۔

سیاہ سفید لباس والی لڑکی ان کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ ماہر کو دیکھ رہی تھی اور وہ اسے۔ پھر وہ ہلکا سا مسکرائی اور ان تمام افراد کو دیکھا۔

"کین یو گو اس آمنٹ؟" (کیا آپ ہمیں ایک منٹ دیں گے؟" وہ انگریزی میں شائستگی سے بولی۔ سب کی نگاہیں ماہر فرید کی طرف اٹھیں۔ سوائے عبدالمالک فرید کے' آج تک اس

کی میٹنگ میں کسی نے خلل نہیں ڈالا تھا۔
ماہر نے دھیرے سے سر کو جنبش دی۔ ایک ایک کر کے تمام افراد اٹھ گئے۔ جلدی جلدی چیزیں سمیٹی گئیں۔ وہ کب وہاں سے گئے۔ اسے کچھ معلوم نہ ہوا۔ یہاں تک کہ دروازے بند ہو گئے اور وہ اس کے دائیں جانب رکھی کرسی تک آئی۔
وہ ابھی تک اسے دیکھ رہا تھا۔ بے یقین۔ ششدر۔ کیا یہ سچ تھا؟ کیا وہ جاگا ہوا تھا؟ "میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔" وہ سنجیدہ تھی۔ اس کا چہرہ برف کے جیسا تھا۔ وہ کرسی پہ بیٹھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائی۔ پرس میز پہ رکھا۔
وہ جیسے ہوش میں آیا۔ بہت کچھ یاد آیا۔
"مالا؟"
اس ایک لفظ میں بہت سے سوال تھے۔ تعجب تھا۔ بے یقینی تھی۔
"میں فور سیزنز میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ شام سات بجے میں وہاں تمہارا انتظار کروں گی۔ تب تک تم آفس سے فارغ ہو چکے ہو گے۔ تمہیں وہاں آنا ہے اور ہم بیٹھ کے بات کریں گے۔" وہ جیسے اس کو اس کا شیڈول سنا رہی تھی۔
وہ ابھی تک کھڑا تھا۔ بس یک ٹک اسے دیکھتے ہوئے۔ یہ وہی تھی۔ کشمالہ مبین۔ بال چھوٹے تھے۔ چہرہ قدرے میچور تھا لیکن یہ وہی تھی۔
"میں تمہارا انتظار کروں گی۔"
"کیوں؟" اسے دیکھتے ہوئے ماہر نے آنکھوں کی پتلیاں سکوڑیں۔ اس کا ذہن دھیرے دھیرے جاگ رہا تھا۔
"کیونکہ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔" وہ ایسے بتا رہی تھی جیسے اسے اس کے سوال پہ حیرت ہوئی ہو۔ "کیا تمہیں بھول گیا کہ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا؟ تمہارے اوپر میرا ایک احسان ہے۔" کچھ جتاتا ہوا سا تھا اس کے لہجے میں۔
"اور تم نے قسم اٹھائی تھی کہ تم کبھی مجھے نہیں پکارو گی۔" اسے سب کچھ یاد آگیا۔ ایک دم سارے اعصاب تن گئے۔ پیشانی پہ بل آگئے۔
"میں اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دوں گی، ڈونٹ وری۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"شام سات بجے۔" ابرو اٹھا کے یاددہانی کروائی اور دروازے کی طرف بڑھی۔
اور اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔
"میں نہیں آؤں گا۔" وہ بولا تو اس کی آواز میں زمانوں کی تلخی تھی۔
کشمالہ نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی۔ پھر اس کی طرف پلٹی۔ اسی بے تاثر چہرے کے ساتھ اسے دیکھا۔
"کیوں؟"
"کیونکہ میں زندگی میں آگے بڑھ چکا ہوں، کشمالہ بی بی۔" وہ اسی تلخی سے کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بہت سی شکایتیں تھیں، زخم تھے، ملال تھا۔
"میں نے تمہیں پہلے سال ای میلز لکھی تھیں۔ تم نے جواب نہیں دیا۔ پھر میں نے تمہیں چھوڑ دیا اور جسے چھوڑ دیا اسے چھوڑ دیا۔ اب تم یوں اچانک میری زندگی میں نہیں آسکتیں۔" اس کی آواز میں غصہ در آیا۔ بے بسی بھرا غصہ۔
"نہ میں اب تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہوں۔"
وہ ابھی بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیا وہ انسان تھی؟ یا برف کا مجسمہ؟
غصہ۔ بہت سا غصہ اس کے اندر ابلنے لگا۔
"تم نے میری بہن کی جان بچائی۔ تمہارا شکریہ۔ لیکن میں اب تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا نہ کروں گا۔"
وہ رکا۔ ہلکا سا کھنکھارا۔
"میں شادی کر رہا ہوں اور اس وقت میں نہیں چاہتا کہ ہمارے راستے ٹکرائیں۔"
وہ اسی طرح اسے دیکھتی رہی۔
پھر اس نے پرس میں ہاتھ ڈالا۔ کچھ مٹھی میں دبایا اور قدم قدم چلتی اس کے قریب آئی۔
"شادی کر رہے ہو تو میری مبارک باد قبول

کرو۔ مر رہے ہو تو فاتحہ۔" ساتھ ہی اس نے مٹھی میں رکھی شے اس کی میز پہ رکھی۔

"لیکن تم آؤ گے ماہر فرید۔ تم آؤ گے اور میری بات سنو گے اور تم میری مدد بھی کرو گے۔ کیونکہ میں نے تمہاری مدد کی تھی۔" برف جیسے لہجے میں ارتعاش پیدا ہوا تھا۔ اسے لگا کشمالہ کی آواز بھیگی تھی۔

ماہر کی نظریں میز پہ جھکیں۔ مالا نے اس چیز سے ہاتھ ہٹایا۔

وہ ایک تصویر تھی۔

ایک تین سال کے بچے کی تصویر۔

"یہ بدر [illegible] اور زیادہ جیتا بدر۔"

ماہر اس تصویر کو دیر تک دیکھ رہا تھا۔

"دو ماہ پہلے ایک حادثے میں بدر کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔"

اس نے بے یقینی سے چہرہ اٹھا کے مالا کو دیکھا۔ اس کی سبز آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

"یعنی پولیس کہتی ہے کہ وہ مر گیا تھا۔ لیکن.... میں جانتی ہوں کہ وہ نہیں مرا۔"

وہ بنا پلک جھپکے ان بھیگی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ کھو گیا ہے۔ کسی نے اس کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ میں نے اسے بہت ڈھونڈا ہے لیکن وہ مجھے نہیں ملا۔"

وہ برف کا مجسمہ نہیں تھی۔ وہ ایک ماں تھی جو اپنی عزت نفس پہ پیر رکھ کے وہاں آئی تھی۔

"اور تم...." اس نے انگلی کی نوک سے آنکھ کا کنارہ صاف کیا۔ اور جب بولی تو آواز ویسی ہی پتھر تھی۔

"تم مجھے میرا بیٹا ڈھونڈ کے دو گے جیسے میں نے تمہیں تمہاری بہن ڈھونڈ کے دی تھی۔ مجھے نہیں پرواہ کہ تم اپنی زندگی میں کیا کر رہے ہو۔ لیکن تم...." اس نے پرس اٹھایا اور پلٹنے سے پہلے آخری دفعہ تنبیہ کی۔

"تم آؤ گے۔ تم مجھ سے ملنے آؤ گے۔ اور تم مجھے میرا بیٹا واپس لا کر دو گے۔" اس نے گیلی سانس ناک سے اندر کھینچی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ ساکت جامد۔

وہ جیسے آئی تھی، ویسے ہی چلی گئی۔

اس نے بہت دفعہ سوچا تھا کہ کشمالہ بیبن سے دوبارہ ملنا کیسا ہوگا۔ لیکن آج... اس نے نفی میں سر ہلایا اور میز پہ رکھی تصویر دیکھی۔

کاش وہ مختلف حالات میں ملے ہوتے۔

☆☆☆

"استنبول"

محبت کا اپنا انداز ہے
کیا عجیب
انتہائی غیر متوقع وقت پہ
مرجھانے کا
یا کھل اٹھنے کا۔
ایسی ہی ہوتی ہے محبت۔
ایک بے قابو حیوان کے جیسی
جو ہوتا ہے کسی پھول کے جسم میں۔
سورج ہمیشہ اس پر نہیں چمکتا۔
نہ ہی بارش ہر بار اس پر گرتی ہے۔
نہ ہی وہ ہمہ وقت طوفان کی زد میں آتا ہے۔
محبت ہمیشہ سب سے میٹھی
سب سے خوب صورت خوشبو سے معطر نہیں ہوتی۔
اور کبھی کبھی یہ اپنے کانٹوں سے لہولہان بھی کر دیتی ہے۔
سو تم...
اس کو پانی دو۔
ڈھیروں روشنی دو۔
اس کا خیال رکھو۔
اور محبت کا پھول
تم سے زیادہ جیے گا۔
اس کو نظر انداز کرو گے
یا اس کو کاٹتے رہو گے
تو اس کی پتیاں مرجھا کے مر جائیں گی۔

ایسی ہی ہوتی ہے محبت۔
کاملیت ایک سراب ہے۔
سو محبت کرو اس سے
جو تم سے محبت کرتا ہو
غیر مشروط۔
اور چھوڑ دو اس کو
جو تم سے محبت کرے
صرف اچھے وقتوں میں۔
(سوزی قسیم)
کئی برس پہلے…
ایک دفعہ کا ذکر ہے…
برفیلی چادر جیسی زمین پر سیاہ درخت یوں کھڑے تھے کہ ان کے پتوں پر سفید کمبل چڑھا تھا۔ ہوا کا جھونکا آتا اور سفید ذرے تھرتھرا کے نیچے گر کے فنا ہو جاتے۔

درختوں کے وسط میں لکڑی کا کاٹیج خاموش بیٹھا، خود پر برف کو گرنے دے رہا تھا۔ اس کی کھڑکیاں اندر جلتی آگ کی حدت سے زرد ہو رہی تھیں۔

"جادوگرنی نے غصے میں رلپنزل کے بال کاٹ دیے…."

اندر آگ اور ہیٹر کی گرمائش تھی۔ ماہر ونگ چیئر پر نیم دراز، پیر اوٹومن پر رکھے، کمبل خود پر ڈالے ہوئے تھا۔ ہلال پہلو میں لیٹی، سر اس کے کندھے پر جمائے گھنگریالی لٹ انگلی پر لپیٹ رہی تھی۔ بڑی بڑی بھوری آنکھیں چھت سے جھولتے سادہ فانوس پہ جمی تھیں۔

"اور اسے کسی جنگل میں چھوڑ آئی۔" ماہر کی آواز غیر آرام دہ انداز میں خاموش ہوئی۔ نگاہوں نے اگلے پیراگراف کو اسکین کیا۔ کہانی نے ایک تلخ موڑ لے لیا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟"

باہر برف بنا چاپ کے گر رہی تھی۔ ساری دنیا سفید ہو چکی تھی مگر لکڑی کے کاٹیج کی کھڑکیاں ہنوز سنہری تھیں۔

"فاسٹ فارورڈ پلیز۔" اوون کے روشن دروازے سے اندر جھانک کے کیک کی سطح کا جائزہ لیتا بیربل بےزار ہوا۔

ماہر کھنکھارا۔

"اس شام جب شہزادہ واپس آیا تو جادوگرنی نے رلپنزل کی کٹی ہوئی چوٹی کو کھڑکی سے باندھ دیا۔ جب شہزادے نے پکار کے کہا کہ 'رلپنزل! رلپنزل! اپنے بال نیچے گراؤ!' تو جادوگرنی نے چوٹی نیچے پھینک ڈالی۔"

"چچ۔" ہلال نے ماتھے کو چھوا۔

"شہزادہ اوپر آیا تو دیکھا کہ جادوگرنی اس کو غصے سے گھور رہی تھی۔ وہ اس کو دیکھ کے بولی۔ "تم اپنی شہزادی کے لیے آگئے۔ لیکن افسوس۔ وہ خوب صورت پرندہ اب اس گھونسلے میں نہیں ہے، نہ وہ یہاں گنگنا رہی ہے۔ اس کو بلی کھا گئی ہے اور وہ تمہاری بھی آنکھیں نوچ ڈالے گی۔ تم رلپنزل کو کھو چکے ہو۔ اب تم اسے کبھی نہیں دیکھ پاؤ گے۔"

"آنکھوں والی بات سینسر کر دو ماہر…." بیربل کچن کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا ایک باؤل میں فروسٹنگ تیار کرتے ہوئے آنکھ سے اشارہ کر رہا تھا، لیکن ماہر کی نگاہیں کتاب پہ جمی تھیں۔

"شہزادہ اتنا غم زدہ ہوا کہ اس نے…." ماہر رکا۔ اس کی آواز ہچکچائی۔ "اس نے ٹاور کی چھت سے… چھلانگ لگا لی۔"

نگاہیں اٹھا کے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے بیربل کو دیکھا۔ بیربل پیالے میں ہاتھ دیے ملامتی نظروں سے اسے دیکھتا نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ (ایک بچے کو برادرز گریم کا ورژن کون سناتا ہے ماہر ہے؟)

"شہزادے کی جان بچ گئی، لیکن اس کی آنکھوں میں کانٹے چبھ گئے۔ اور وہ…." وہ کھنکھارا۔ تھوک نگلا۔

"وہ اندھا ہو گیا۔" کن انکھیوں سے ہلال کو دیکھا۔ وہ ابھی تک چھت کو دیکھتی انگلی پر بال لپیٹ

رہی تھی۔ چہرے پہ افسوس تھا۔
"پھر؟" وہ چند لمحے خاموش رہا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
ماہر نے سر جھٹکا اور کتاب بند کی۔
"پھر کچھ نہیں۔ جنگل میں بھٹکتے بھٹکتے، ایک دن اس کو ریپنزل مل گئی۔ ریپنزل کے آنسو اس کی آنکھ میں پڑے تو وہ تندرست ہو گیا اور دیکھنے لگا۔ پھر دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔" اس نے تکلیف اور رنج کے حصے کو دو سطور میں بیان کر دیا۔ ہلال نے ابرو بھینچ کے خفگی سے اسے دیکھا۔ پھر جیسے ناراضی دکھانے کا ارادہ بدل کے سر جھٹکا۔
"کیا میں آپ سے ایک سوال پوچھ سکتی ہوں، ماہر بھائی؟" لانبی پلکیں جھپکائیں۔
"ہوں؟" اس نے بے دلی سے کتاب ایک طرف ڈال دی۔ ہیزل ابھی تک "میں نے کہا تھا" والی فاتحانہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ فیری ٹیلو کے اولین ورژن، بالخصوص برادرز گریم کے تحریر شدہ ورژن تاریک، تلخ اور تکلیف سے بھرے تھے۔ بعد میں نئے لکھاریوں اور پھر ڈزنی نے ان کو خوب صورت اور تصورات سے بھرپور بنا دیا۔
"اگر شہزادے کو جنگل میں بھٹکتے ہوئے ریپنزل نہ ملتی تو کیا ہوتا؟" وہ اس کے کندھے پر رکھا چہرہ موڑ کے اس کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
"معلوم نہیں۔"
"میں بتاؤں؟"
"بتاؤ۔"
"ریپنزل خود کو ٹاور سے گرا لیتی اور اس کی آنکھیں چلی جاتیں۔" کہتے ہوئے اس نے دھیرے سے پلکیں جھپکائیں۔ ماہر تھوڑی جھکا کے اس کی آنکھوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔ لانبی پلکوں والی بھوری چمک دار آنکھیں۔ ایک وہم سا ذہن کے کسی تاریک گوشے میں ابھرا۔ ایسے کہ وہ ایک دم جھرجھری لے کر سیدھا ہوا۔
"بی درست کہہ رہا تھا۔ ہم ٹینگلڈ دیکھ لیتے ہیں کیونکہ..."
وہ کمبل پیروں سے ہٹا کے اب اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"اس میں کوئی ٹاور سے نہیں گرتا، کوئی اندھا نہیں ہوتا، اور شہزادہ بروقت پہنچتا ہے۔"
اس نے ہاتھ ہلال کی جانب بڑھایا اور مسکرا دیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی مسکراہٹ چمکی۔ اس نے ماہر کا ہاتھ پکڑ لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
باہر سیاہ درختوں پر گرتی برف کی تہہ بھاری ہو رہی تھی۔

☆☆☆

موجودہ دن...
کانفرنس روم خالی تھا۔ نیلا مخملیں پردہ ٹھہر چکا تھا۔ اس کے پار سیڑھیوں پر لگا آئینہ بے عکس تھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔
وہ سبز آنکھوں اور کندھوں تک آتے بالوں والی لڑکی اپنی بات کہہ کے جا چکی تھی۔
ماہر فرید تنہا میز کے سرے پہ کھڑا تھا۔ ساکت، جامد۔
پولرائیڈ کیمرے سے لی گئی۔ وہ تصویر اسی طرح میز پر رکھی تھی۔ وہ لمحے آئے اور گزر گئے۔ پھر وہ قدرے جھکا۔ دو انگلیاں تصویر پر رکھیں اور اسے دھکیلتا گیا، یہاں تک کہ تصویر ٹیلی فون ریسیور اور سینٹر پیس تک جا رکی۔ ماہر نے سینٹر پیس اٹھا کے اس پر رکھا۔ وہ چھپ گئی۔ نگاہ سے اوجھل۔ ذہن سے اوجھل۔
"میری مہمان جا چکی ہے۔" وہ اب سربراہی کرسی پر براجمان انٹرکام پہ کہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ "ہم میٹنگ کو وہیں سے شروع کریں گے۔ اس خلل کے لیے معذرت۔"
چند لمحوں میں کمرہ پھر سے بھر گیا۔ چند خاموش نگاہوں نے اس کرسی کو دیکھا جس کے قریب وہ چند منٹ پہلے کھڑی تھی، کہ ماہر کی میٹنگ میں ایسے بھی کوئی خلل نہیں ڈال سکتا تھا۔ لیکن سب چہرے اپنے

کام میں دوبارہ مصروف ہو گئے۔ بے تاثر پروفیشنل جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ایک نوجوان اٹھ کے اب کچھ بتا رہا تھا۔ قلم ہاتھ میں پکڑے دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے۔

ماہر خاموشی سے کرسی پر بیٹھا اس کو سنے گیا۔ کن انکھیوں سے وہ وال کلاک کو دیکھ سکتا تھا۔ سات بجنے میں کئی گھنٹے حائل تھے یا شاید کئی صدیوں کا فاصلہ تھا۔

ٹک ٹک...

☆☆☆

ٹک...

ہوٹل کے اس لاؤنج کی دیوار پر بھی ایک گھڑیال آویزاں تھا، جس کی سوئیاں وقت کو پیچھے چھوڑے آگے بڑھ رہی تھیں۔

مالا نے پلٹ کے ایک نظر سوئی کے منہ سے ٹکراتے ہندسے پہ ڈالی۔ چھ۔ ابھی ایک گھنٹہ رہتا تھا۔ اور وہ واپس گھوم گئی۔ چہرے پر ہی مسکراہٹ سجائے وہ لاؤنج کے دہانے پر کھڑی اپنے مہمانوں کو الوداع کہہ رہی تھی۔

"صبح ملتے ہیں۔" اس نے نوجوان لڑکے اور لڑکی کو باری باری مسکرا کے دیکھا۔ "اور یاد رہے، ہم نے گزشتہ ایونٹ والی غلطیاں نہیں دہرانی ہیں۔"

لڑکی جھینپ کے ہنس دی۔ پھر اس نے مالا سے مصافحہ کیا اور اپنے آئی پیڈ کی اسکرین بجاتے ہوئے پلٹ گئی۔ وہ دونوں راہداری میں آگے بڑھ گئے۔ ان کے ساتھ ساتھ ایک دربان، سنہری ٹرالی میں کسی سیاح کے سوٹ کیس دھکیلتا جا رہا تھا۔ مخالف سمت سے چند خواتین کا گروپ آتا دکھائی دے رہا تھا۔ پچاس، پچپن کے لگ بھگ عورتیں، سینے پر کسی ایشائی خدوخال کے سنگر کے فوٹوز کے اسٹکرز لگائے، وہ یقیناً کسی کانسرٹ میں جا رہی تھیں۔

وہ سامنے سے ہٹیں تو مالا نے متلاشی نگاہوں سے راہداری کو دیکھا۔ وہاں کوئی شناسا چہرہ نہیں تھا۔

وہ لاؤنج اور راہداری کے دہانے پر کھڑی تھی۔ اسے بیٹھ جانا چاہیے۔ ابھی وقت تھا۔

چھ بج کے دس منٹ۔

گھڑیال کو دیکھتے ہوئے وہ بے چینی سے دیوار سے لگے صوفے تک آئی۔ یہاں سے اسے داخلی دروازہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ جیسے ہی آئے گا وہ اسے دیکھ لے گی۔

لیکن کیا وہ آئے گا؟

وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ پیچھے ٹیک لگالی۔ بازو سینے پر لپیٹ لیے۔

مٹھیاں یوں بھینچ رکھی تھیں کہ ناخن ہتھیلی میں پیوست ہو رہے تھے۔

کیا وہ آئے گا؟

وہ جس کی آنکھوں میں اس کے لیے ناپسندیدگی اور بے اعتنائی تھی۔

یہ سب کہاں سے شروع ہوا تھا؟

ساڑھے تین ماہ قبل۔ جب وہ اس شہر میں آئی تھی۔ اس محبت کے شہر میں۔

اس کی نظریں گھڑیال پہ جمی تھیں۔ سوئی دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔

لیکن پھر.... سوئی پیچھے کو سرکنے لگی۔

کھڑکیوں کے باہر پھیلے آسمان اور گھاس کی رنگت بدلنے لگی۔

خزاں چھٹتی گئی اور موسم گرما سارے میں پھیلنے لگا۔

☆☆☆

(ساڑھے تین ماہ قبل)

وہ بہار کی ایک روشن صبح تھی۔

یہ ایک پتھروں سے بنی گلی تھی، جس کے دونوں کناروں پر کیفے، ریستوران اور دکانیں بنی تھیں۔ ابھی سورج ٹھیک سے نہیں نکلا تھا۔ آسمان سفید تھا، سنہرا نہیں۔ البتہ فوٹوگرافرز کی صبح کئی گھنٹے پہلے سے شروع ہو گئی تھی۔

سنہری گھڑی کی تلاش میں مالا ایک بیکری کے سامنے کھڑی تھی، جس کے شیشے کے پار ایک لڑکی ٹرے میں کچے کروسنٹ سجائے، اوون میں رکھتی

دکھائی دے رہی تھی۔ اکثر دکانیں بند تھیں، سوائے ایک دو کافی شاپس کے، جن سے ترکش قہوے کی بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

جس گلی میں وہ اس وقت موجود تھے، وہ اونچائی کی سمت جاتے ہوئے گلاطہ ٹاور پہ ختم ہوتی تھی۔ وہ اپنا سونی اے سیون آئی وی اونچا اٹھائے، ننھی اسکرین پر گلاطہ کا اونچا مینار دیکھ رہی تھی۔ سر پر سلک کا سبز رومال باندھے، جس کی پشت سے اس کے کمر پر گرتے بال دکھائی دے رہے تھے۔ خاکی فراک پہنے، جو ٹخنوں تک آتا تھا، وہ رومال سے ہم رنگ آنکھیں چھوٹی کر کے بغور فریم کو دیکھ رہی تھی۔ چہرہ ویسا ہی تروتازہ تھا۔ البتہ صبح جلدی اٹھنے کے باعث آنکھیں قدرے خوابیدہ تھیں۔

دفعتاً وہ رکی۔ سبز آنکھوں میں متلاشی سا تاثر ابھرا۔ گردن دائیں بائیں گھمائی۔

اور پھر لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

ایک دکان کے سرخ چھجے تلے بچھی کرسیوں میں سے ایک پر وہ بیٹھا تھا۔

سر جھکائے، میز پر کلرنگ بک رکھے، وہ کریونز سے اس میں کوئی رنگ بھر رہا تھا۔

"بدر۔" وہ اس کے قریب چلی آئی۔ پنجوں کے بل اس کی کرسی کے ساتھ پتھریلی زمین پر بیٹھی۔

وہ سر جھکائے رنگ بھرتا رہا۔

"بدر۔" نرمی سے اسے دیکھتے ہوئے مالا نے پھر سے پکارا۔

بدر نے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

وہ تین، ساڑھے تین سال کا بچہ تھا۔ اس کی رنگت میں خوب صورت سا سانولا پن تھا۔ اور آنکھیں سبز تھیں۔ بال ماتھے پر گرے تھے۔

"کچھ کھاؤ گے؟"

وہ سبز آنکھوں میں سادگی لیے مالا کو دیکھتا رہا۔

"کچھ کھاؤ گے؟" وہ اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیے پوچھ رہی تھی۔

بدر نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر وہ رکا۔ نگاہیں میز تک گئیں جہاں مالا کا بیگ رکھا تھا۔ بیگ کے کھلے دہانے سے ایک بوتل جھانک رہی تھی۔ بدر نے پہلے بیگ کو دیکھا۔ پھر مالا کو۔

"پانی چاہیے؟"

بدر نے اثبات میں گردن ہلائی۔ مالا اٹھ کھڑی ہوئی اور بوتل نکالی۔ ساتھ ایک نیلے رنگ کا کپ بھی تھا۔ وہ اس میں پانی بھرنے لگی بدر پانی کی دھار کو دیکھے گیا۔ اس نے کپ اسے تھما دیا۔ بدر نے کپ لے کر میز پر رکھ دیا اور سرخ کریون اٹھا لیا۔ اس کی ننھی انگلیوں پر بھی کریون کا رنگ آ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ کچھ دیر بعد پانی پیے گا۔

وہ سیدھی کھڑی ہوئی جب سنبل قریب آئی۔ اس کی گردن میں اسٹریپ کے ساتھ ایک فوجی فلم کا کیمرہ لٹک رہا تھا اور وہ چیونگم چبا رہی تھی۔ ایک نگاہ کلرنگ بک پہ جھکے بدر پہ ڈالی۔

"آپ بدر کو ساتھ لائی ہیں؟"

"ہوٹل میں تو نہیں چھوڑ سکتی تھی نا۔" وہ واپس اپنی جگہ پر آن کھڑی ہوئی اور مسکرا کے اس جوڑے کو ہاتھ ہلایا، جو گلی کے دہانے پر یوں کھڑے تھے کہ ان کی پشت پہ گلاطہ تھا۔ ایک خوب صورت جوڑا سیاہ ٹکس پہنے مرد، سفید گاؤن پہنے عورت۔

"میرا مطلب ہے آپ اسے کینیڈا سے ساتھ لائی ہیں؟"

اس نے چہرہ موڑ کے اسی سادگی سے سنبل کو دیکھا۔

"میں سفر میں اس کو ساتھ ہی رکھتی ہوں۔"

"نہیں... یعنی آپ کی بہن بھی ہے نا کینیڈا میں تو..."

"اس کے اپنے بھی دو بچے ہیں۔" وہ اب کیمرے کے فریم میں اس کپل کو دیکھ رہی تھی۔ مرد سر جھکائے فون پہ لگا تھا اور ایک میک اپ آرٹسٹ احتیاط سے ایک ننھی پیڈ کی مدد سے لڑکی کے چہرے پر پاؤڈر درست کر رہی تھی۔

"بدر بہت کیوٹ ہے۔ تین سال کا ہو گیا ہے

"ساڑھے تین۔"

"ماشاءاللہ۔" سنبل قریب آ کے کھڑی ہوئی۔ پھر وقفہ دیا۔ ہلکا سا کھنکھاری۔ وہ جانتی تھی یہ اس کی بات کا اختتام نہیں ہے۔

"مگر بولتا نہیں ہے شاید۔"

"اسپیچ ڈی لے" (بولنے میں تاخیر)" وہ کیمرے کی ننھی اسکرین کے چوکھٹے میں اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ دولہا کلائی پر بندھی گھڑی بار بار دیکھتا، اکھڑا اکھڑا لگتا تھا۔ لڑکی چہرہ میک اپ آرٹسٹ کے سامنے سیدھا رکھے، آنکھیں اوپر اٹھائے خاموشی سے گالوں پر پاؤڈر لگوا رہی تھی۔

"آپ نے چیک کروایا؟ شاید آٹزم..."

"آٹزم نہیں ہے۔ اسپیچ ڈے ہے۔" وہ ایک دم تختی سے کہتی آگے بڑھ گئی۔ سنبل نے نہیں دیکھا، لیکن اس کے چہرے کی رنگت گلابی اور گال تمتمائے تھے۔ آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔

("مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔"

چار سال پہلے وہ اس ہسپتال کے کاریڈور میں کھڑی تھی۔ ماہر فرید ابھی ابھی اپنی بہن سے ملا تھا۔ اور اس کو ابھی معلوم ہوا تھا کہ ہلال دیکھ نہیں سکتی۔ وہ ماہی کو ان کے اداس کمرے کے باہر چھوڑ کے ڈاکٹر کے پیچھے آئی تھی۔

"تمہارے شوہر نے تمہارے اندر نارکوٹکس انجیکٹ کیے تھے۔"

"مجھے بے ہوش کرنے کے لیے۔ جانتی ہوں۔"

"اتنی ہائی ڈوز کے بعد ہوسکتا ہے تمہارے بچے پر اس کا اثر پڑے۔ کسی قسم کی ایب نارمیلٹی آسکتی ہے۔" اس نے توقف کیا۔ "تم اب بھی اس بچے کو اباٹ..."

"نہیں۔ میرا بچہ ٹھیک ہوگا۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے گیلا تھوک نگلا تھا۔)

(بدر ٹھیک ہوگا۔) اس نے گلاطہ ٹاور کو دیکھتے ہوئے دہرایا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔

(میں نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ میں نے بدر کو خطرے میں نہیں ڈالا تھا۔ جو کیا زیاد نے کیا۔ بدر ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ بولنے لگے گا۔ وہ بولنے لگے گا۔ وہ بولنے لگے گا۔)

دولہا اب اپنی دلہن کے قریب آ کے کچھ کہنے لگا تھا۔ ناگوار تاثرات۔ اکھڑی اکھڑی آوازیں۔

"کیا خیال ہے، ان کی طلاق کتنے دن میں ہوگی؟" قریب کھڑی سنبل نے بےزاری سے تبصرہ کیا۔

"ایسے نہیں کہتے۔" اس نے خفگی سے اسے دیکھا۔ سنبل ایک لوکل فوٹوگرافر تھی جس کے ساتھ وہ اکثر استنبول میں کولیب کرتی تھی۔

"ہم پہلی دفعہ ساتھ کام نہیں کر رہے مالا۔" وہ اکتائی ہوئی تھی۔ "ہر دوسرے کپل کی البم پرنٹ ہونے سے پہلے طلاق ہو جاتی ہے۔"

"تم البم دینے میں دیر کر دیتی ہو گی۔" وہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑی تھیں اور کافی فاصلے پر وہ موم کے مجسموں جیسا جوڑا اب کسی بات پہ بحث کر رہا تھا۔

"البم تیار کرنے میں تین چار ماہ تو لگ ہی جاتے ہیں۔ ان کو ہی طلاق کی جلدی ہوتی ہے۔" پھر سنبل نے چہرہ گھما کے اسے دیکھا۔ ایک سوچ آنکھوں میں اُمڈ آئی۔

"آپ کپل شوٹ کیوں کر رہی ہیں؟ آپ تو الوژنسٹ ہیں نا۔ ان کو تو کوئی الوژن نہیں چاہیے تھا۔"

"لیکن مجھے پیسے چاہئیں۔ جانتی ہو کینیڈا میں ایک سنگل مدر کے لیے بچے کو پالنا کتنا مشکل...." چہرہ گھما کے بدر کی میز کو دیکھا۔ الفاظ ٹوٹ گئے۔

بدر میز پر نہیں تھا۔

مالا نے چونک کر دائیں بائیں دیکھا۔

بدر وہاں کہیں بھی نہیں تھا۔ میز پر کلرنگ بک کھلی تھی اور سرخ کریون پتھریلی سڑک پر گرا تھا۔

پیروں پہ دائیں بائیں گھومی۔ آسمان بھی ساتھ ہی گھوما۔

"بدر!" اس نے خود کو چلاتے سنا۔ ساری آوازیں خاموش ہوگئی تھیں۔ ساری خوشبوئیں دم توڑ گئی تھیں۔

"بدر...." اس کے قدم بھاگتے ہوئے اٹھ رہے تھے۔ کیمرہ گردن میں اسٹریپ سے جھول گیا۔ وہ اب دکان داروں سے، راہ چلتے لوگوں سے، بدحواسی سے پوچھ رہی تھی۔ "میرا بیٹا.... چھوٹا سا...." وہ ہاتھ کے اشارے سے اس کا قد بتا رہی تھی۔ چہرہ سفید اور خوف سے بھری آنکھوں میں پانی تھا۔

وہ خوف جو ساڑھے تین برس سے کسی آسیب کی طرح اس کا پیچھا کرتا رہا تھا۔

وہ خوف حقیقت بن چکا تھا۔

کوئی اس کے بدر کو لے گیا تھا۔

کوئی اس کے بیٹے کو....

"مالا! یہ ہے بدر۔" سنبل کسی سمت سے چلائی تھی۔ وہ چونک کے اس طرف مڑی۔ اور پھر ڈھیر سارے آنسو آنکھوں سے بہہ نکلے۔

وہ گلی کے موڑ پر کھڑا تھا۔ سنبل اس کو کندھوں سے تھامے مالا کو آواز دے رہی تھی۔ وہ گیلے چہرے اور دوڑتے قدموں سے اس تک آئی۔

"اف بدر! تم کہاں تھے؟" پنجوں کے بل نیچے بیٹھے اس نے زور سے اسے بھینچ کے گلے سے لگالیا۔

"تم ایسے کہاں چلے گئے تھے؟"

سانس ابھی تک تیز تھی اور دل بے قابو۔ مالا نے اسے خود سے الگ کیا اور گیلی خفا آنکھوں سے بدر کو دیکھتے ہوئے کچھ کہنے لگی لیکن.... پھر وہ ٹھہر گئی۔

بدر کے ہاتھ میں ایک اسٹک تھی جس پر نیلی روئی کے گال جیسی کاٹن کینڈی تھی۔ وہ اس کو دانتوں سے کتر رہا تھا اور وہ اس کے منہ میں گھل کے غائب ہو رہی تھی۔

"یہ تم نے کہاں سے لی؟" وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ آنکھیں ہتھیلی کی پشت سے پونچھیں۔ دائیں

... تھے۔ بہت سے لوگوں کی صبح ہو چکی تھی۔

"بدر، یہ تمہیں کس نے دی؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔ ذہن میں کہیں ایک الارم بجنے لگا تھا۔

"یہاں کوئی 'کاٹن کینڈی مین' ہے تو نہیں۔" سنبل نے حیرت سے دائیں بائیں دیکھا۔

بدر چونکا۔ گردن اٹھا کے سنبل کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ وہ غور سے اپنے بیٹے کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کاٹن کینڈی مین؟ اس نے دیا یہ تمہیں؟" بدر کی سبز آنکھیں مالا کے چہرے تک گئیں۔ پھر اس نے گردن ہاں میں ہلائی۔

"کون تھا وہ؟ کیا ہم اسے جانتے ہیں؟" وہ اب دانت سے میٹھی روئی کتر رہا تھا۔

"بدر، ہم اسٹرینجرز سے کچھ لے کر نہیں کھاتے۔" اس نے اسٹک بدر سے لینی چاہی، لیکن اس نے اسے سختی سے پیچھے کرلیا۔ آنکھوں میں خفگی در آئی۔ مالا نے گہری سانس لی۔ پھر اس کی انگلی تھام کے آگے بڑھنے لگی۔ اب اسے تمام شوٹ اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھنا تھا۔ دو دن بعد اس کی کینیڈا واپسی تھی۔ وہ تب تک بدر کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دے گی۔

"البتہ....." اس نے پلٹ کے گلی میں آتے جاتے انجان لوگوں کو دیکھا۔

وہ احساس پھر سے واپس آگیا تھا۔

کوئی تھا جو اسے دیکھ رہا تھا۔

بہت برسوں بعد۔

گھڑیال نے گھنٹے کی سوئی آگے بڑھائی۔ ٹن کی آواز آئی۔ وہ چونکی۔ وہ ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھی تھی، اور وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔

کیا وہ آئے گا؟

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

قربت بھی نہیں دل سے اتر بھی نہیں جاتا
وہ شخص کوئی فیصلہ کر بھی نہیں جاتا

آنکھیں ہیں کہ خالی نہیں رہتی ہیں لہو سے
اور زخم جدائی ہے کہ بھر بھی نہیں جاتا

وہ راحت جاں ہے مگر اس در بدری میں
ایسا ہے کہ اب دھیان ادھر بھی نہیں جاتا

ہم دوہری اذیت کے گرفتار مسافر
پاؤں بھی ہیں شل، شوق سفر بھی نہیں جاتا

دل کو تری چاہت پہ بھروسا بھی بہت ہے
اور تجھ سے بچھڑ جانے کا ڈر بھی نہیں جاتا

پاگل ہوئے جاتے ہو فراز اس سے ملے کیا
اتنی سی خوشی سے کوئی مر بھی نہیں جاتا

احمد فراز

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوک سوزن سے نکالے ہیں

پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

رلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا نرالے میرے نالے ہیں

نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

نہیں بیگانگی اچھی رفیق راہ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

امید حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ درد انگیز نالے ہیں

علامہ اقبال

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

نادیہ یاسر ـــــــــ گوجر خان

نئے ملال کا سامان کرنے نکلے ہیں
ہم اپنے آپ کو ہلکان کرنے نکلے ہیں
اسی کی وعدہ فراموشیوں نے دل توڑا
اسی سے اک نیا پیمان کرنے نکلے ہیں

سحر کاہل ـــــــــ کراچی

ترے خیال کی لو تب سے جب اترتی ہے
بڑی خموشی سے آنگن میں شب اترتی ہے
تمہارا ساتھ تسلسل سے چاہیے مجھ کو
تھکن زمانوں کی لمحوں میں کب اترتی ہے

توبیہ ـــــــــ کراچی

چند لمحوں کا ہوا کرتا ہے خوابوں کا سفر
آنکھ کھلتی ہے تو صدیوں کی تھکن ہوتی ہے

ندا طارق ـــــــــ فیصل آباد

میرا ایمان ہی راضی بہ رضا رہتا ہے
ورنہ ایسی بھی نہیں بات کہ پتھر ہوں میں
ایک جھونکا جو مجھے چھو کے کبھی گزرا تھا
آج تک اس کے تواتر سے معطر ہوں میں

صبا سلیم ـــــــــ کراچی

لبوں پہ حرف نہ سوال رکھتا تھا
کبھی میں ضبط میں اتنا خیال رکھتا تھا
سنا ہے لوگ اب اسے بہت ستاتے ہیں
جس اک شخص کا میں بہت خیال رکھتا تھا

ارم ذوالفقار ـــــــــ راولپنڈی

یہ مشاہدہ نہیں ہے، مرے درد کی صدا ہے
مرے داغِ دل جلے ہیں، تیری بزم جب سجی ہے

لائبہ، ایمن ـــــــــ آزاد کشمیر

اب تو خود اپنی ضرورت بھی نہیں ہے ہم کو
وہ بھی دن تھے کہ کبھی تیری ضرورت ہم تھے

صدف عمران ـــــــــ کراچی

بارش کی طلب ہے تو سمندر کی طرف جا
یہ ابر تو صحراؤں میں برسا نہیں کرتے
پچھتاوے سے بڑھ کر کوئی آزار نہیں لیکن
جب دل لگاتے ہیں تو رویا نہیں کرتے

اقرا انس ـــــــــ گرین سٹی

دل چاہے میں سب کچھ کہہ دوں
اپنے آپ سے الجھتی ہوا
ہم نے سنا ہے اب لوگوں سے
تم ابھی محبت کرتے ہو!

حبیبہ، اریبہ ـــــــــ مظفر آباد آزاد کشمیر

آواز میں ٹھہراؤ تھا، آنکھوں میں نمی تھی
اور کہہ رہا تھا میں نے سب کچھ بھلا دیا

فاکہہ سہیل ـــــــــ کراچی

اب تو ہر ہاتھ کا پتھر ہمیں پہچانتا ہے
عمر گزری ہے تیرے شہر میں آتے جاتے

نمرہ، نایاب سندھو ـــــــــ گوجرہ

تو جو آئے تو اسے مل کے سمیٹیں دونوں
مجھ اکیلے سے کہاں ہجر سنبھالا جائے

حبیبہ خان ـــــــــ کراچی

زندگی کا ہی نہیں ٹھور ٹھکانا معلوم
موت تو طے ہے مگر کس وقت کہاں آنی ہے
کیوں ستارے ہیں کہیں اور کہیں آنسو ہیں
آنکھ والوں نے بھی ذرہ نہیں جانی ہے

آسیہ جاوید ـــــــــ علی پور چٹھہ

اس سمت سمیٹوں تو بکھرتا ہے ادھر سے
دکھ دیتے ہوئے یار نے دامن نہیں دیکھا

شگفتہ جاہ

رنگا رنگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ام المومنین حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک لونڈی آزاد کردی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت نہیں لی۔

چنانچہ جب وہ دن ہوا جو ان کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کا دن تھا۔ (اور آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے) تو انہوں نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ نے محسوس کیا کہ میں نے اپنی لونڈی آزاد کردی ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کیا (واقعی) تو نے ایسا کیا ہے؟ انہوں نے "ہاں!"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اگر تو اپنے ماموں کو دے دیتی تو تیرے لیے زیادہ اجر کا باعث ہوتا۔"

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ عورت کو اپنی مملوکہ چیز میں خاوند کی اجازت کے بغیر تصرف کرنے کا حق حاصل ہے جبکہ خاوند کی زیر ملکیت چیزوں میں اسے یہ حق نہیں۔

2۔ ضرورت مند رشتہ دار پر صدقہ کرنا غلام آزاد کرنے سے بھی زیادہ فضیلت والا عمل ہے کیونکہ آزادی صرف صدقہ ہے جبکہ قرابت دار کو صدقہ دینے میں صدقے کے ثواب کے ساتھ صلہ رحمی کا ثواب بھی ملے گا۔

سقراط کی آتش فشاں بیوی زینتھپی

کس نے توقع کی ہوگی کہ دنیا کو تہذیب، دانائی اور الفاظ کی طاقت سے واقف کروانے والا فلسفی سقراط اپنی بیوی کی چیخ وپکار، جہالت اور بے چینی کے بیچ گھرا رہتا تھا۔

اس عورت کی زبان بہت تیز طرار اور کاٹ کھانے والی تھی جس کی وجہ سے اس کا شوہر سقراط ہر روز سحر کے وقت گھر سے باہر نکل جاتا اور غروب آفتاب کے بعد دوبارہ گھر واپس آتا تھا۔ یعنی اس کا اپنی بیوی سے سامنا ہی نہ ہوتا تھا۔ پھر بھی سقراط اس کے بارے میں لکھتا ہے۔

"میں اس عورت کا مقروض ہوں، اگر وہ نہ ہوتی تو میں کبھی یہ نہ جان پاتا کہ حکمت خاموش رہنے میں ہے اور خوشی کا راز سو جانے میں پوشیدہ ہے۔"

وہ یہ بھی کہتا ہے: مجھے تین آفات سے دوچار ہونا پڑا۔

زبان، غربت اور میری بیوی، زبان پر میں اپنی محنت سے غالب آیا۔ غربت پر میں معاشی منصوبہ بندی سے غالب آیا۔ تیسری آفت بیوی ہے جس پر میں کبھی غالب نہ آسکا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے...... جب وہ اپنے شاگروں کے ساتھ بیٹھا حکمت و دانائی کی باتیں بیان کر رہا تھا کہ اس کی بیوی نے حسب عادت اونچی آواز میں اس کے شاگردوں کے سامنے ہی سقراط کو لعن طعن اور ملامت کرنا شروع کردیا لیکن اس بار وہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ اس پر پانی بھی برسا تو اس نے پانی پونچھتے ہوئے حیرت زدہ چہرہ کے ساتھ شاگردوں سے کہا:

"ہمیں توقع رکھنی چاہئے کہ اگر گرج چمک ہو رہی ہے تو ضرور اس کے بعد بارش بھی برسے گی۔"

اس بدتمیزی کے بعد سقراط کو اس قدر پرسکون،

مطمئن اور خاموش دیکھ کر اس کی بیوی کو ہارٹ اٹیک ہو گیا اور اس کی موت واقع ہو گئی۔

جی ہاں، آپ نے صحیح سنا، سقراط کی بیوی اس کے ساتھ جھگڑا کرتے ہوئے مر گئی۔ اس کا شوہر خاموش مزاج، ٹھنڈی طبیعت اور ذہنی سکون کا حامل تھا۔ لیکن اس کی بیوی آتش فشاں کی طرح تھی۔ جس کی وجہ سے اس کو دل اور کندھے میں شدید درد ہوا اور اس رات وہ انتقال کر گئی۔

ناراضی

میٹرنٹی وارڈ کے باہر ایک صاحب بےتابی سے ٹہل رہے تھے اور سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہے تھے۔ آخر لیڈی ڈاکٹر باہر آئی اور ان صاحب کو بتایا۔

"آپ ایک خوب صورت اور صحت مند بچے کے باپ بن گئے ہیں۔"

ان صاحب نے گہری سانس لے کر شکریہ ادا کیا اور وہاں سے رخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر نے انہیں واپس بلایا اور حیرت سے بولی۔

"کیا آپ خوشی کے اس موقع پر اپنی بیوی سے دو چار باتیں نہیں کریں گے؟"

"جی نہیں......" وہ صاحب رکھائی سے بولے "پچھلے دو سال سے اپنی بیوی سے میری بول چال بند ہے۔"

"بول چال بند ہے اور آپ بچے کے باپ بن گئے۔" لیڈی ڈاکٹر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

وہ صاحب برا سامنہ بنا کر بولے۔ "اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟ اب اتنی بھی ناراضی نہیں ہے۔"

اقوال زریں

☆ اچھی بات تو سب کو اچھی لگتی ہے جب تمہیں کسی کی بری بات بھی بری نہ لگے تو سمجھ لینا تمہیں اس سے محبت ہے۔

(اشفاق احمد)

☆ تمہاری اصل ہستی تمہاری سوچ ہے، باقی تو صرف ہڈیاں اور گوشت ہے۔"

(مولانا جلال الدین رومی)

☆ اس سے تو خاموشی بہتر ہے، کسی کو دل کی بات کہہ کر پھر اس سے یہ کہا جائے کسی سے نہ کہنا۔

(شیخ سعدی)

☆ جو قومیں اپنے اساتذہ کا احترام نہیں کرتیں، تعلیم سے دور ہی رہتی ہیں۔

لفٹ

ایک شخص نے لفٹ لینے کے لیے ایک گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی اس کے قریب آ کر آہستہ ہو گئی۔ وہ شخص جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا لیکن ڈرائیونگ سیٹ خالی دیکھ کر اس آدمی کا دم خشک ہو گیا۔

کچھ دیر بعد گاڑی ایک پٹرول پمپ پر رکی ایک پسینے میں ڈوبے شخص نے پٹرول ڈلوایا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ لفٹ لینے والا شخص بھی آواز میں بولا۔

"آپ اس سیٹ پر کیوں بیٹھ گئے۔ اس گاڑی کو جن چلا رہے ہیں۔"

"اتنی دور سے اس گاڑی کو میں دھکا دیتا آ رہا ہوں اور آپ فرما رہے ہیں کہ جن چلا رہے ہیں۔" اس شخص نے جھلا کے جواب دیا۔

اردو زبان

☆ 1780 میں پہلی بار شاعر غلام ہمدانی مصحفی نے لفظ اردو کا استعمال کیا۔

☆ 1837 میں اردو کو انگریزی زبان کے ساتھ سرکاری درجہ حاصل ہوا۔

☆ تیرھویں سے اٹھارھویں صدی تک اردو زبان کو ہندوستانی، دہلوی، لشکری، لاہوری ناموں سے بھی پکارا جاتا تھا۔

☆ تیرھویں صدی میں امیر خسرو کی شاعری میں اردو زبان کی جھلک "چھاپ تلک سب چھین لی موسے نیناں ملائے کے" اور "سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں" میں نظر آتی ہے۔ اس وقت یہ ہندی زبان کہلاتی تھی۔

☆ بھارتی ریاستوں میں اور نیپال میں بھی اردو ایک کو ایک علاقائی زبان کے درجے کی اہمیت حاصل ہے۔

☆

امت الصبور

خواتین کی ڈائری

حمدہ خان کی ڈائری سے

امجد اسلام امجد کی شاعری پڑھو تو یوں لگتا ہے جیسے شاعر نے ہمارے دل کی بات کہہ دی ہو، عام روز مرہ کی باتیں، تجربے جن سے ہر شخص کبھی نہ کبھی گزرتا ہے امجد انہیں بڑی خوبی سے بیان کرتے ہیں۔
کی یہ غزل پڑھیے اور خط لکھ کر بتایے گا کہ آپ کے ساتھ بھی یہ ہوا ہے کہ آپ کی بات بیچ میں رہ گئی۔

تیرے اردگرد وہ شور تھا، میری بات بیچ میں رہ گئی
نہ میں کہہ سکا نہ تو سن سکا، میری بات بیچ میں رہ گئی

میرے دل کو درد سے بھر گیا، مجھے بے یقین سا کر گیا
تیرا بات بات پہ ٹوکنا، میری بات بیچ میں رہ گئی

تیرے شہر میں میرے ہم سفر، وہ دکھوں کا جم غفیر تھا
مجھے راستہ نہیں مل سکا، میری بات بیچ میں رہ گئی

وہ جو خواب تھے میرے سامنے، وہ سراب تھے میرے سامنے
میں ان ہی میں ایسے الجھ گیا، میری بات بیچ میں رہ گئی

عجب ایک چپ سی لگی مجھے، اس ایک پل کے حصار میں
ہوا جس گھڑی تیرا سامنا، میری بات بیچ میں رہ گئی

کہیں بے کنار تھیں خواہشیں، کہیں بے شمار تھیں الجھنیں
کہیں آنسوؤں کا ہجوم تھا، میری بات بیچ میں رہ گئی

تیری کھڑکیوں پہ جھکے ہوئے، کئی پھول تھے ہمیں دیکھتے
تیری چھت پہ چاند ٹھہر گیا، میری بات بیچ میں رہ گئی

میری زندگی میں جو لوگ تھے، میرے آس پاس سے اٹھ گئے
میں تو رہ گیا انہیں روکتا، میری بات بیچ میں رہ گئی

تیری بے رخی کے حصار میں، غم زندگی کے فشار میں
میرا سارا وقت نکل گیا، میری بات بیچ میں رہ گئی

مجھے وہم تھا تیرے سامنے، نہیں کھل سکے گی زباں مری
سو حقیقتاً بھی وہی ہوا، میری بات بیچ میں رہ گئی

سحر سہیل کی ڈائری سے

پروین شاکر کی یہ غزل میری ڈائری میں محفوظ ہے۔ متعدد بار پڑھی ہے جب بھی پڑھتی ہوں اچھی لگتی ہے۔ آپ بھی پڑھیے۔

کبھی رک گئے، کبھی چل دیے، کبھی چلتے چلتے تھک گئے
یونہی عمر ساری گزار دی، یونہی زندگی کے ستم سہے

کبھی نیند میں، کبھی ہوش میں تو جہاں ملا، تجھے دیکھ کر
نہ نظر ملی نہ زباں ہلی، یونہی سر جھکا کے گزر گئے

کبھی زلف پر، کبھی چشم پر، کبھی تیرے حسین وجود پر
جو پسند تھے میری کتاب میں، وہ شعر سارے بکھر گئے

مجھے یاد ہے، کبھی ہم ایک تھے، مگر آج ہیں جدا جدا
وہ جدا ہوئے تو سنور گئے، ہم جدا ہوئے تو بکھر گئے

کبھی عرش پر، کبھی فرش پر، کبھی ان کے در کبھی در بدر
غم عاشقی تیرا شکریہ، ہم کہاں کہاں سے گزر گئے

کبھی رک گئے، کبھی چل دیے، کبھی چلتے چلتے بھٹک گئے
یونہی عمر ساری گزار دی، یونہی زندگی کے ستم سہے

روحیلہ خان کی ڈائری سے

محسن نقوی کی یہ غزل پڑھیے، آپ کو پسند آئے گی۔

اداسیوں کا یہ موسم بدل بھی سکتا تھا
وہ چاہتا تو میرے ساتھ چل بھی سکتا تھا

وہ شخص جسے چھوڑنے میں تو نے جلدی کی
تیرے مزاج کے سانچے میں ڈھل بھی سکتا تھا

وہ جلد باز خفا ہو کے چل دیا ورنہ
تنازعات کا کچھ حل نکل بھی سکتا تھا

انا نے ہاتھ اٹھانے نہیں دیے ورنہ
میری دعا سے وہ پتھر پگھل بھی سکتا تھا

تمام عمر تیرا منتظر رہا محسن
یہ اور بات کہ رستہ بدل بھی سکتا تھا

بقیہ سروے

آج کی اور بچپن کی عیدوں میں یہ فرق محسوس ہوتا ہے پہلے دوسرے ہماری تیاری کرتے تھے۔ ہمیں تو ہر چیز تیار ملتی تھی، چاند رات کو مہندی لگوانا ،بار بار اپنے کپڑے ،سینڈل جیولری دیکھنا اور خوش ہونا صبح عیدی ملے گی۔صبح مٹھائی کیک سویاں کھائیں گے۔عیدی کے ملے پیسوں سے کولڈ ڈرنک شاپ کے باہر لگے میز کرسی پر بیٹھ کر آئس کریم کھانا، کولڈ ڈرنک پینا اور اپنی مرضی سے گھومنا پھرنا یہ ہماری سب سے بڑی عیاشی ہوتی تھی۔شاید پورا سال وہی دن ہماری آزادی کے ہوتے تھے۔ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھومنا پھرنا ایک دوسرے کے گھر جانا۔آپی بہت یاد آتے ہیں وہ دن۔

اب اپنے بچوں ،گھر شوہر کی تیاری خود کر کے رکھنی پڑتی ہے۔مہندی لگوانے کا تو ٹائم ہی نہیں ملتا چاند رات کو۔ مجھے مہندی چوڑیوں کا شروع سے ہی شوق ہے۔کوئی موقع ہو تو ضرور پہنتی ہوں۔مہندی چاہے لگوانے کا ٹائم نہ ملے میرے فریج میں ہر وقت رہتی ہے۔ پہلے عیدی لیتے تھے اب عیدی دیتے ہیں۔ بچپن کی عیدیں بھی انجوائے کیں اور اب بھی عیدیں انجوائے کرتے ہیں۔ہاں جانے والوں کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔مگر عید اللہ کا انعام ہے تو ناشکری نہیں کرتی۔ عید کا دن بھرپور اور ہنسی خوشی گزارتی ہوں۔

3۔خواتین ڈائجسٹ سے متعارف مجھے میری بیسٹ فرینڈ (عزیز دوست) "نورین بیگ" نے کروایا۔ ہم 9th ،میٹرک میں تھے۔جب نورین چھپا کر ڈائجسٹ لے آتی۔ بریک میں سب دوستیں مل کر پڑھتیں نورین کی امی (اسٹیپ مدر ہیں) مگر ایسا خیال رکھتی ہیں سب اولاد کا کوئی سگی ماں بھی کیا رکھتی ہے۔انہوں نے ہی اپنی بیٹیوں کو ڈائجسٹ پڑھنے کی عادت ڈالی۔نورین کی امی آج تک پڑھتی ہیں پہلے ہم پرانے شمارے پڑھتے تھے پھر 2000 سے میں نے نئے شمارے لینے شروع کیے۔خواتین ڈائجسٹ کی پہلی کہانی ہم نے "روشنی اور باری" کی پڑھی۔ ناول کا نام یاد نہیں آرہا، پھر "طائرلاہوتی" اور "دل پھولوں کی بستی" نے ایسا اپنے حصار میں لیا جو آج تک خواتین شعاع سے رابطہ نہیں ٹوٹا۔شعاع سے ہم "پیر کامل" سے وابستہ ہوئے۔نورین کی امی مجھے ڈائجسٹ نہیں خریدنے دیتی تھیں۔جب میرے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔وہ کہتیں میں لیتی تو ہوں کبھی وہ پہلے مجھے بھجوادیتیں کہ پہلے تم پڑھ لو کبھی پڑھ کر بھجوادیتیں اور ہم پھر مل کر ڈائجسٹ پر تبصرہ کرتے ۔نورین کہتی میری امی تو مجھ سے زیادہ تمہاری دوست لگتی ہیں۔ بہت اچھا وقت ساتھ گزارا۔ اب کچھ عرصے سے ملنا نہیں ہوا ہاں فون پر رابطہ رہتا ہے۔

3۔وقت کے ساتھ زندگی میں بہت تبدیلیاں آئیں ۔والدین کا اور کچھ لوگوں کا ساتھ چھوٹا، کچھ نئے لوگ زندگی میں شامل ہوئے، کبھی کچھ تو کبھی کچھ، کتنی خزائیں بہاریں آئیں گئیں، مگر جب خواتین،شعاع کے ساتھ جڑے تو آج تک جڑے ہوئے ہیں۔آج تک خواتین،شعاع کا ساتھ نہیں چھوٹا۔ کبھی دکھ میں ہوئے تو کسی ہمدرد کی طرح ہمارے زخموں پر مرہم رکھا،کبھی حوصلہ ہارا تو ہمارا حوصلہ بڑھایا، ہماری خوشیوں کو دوبالا کیا۔غرض ہر تبدیلی میں خواتین ڈائجسٹ اور شعاع ہمارے ساتھ رہا۔

4۔کبھی ایسا ہوا؟۔اکثر ایسا ہو جاتا ہے اس لیے اب میں کوشش کرتی ہوں،خواتین ڈائجسٹ یا شعاع رات میں ہی پڑھوں،سب کاموں سے فارغ ہو کر، شادی سے پہلے تو دو دن میں پورا شمارہ پڑھ لیتی تھی۔ ذرا سا ٹائم ملا اور لے کر بیٹھ گئی، کچن میں کام کرتے ہوئے ،بھری دوپہر میں چھت پر بیٹھے ہوئے ،اسٹور میں چھپ کر پڑھتے ہوئے، امی سے ڈانٹ بھی بہت کھائی۔ (مگر بعد میں جب امی نے دیکھا یہ اور کرن سارے کام وقت پر کر لیتی ہیں،کوئی شکایت کا موقع نہیں دیتیں تو امی خود لا کر دیتی تو ہم نام لکھ کر

دے دیتے تھے۔) اور یہ تبدیلی "میری ذات ذرہ بے نشان" ڈرامہ دیکھ کر امی میں آگئی تھی جب میں نے بتایا امی یہ ہم نے ڈائجسٹ میں پڑھا ہے۔

بہر حال اب تو بچوں کے سونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بہت مرتبہ ایسا ہوا، شام میں پڑھتے ہوئے سالن جل گیا۔ دودھ چولہے پر رکھ کر بھول گئی۔ جب دھواں اٹھا تب پتا چلا، ایک مرتبہ نل کھول کر ٹب لگا کر بھول گئی۔ پوری ٹنکی خالی ہو گئی (جبکہ پانی کی تنگی کے دنوں میں پانی کی ٹنکی ڈلوائی تھی) سوچیں میرا کیا حال ہوا ہوگا۔

اب تو جس دن یہ مجھے ڈائجسٹ لا کر دیتے ہیں، کہتے ہیں آج کھانا نہیں پکانا میں بازار سے لے آؤں گا جلا بھنا کھانے سے بہتر ہے بندہ باہر سے لے آئے۔ (ہی، ہی، ہی میری تو موج ہی ہو جاتی ہے)۔

5۔ ابھی تو کوئی نام ذہن میں نہیں آرہا، بہت ساری کہانیاں ایسی پڑھی ہیں جس میں اپنے اور گھر والوں کی جھلک نظر آئی۔ ہاں "ایمان، امید اور محبت" میں امید کا اپنے والد کے ساتھ جو ریلیشن تھا میری بھی اپنے والد سے ایسی ہی انڈر اسٹینڈنگ مینٹ تھی۔ (امی تو مجھے سوتیلی ماں لگتی تھیں) اپنے والد کی بیماری سے لے کر ان کی وفات تک میں نے ان کی چار پائی نہیں چھوڑی۔ وہ بھی مجھے اسی طرح سمجھاتے تھے۔ کوئی بھی مذہب سے قریب ایثار پسند کردار مجھے اپنے سے قریب لگتا ہے اور وہ کہانیاں جس میں بڑے بڑے خاندان مطلب بہت سارے افراد ہوں اپنی فیملی سے قریب لگتے ہیں۔

ایسی کہانیاں جس میں بہت سارے افراد، بھائی بہنیں، خالہ، ماموں، پھپھو، چاچا، تایا غرضیکہ ہر رشتہ ہو۔ مجھے اپنے گھر والوں کے قریب لگتا ہے۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ نادرہ آپی میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ کچھ اپنوں کی دعائیں، کچھ ان کی محنت، کچھ میرے بچوں کی محبت نے مجھے پھر سے کھڑا کر دیا۔ الحمدللہ ورنہ تو میں زندگی سے مایوس ہو چلی تھی۔ دوائیاں تو چل ہی رہی ہیں بس اب یہی دعا ہے اللہ تعالیٰ جلد سے جلد ان دوائیوں سے بھی چھٹکارا دلا دے۔

سعدیہ مصطفیٰ ...... گاؤں مڑھ بھنگوال

1۔ بلاشبہ ایسا ہی ہے چاند رات کو بڑی ایکسائٹمنٹ ہوتی ہے پتا نہیں رات کو چاند نظر آتا ہے کہ نہیں کل عید ہوگی کہ نہیں، شام کو ہی میں تو چھت پر چلی جاتی ہوں چاند دیکھنے کی نیت سے۔ کان تو میرے چھت کی دائیں جانب رہتے ہیں کہ امام مسجد صاحب کیا اعلان کریں گے۔ جب بالآخر عید کا چاند نظر آئے تو دعا مانگ کر جو بھی سامنے آئے اسے عید مبارک، چاند رات مبارک کہنا ہوتا ہے۔ امی جان کی دعائیں لینا ہوتی ہیں پھر بھئی آس پاس کے سارے اسٹریٹ کے چھوٹے کیا بڑے کیا سارے بچے ٹیچر جی، آپی جی مہندی لگا دیں۔

2۔ آج کی عید بھی الحمدللہ ایسی ہی گزرتی ہے جیسے بچپن میں گزرتی تھی یہ الگ بات ہے۔ وہ دوست، وہ گلیاں وہ چیزیں وہ اب ویسی نہیں رہیں، لیکن پھر کیا ہوا۔ تبدیلی تو اچھی بات ہے۔ زندگی کے ہر لمحہ کو انجوائے کرنا، خوش رہیے۔ خوشیاں بانٹیے اور اللہ کا شکر ادا کیجیے۔

3۔ آج بھی میری سوچ بہت لبرل ہے۔

"خواتین" بلاشبہ رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اس رہنمائی کو ہم کس طرح "سمجھیں سیکھیں" ہیں اس کا انحصار ہم پر کرتا ہے۔ نمرہ احمد کے ناول میں بتایا گیا، سکھایا گیا کہ "زندگی میں قرآن کی کتنی اہمیت ہے۔" اور پہلا ناول میں نے یہ ہی پڑھا تھا۔ "حالم" بتاتا ہے۔ "ماضی کے غموں سے کیسے نکلا جاتا ہے۔" "عمل" نے کیا نہیں سکھایا؟؟ "جنت کے پتے" "حجاب" کی اہمیت بتاتا ہے۔

4۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی ایسا ہوا ہو، میری ذاتی رائے ہے کہ میرے شوق، ہابیز، ترجیحات بھی میری "ذمہ داریوں" میں رکاوٹ نہ بنیں۔ میری

زندگی میں تمام کاموں کے لیے ایک مخصوص وقت ہے، ایک پراپر سی شیڈیول ہے۔

لیکن مجھے اس بات پر بھی سو فیصد یقین ہے کہ اگر میں گھر کے یا جاب کے سارے پلان کو ملتوی کر کے اپنی مرضی سے سارا دن پڑھوں، لکھوں، یا جو بھی کروں، کسی کو اعتراض "نہیں ہوگا۔ لیکن یہ مناسب نہیں لگتا، اچھی لڑکیاں ایسا تھوڑا کرتی ہیں بھلا؟؟

5۔ ماہر فرید کا "لوگوں کے پیچھے نہ بھاگنا، ان کا احسان نہ بھولنا، اس کو خودداری اور لوگوں پر یقین کرنا، اکثر ہی مجھے اپنی جھلک صرف جھلک نظر آتی ہے۔

اور "جنت کے پتے میں" عائشہ گل کا ماحول مجھے ہمیشہ متاثر کرتا ہے۔

"بہرحال بڑی خوشی ہوئی اور دل بھی بڑا خوش ہوا۔ ماشاء اللہ خواتین کو اس کی سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔

فرحانہ مہناز ...... گوجرا

سب سے پہلے تو چاند رات سے کچھ لمحے پہلے ہمارا چاند نظر آجاتا ہے۔ یعنی فراز صاحب عید سے ایک دن پہلے اسلام آباد سے آجاتے ہیں۔ پھر افطاری کرتے ہی بچوں کو لے کر بازار چلے جاتے ہیں۔ جس کی جو چیز رہ گئی وہ لینے اور میں کچن میں گھس جاتی ہوں۔

2۔ وقت بدلا اور روایات تو یوں بدلیں کہ ہم دیکھتے ہی رہ گئے۔ بچپن میں ہم سب کزنز پہلے افطاری کرتے پھر اپنی خوب صورت چھت پر دوڑ لگا دیتے۔ چاند دیکھنے ۔ اب سب اپنے موبائل لے کر کمروں میں گھس جاتے ہیں۔ ہمیں یاد ہے ہمارے ابو، چچا، تایا جان سب سے پہلے دادی جان کو سلام کرتے عید کی مبارک باد دیتے۔ مگر اب بچوں کو بتانا پڑتا ہے جاؤ دادی جان کو سلام کرو۔

البتہ بڑوں کا اپنے چھوٹوں کو عیدی دینا مرد حضرات کا عید کی نماز پڑھ کر سب سے گلے ملنا، میٹھا کھانا سب رشتہ داروں کو فون کرنا، سب سے ملنا ملانا اب بھی ہے۔

3۔ خواتین ڈائجسٹ سے پہلا تعارف 2000ء میں ہوا۔ ان سالوں میں جتنی تبدیلیاں آسکتی تھیں۔ تعلیم کو خیر باد کہا شادی ہوئی، چار بچے، دیور نندوں کی شادیاں ہوئیں گھر میں کمروں کی تعداد بڑھ گئی مگر اسی کمرے میں اسی مخصوص جگہ پر خواتین کا مطالعہ کرتی ہوں۔ شادی سے پہلے ابو جی سے ڈرتے۔ ان کے گھر آنے سے پہلے ہی ڈائجسٹ پڑھ لیتے لیکن منگواتی امی سے تھی۔ اب فراز سے چوری پڑھتی ہوں۔

کافی سال پہلے انہوں نے ڈائجسٹ کی وجہ سے ڈانٹا تھا۔ وہی لہجہ پلو سے باندھ لیا اور کبھی ان کے سامنے ڈائجسٹ کھول کر اپنے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر نہیں پڑھا جیسے مہینے کے پچیس دنوں میں پڑھتی ہوں۔ مہینے کے آخر میں فراز جی اسلام آباد سے آتے ہیں، چار دن کے لیے تو رسالہ ڈرا میں آرام فرماتا ہے۔ ہمارے جیسی عورتوں کے لیے شاید یہ نشہ ہے۔ مگر آج کل چھوڑ رہی ہوں ایک تو نظر بہت کمزور ہو رہی ہے دوسرے خرچ چھوڑیے۔

4۔ کہانی پڑھنے کا انداز ہی ہمارا ایسا ہے خاص کر مکمل ناول پڑھتے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہی ہوتے ہیں۔ ہانڈی تو نہیں جلی، البتہ دودھ ایک دو بار ابلا۔ ہم تو ویسے ہی افسانوی دنیا میں رہتے ہیں اس لیے چائے میں انڈا اور چاولوں میں چائے ڈالنے کا تو کئی بار لکھ چکی ہوں، گھر والوں سے ان بے ضرر رسالوں کی وجہ سے کیا ڈانٹ پڑنی، ہم ایک بار کی بات ہی کہہ جاتے ہیں۔ اب چودہ سال پہلے جب میری ایک ہی بیٹی تھی ہمارے گھر میں گیس کی سہولت نہ تھی میری چچی (ساس) لکڑی والے چولہے پر روٹیاں بنا رہی تھیں۔ میں پاس بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک فراز کمرے سے باہر آئے اور ہمارا پیارا رسالہ چولہے میں جھونک کر باہر چلے گئے۔ شاید ان کا کوئی کام مس ہو گیا تھا۔ مجھ سے۔ میری ساسو ماں نے بڑی احتیاط سے نکالا، نکالتے ہوئے (تین چار صفحات جل گئے) اور مجھے پکڑا دیا۔ پڑھ تو میں نے سارا لیا تھا۔ میں نے بھی غصے سے پھینکا اور کمرے میں چلی گئی۔

اس کے بعد کبھی ان کے سامنے نہیں پڑھا، جب میرا

موڈ خراب ہو تو میرا بیٹا عبدالمتین رسالہ کھول کر میرے سامنے رکھ دیتا ہے تو میرا غصہ ایک دم بھاگ جاتا ہے اور میری ہنسی نکل جاتی ہے۔

5۔ مادام، کوئی ایک کہانی ہو تو نام بھی بتائیں ساری کہانیاں چاہے وہ افسانہ ہی کیوں نہ ہو مجھے اپنے آس پاس کے رشتہ داروں اور دوستوں حتیٰ کہ اپنی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ کہانی پڑھتے ہوئے بھی کوئی تو کبھی کوئی میرے ذہن میں ہوتا ہے۔ سنجیدہ، سوبر، ڈیسنٹ سے ہیرو میں اپنے فراز صاحب کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہر بات کو صبر سے برداشت کرنے میں امی جان کی جھلک نظر آتی ہے۔ حتیٰ جھلک میں بھی کئی ہیں مگر وہ صفحہ قرطاس پر نہیں اتاروں گی باقی ہم — خوب صورت، معصوم شکل، چلبلی سی ہیروئن میں اپنی جھلک نظر آتی ہے میرے خیال میں کچھ زیادہ ہی ہو گیا (اپنے لیے) اس لیے اب اجازت چاہتی ہوں۔

عینا عمر خان...... کراچی

زبیر صاحب نے خط لے کر جانے سے صاف انکار کر دیا ان کو کیسے راضی کیا یہ ایک الگ کہانی ہے اصل میں بیروے میں، میں صرف ایک سوال کی وجہ سے لکھنا چاہتی تھی (کبھی کوئی کہانی پڑھنا شروع کی اور دنیا سے بے خبر ہو گئی اور کچھ جل گیا) اس سوال کا جواب پڑھ کر آپ کو اچھا لگے گا اس لیے زبیر کی منتیں کر کے راضی کیا اب پڑھیں سارے جواب۔

1۔ آپ کو یہ پڑھ کر حیرت ہوگی۔ چاند رات میرے لیے سر کا درد ہوتی ہے چاند رات بھی اور عید کا آدھا دن بھی۔ رمضان شروع ہوتے ہی مجھے چاند رات اور عید کے دن کی ٹینشن شروع ہو جاتی ہے وجہ وہ بم ہیں جو ہماری گلی میں پھوڑے جاتے ہیں چاند دیکھتے ہی جو بم پھٹتے ہیں اللہ کی پناہ۔ سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔

"کس کے والد کی شادی ہے جو بم پھاڑ رہے ہو؟ میں کھڑکی سے جھانک کر غصے سے پوچھتی ہوں آگے سے وہ ڈھیٹ ہنس کر ایک دوسرے کی طرف اشارے کرتے ہیں۔

خیر چاند رات کو میری تیاری کچھ خاص نہیں ہوتی۔ بس گھر کی صفائی اور رات کو دو بجے تک کپڑے استری کرنا۔ زمانے ہو گئے۔ میں نے چاند رات کو مہندی نہیں لگائی ہاں حنیفہ (اکلوتی بیٹی) کو ضرور لگواتی ہوں۔

عید کے دن کام ختم کر کے ساس کے گھر چلی جاتی ہوں۔ پورا دن وہیں گزار کے رات کو دیر سے گھر آتے ہیں۔ دوسرے دن امی کے گھر جاتی ہوں اور وہاں رات رکتی ہوں مگر پچھلے دو سالوں سے امی کامرہ میں ہوتی ہیں اس لیے دوسرا دن بھی ساس کے گھر گزرتا ہے۔

2۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ اقدار نہیں بدلیں بلکہ کچھ بھی نہیں بدلا۔ ہم بدل گئے ہیں، وہی عید ہے وہی خوشیاں اور رونقیں ہیں، وہی مسرت اور شادمانی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ جہاں کل ہم تھے وہاں آج ہمارے بچے ہیں۔

کل ہم نانی کے گھر جانے کے لیے خوش ہوتے تھے اور ہماری پھوپھو اور ان کے بچے ہمارے گھر آتے تھے۔ دادی بڑا پتیلا بھر کر چاولوں کا بناتی تھیں امی شیر خورمہ اور میں شاہی ٹکڑے بناتی تھی۔ آج میری ساس بریانی بناتی ہیں، سب ان کے پاس آتے ہیں۔ کل ہم بڑوں سے عیدی لیتے تھے آج ہمارے بچے عیدی لیتے ہیں۔ میں اپنی نند کی بیٹیوں کو دیکھ کر سوچتی ہوں، ان کے معصوم چہروں پر وہی خوشی اور مسرت ہے جو کل ہمارے چہروں پر ہوتی تھی چہرے بدل گئے ہیں احساس اور خوشی وہی ہے وہی پیارے پیارے زرق برق کپڑے ہیں وہی سر پر رنگ برنگے ڈھیر سارے کلپ ہیں وہی ہاتھوں میں چوڑیاں اور مہندی ہے، وہی کندھے سے لٹکتا لمبی زنجیر والا پرس ہے وہی ہونٹوں پر مٹی مٹی سی لپ اسٹک ہے۔ وہی ہاتھوں میں پکڑی کون آئس کریم ہے، وہی سکھی سہیلیوں کے ساتھ مل کر کبھی ٹیچر کے گھر جانا کبھی کسی دوست کے گھر جانا ہے۔

عید اور اس کی خوشیاں ہمیشہ ایسی ہی رہیں گی، رنگ، خوشبو، خوشیوں، چوڑیوں اور مہندی سے بجی۔

3۔ اسکول کے زمانے میں ایک بار میری کزن پلس دوست نے مجھے ڈائجسٹ دیا اس سے پہلے ہم عمرو عیار اور جادوگرنی اور پریوں والی کہانی پڑھتے تھے۔

خیر ڈائجسٹ میں ڈھونڈ کر ایک چھوٹی سی کہانی پڑھی جو سر کے اوپر سے گزر گئی۔ آہستہ آہستہ کہانیاں سمجھ میں بھی آنے لگیں بس پھر کیا تھا ڈائجسٹ تھا اور ہم۔ تقریباً 25 سال ہو گئے ڈائجسٹ کے ساتھ۔

اس دوران جب 2004ء میں میری شادی ہوئی تو ڈائجسٹ کا ساتھ چھوٹ گیا میری ساس بہت سخت خاتون تھیں، گھر کا ماحول بڑا مذہبی سا تھا میری ساری نندیں ان پڑھ تھیں صرف شوہر اور دیوروں نے پڑھا ہوا تھا خیر میں نے گھر میں نندوں کو ٹیوشن پڑھائی اور آج وہ اس قابل ہیں کہ لکھ پڑھ سکتی ہیں، سسرال میں ساس کے ڈر کی وجہ سے ڈائجسٹ نہیں پڑھ سکتی تھی مگر جب امی کے گھر جاتی تو ڈائجسٹ لے کر بیٹھ جاتی۔ دادی (اس وقت زندہ تھیں اللہ انہیں جنت الفردوس نصیب کرے۔ (آمین) کہتیں۔

''اتنے دنوں بعد آئی ہو اور یہ کتاب لے کر بیٹھ گئی ہو ادھر آؤ۔ کچھ اپنی سناؤ، کچھ ہماری سنو''۔

میں شرمندہ ہو کر ڈائجسٹ رکھ دیتی اور دادی سے باتیں کرنے لگتی، ایک کہانی دو تین مہینوں میں پوری ہوتی تھی۔

شادی کے تین سال بعد ہم سب گاؤں گئے نند کی شادی تھی اس کے بعد میں زبیر کے ساتھ واپس آ گئی۔ باقی سب لوگ گاؤں میں رہ گئے۔ وہ وقت تھا جب میں نے دوبارہ سے ڈائجسٹ منگوا کر پڑھنا شروع کیے اور آج تک یہ تعلق قائم ہے۔

4۔ جی تو جناب صرف اس ایک سوال کے جواب کے لیے میں نے اس سروے میں شرکت کی ہے تو سنیں جناب یہ تب کی بات ہے جب معاویہ تقریباً ایک سال کا تھا۔ زبیر رات کو دس ساڑھے دس بجے گھر کے نچلے پورشن میں بنی بیٹھک میں چلے جاتے تھے اور اپنے دوستوں کے ساتھ رات دیر تک بیٹھے رہتے تھے۔ بچے چھوٹے تھے۔ جلدی سو جاتے تھے۔

میں کاموں سے فارغ ہو کر زبیر کے آنے تک ڈائجسٹ پڑھتی تھی۔ اس رات بھی میں نے بچوں کو سلا کر نماز سے فارغ ہو کر سارے کام ختم کیے سب سے آخر میں معاویہ کی فیڈر ابالنے کے لیے چولہے پر رکھی ڈاکٹر کہتے ہیں فیڈر کو اچھی طرح ابالنا چاہیے تاکہ جراثیم مر جائیں تو جناب برتن میں پانی ڈال کر اس میں فیڈر رکھ کر میں اندر آ گئی۔ خیال یہ تھا تھوڑی دیر بعد جا کر چولہا بند کروں گی ڈائجسٹ لیا اور عمیرہ احمد صاحبہ کی من وسلویٰ کی آخری قسط پڑھنے لگی۔

اس کہانی نے مجھے (پہلی اور آخری بار) دنیا ومافیہا سے بے خبر کر دیا۔ کون سی فیڈر کیسا چولہا سب کچھ بھول گیا یاد رہا تو بس زینی اور کرم۔

خیر زینی مر گئی میں نے اپنے آنسو صاف کیے اور خود کو یقین دلایا کہ زینی واقعی مر چکی ہے اب ذرا ان بچوں کی خبر لوں جو آدھی رات کو گلی میں اور بالکل میرے گھر کے سامنے ٹائر جلا رہے ہیں۔

بڑے غصے میں کمرے سے نکلی تو دیکھا برآمدہ اور کچن دھوئیں سے بھرے ہوئے تھے سامنے اوپن کچن میں چولہے پر رکھا برتن دہائیاں دے رہا تھا، بھاگ کر جا کر چولہا بند کیا برتن کے پیندے سے کوئی پلاسٹک کی چیز چپکی ہوئی تھی جو سب کچھ ہو سکتی تھی مگر فیڈر نہیں۔ میں نے چمٹے کی مدد سے اسے اٹھایا تو وہ پگھلا ہوا پلاسٹک پیندے سے الگ ہو گیا میں نے اس پگھلے ہوئے پلاسٹک کو واپس پھینکا اور جلدی سے بھاگ کر سارے پنکھے چلائے۔

شکر ہے کچن اوپن تھا ورنہ بڑا مسئلہ ہو جاتا خیر زبیر کے آنے سے پہلے سارے ثبوت مٹائے مگر مسئلہ یہ تھا کہ فیڈر جل چکی تھی۔ اب رات کے اس وقت ساری دکانیں بھی بند تھیں اب جب معاویہ رات کو اٹھ کر دودھ کے لیے روئے گا تو میں کیا کروں گی۔ جب معاویہ پیدا ہوا تھا۔ اس وقت اسے جس چھوٹی منی سی فیڈر میں دودھ پلاتی تھی وہ کہیں سے یاد آ گئی۔ اس رات معاویہ کو میں نے اس چھوٹی سی فیڈر میں دودھ پلایا۔ اپنی عقل مندی کی وجہ سے زبیر کی ڈانٹ سے بچ گئی مگر وہ رات میں کبھی نہیں بھول سکتی۔

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

چکن پاپ کارن

ضروری اشیاء:

چکن (سینہ)	دو عدد
ادرک، لہسن	دو کھانے کے چمچے
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
سیاہ مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
لیموں	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
انڈے	دو عدد
میدہ	چھ کھانے کے چمچے
کارن فلیکس	دو کپ
بریڈ کرمبز	آدھا کپ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

چکن بریسٹ کو چوکور ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ ایک پیالے میں چکن کے ٹکڑے، ایک کھانے کا چمچہ، ادرک، لہسن، انڈا، لال مرچ، سیاہ مرچ، لیموں کا رس، میدہ اور نمک ڈال کر ہاتھوں کی مدد سے خوب مکس کر کے پندرہ منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ کارن فلیکس بریڈ کرمبز اور تین کھانے کے چمچے میدہ پیس لیں۔ اس کو ایک پلیٹ میں پھیلا دیں۔ چکن کے ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے اس آمیزے میں لگائیں۔ الٹ پلٹ کر اچھی طرح گرم تیل میں ڈال کر سنہری ہونے تک تل لیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر چلی گارلک ساس کے ساتھ پیش کریں۔

میکرونی سلاد

ضروری اشیاء:

بند گوبھی	آدھا پاؤ
ہری پیاز	آدھا پاؤ
ٹماٹر	ایک عدد
گاجر	ایک عدد
شملہ مرچ	دو عدد
چکن	ایک پیالی
سویا ساس	دو کھانے کے چمچے
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
ہاٹ اینڈ ساور ساس	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
انڈا (ابلا ہوا)	ایک عدد
سیاہ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
میکرونی	دو پیالی

ترکیب:

تمام سبزیوں کو باریک کاٹ لیں۔ ابلی ہوئی چکن اور انڈے کے چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑے کر لیں۔ ابلی ہوئی میکرونی، چکن اور باریک کٹی ہوئی سبزیوں کو ایک پیالے میں مکس کر لیں۔ انڈے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی اسی میں ملا دیں۔ اب اس میں سرکہ، سویا ساس، ہاٹ اینڈ ساور ساس، نمک اور پسی ہوئی سیاہ مرچ ڈال دیں اور اچھی طرح مکس کر لیں۔

چاکلیٹ بسکٹ

ضروری اشیاء:

میدہ	ایک کپ
کوکو پاؤڈر	دو چائے کے چمچے
چینی	آدھا کپ
گھی	آدھا کپ
انڈا	ایک عدد
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:

گھی اور چینی کو دس منٹ تک پھینٹیں اس میں انڈا ڈال کر دس منٹ تک مکس کریں۔ میدہ اور بیکنگ پاؤڈر اور کوکو پاؤڈر کو چھان کر آمیزے میں ڈال کر مکس کریں۔ بسکٹ کٹر سے کاٹ لیں یا مرضی کا شیپ دے لیں اور اوون میں پندرہ سے بیس منٹ بیک کریں۔ (یا کسی کڑاہی یا دیگچی میں اسٹینڈ رکھ کر چولہے پر بنائیں)

☆☆

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

صبیحہ فہیم

میری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں، میں اپنے شوہر سے سات آٹھ برس بڑی ہوں، یہ شادی میرے شوہر کی دوسری جبکہ میری پہلی ہے۔ میرا ایک بچہ پیدا ہو کر مر گیا ہے۔ پہلی بیوی سے میرے شوہر کی ایک بیٹی ہے، جواب سولہ، سترہ سال کی ہو رہی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اب میرے یہاں اولاد ہونا مشکل ہے لیکن میری سوکن ہر دوسرے تیسرے مہینے بہانے بہانے سے آتی ہے کبھی پیسوں کے بہانے، کبھی بیٹی کو باپ سے ملوانے کے بہانے، مجھے لگتا ہے کہ وہ میرے گھر جادو ٹونا کروا کر کچھ پھینک کر جاتی ہے، اکثر مجھے اس کے جانے کے بعد کہیں نہ کہیں سے کوئی ایسی چیز ملتی ہے کہ دنوں میری طبیعت خراب رہتی ہے۔ میں شوہر سے کہتی ہوں تو وہ ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔ وہ ایک فیکٹری میں کام کرتے ہیں۔ ہمارا گزر بسر مشکل سے ہوتا ہے لیکن ان ماں بیٹی کی ہر خواہش کو ہمارے میاں صاحب پورا کرنا فرض سمجھتے ہیں جبکہ پہلے بھی اس عورت نے میرے شوہر سے لڑ جھگڑ کر طلاق لی تھی، اب وہ آتی ہے تو ان کی ہنسی ٹھٹھول چلتی ہے، وہ اس چلتی پرزہ عورت کو نہیں سمجھتے۔ ان کے بعد بھی وہ ایک نکاح کر کے چھوڑ چکی ہے۔ میں کیا کروں، کیا طلاق لے لوں؟ میرے شوہر مذاق مذاق میں کہہ بھی چکے ہیں کہ اگر تم اجازت دو تو اس سے بھی نکاح کر لوں، دونوں کو خوش رکھوں گا، میرا تو دل جل کر رہ جاتا ہے۔ پہلے ہی میری بڑی مشکلوں سے شادی ہوئی تھی اماں بھائیوں نے جیسے گھر سے دھکا دے کر بیاہ کیا تھا میں کیا کروں، بہت الجھن میں ہوں۔

ج: عزیز بہن! آپ پریشان نہ ہوں، ہنسی مذاق کرنا اور بات ہے اور شادی کرنا بالکل الگ بات ہے۔ وہ عورت اس سے پہلے آپ کے شوہر سے طلاق لے چکی ہے جب آپ کے شوہر نے آپ سے شادی نہیں کی تھی۔ اب جبکہ آپ ان کی زندگی میں شامل ہو چکی ہیں۔ اور آپ کا گزر بسر بھی بڑی مشکل سے ہوتا ہے تو وہ آپ کے شوہر کے ساتھ گزارہ کیسے کرے گی اور آپ کے شوہر دونوں بیویوں کا خرچ کیسے برداشت کریں گے۔ اس لیے مشکل ہے کہ آپ کے شوہر دوسری شادی کریں۔

جادو ایک حقیقت سہی لیکن اصل جادو کرنے والا ہزار میں سے ایک بھی مشکل سے ہوتا ہے۔ زیادہ تر یہ لوگ عورتوں کو بے وقوف بنا کر پیسے ٹھگتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جادو ان پر اثر کرتا ہے۔ جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔ اگر آپ اپنا عقیدہ مضبوط رکھیں اور جادو پر یقین نہ کریں تو یہ آپ پر اثر نہیں کرے گا۔ سورہ اخلاص سورہ فلق اور سورۃ الناس ہر نماز کے بعد اور رات کو سونے سے پہلے پڑھ کر خود پر دم کرنا اپنا معمول بنا لیں۔ آپ جادو سے محفوظ رہیں گی۔

آپ اپنے شوہر سے طلاق لے سکتی ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آپ کی شادی پہلے ہی بڑی مشکلوں سے ہوئی ہے۔ آپ اپنے شوہر سے سات آٹھ سال بڑی بھی ہیں۔ ماں بننے کا امکان بھی ختم ہو چکا ہے۔ طلاق لے کر آپ کہاں جائیں گی؟ کیا آپ کے گھر والے، والدہ اور بھائی آپ کا ساتھ دیں گے؟ آپ کے پاس کوئی ذریعہ آمدنی ہے؟

اگر طلاق لے کر متبادل راستہ ہے تو پھر طلاق کے بارے میں سوچیں ورنہ یہیں گزارہ کرنے میں عافیت ہے۔

مسز، ایکس

ہمارے سامنے گھر میں چند مہینے پہلے ہی ایک فیملی آئی ہے۔ ویسے تو ان کرائے داروں میں کوئی خاص بات نہیں ہے

لیکن ان کے گھر کی خواتین بڑی بنی سنوری رہتی ہیں ایسے جیسے کہیں کسی تقریب میں جانے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔

میں نے اپنی ساس سے کہا تو انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا کہ دوسروں کی ٹوہ میں رہنا بری بات ہے۔ ان کے گھر آنے جانے والے لوگ خاص کر مرد عجیب عجیب سے ہوتے ہیں۔ ایک دن میں زبردستی ساس کے روکنے کے باوجود ان کے گھر پہنچ گئی تو ان کی بڑی بہن جو شکل سے ہی کوئی اچھی عورت نہیں لگ رہی تھی، کہنے لگی کہ ہمارا تو بھرا پرا گھر ہے، آنا جانا لگا رہتا ہے۔

میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ ان کی شکایت کردوں۔ کوئی گمنام فون کال بھی تو کی جاسکتی ہے۔ میرے شوہر اٹلی میں رہتے ہیں، میں اپنے بچوں کے ساتھ سسرال میں ہی رہتی ہوں۔

ج: آپ کا خط پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ان کے کردار کے متعلق بنا ثبوت کے آپ نے سارے فیصلے خود ہی کرلیے اور اب بضد ہیں کہ انہیں محلے سے نکلوائیں گی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے کس بنیاد پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ غلط لوگ ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ بنا کسی ٹھوس ثبوت کے کسی پر اتنا بڑا بہتان لگانا بہت بڑا گناہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر وہ غلط ہیں تو آپ کا اس سے کیا لینا دینا ہے؟

آپ اپنے گھر میں آرام سے بیٹھیں۔ ان کے گھر میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس میں آپ کو دخل دینے کا کوئی حق، ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی ساس نے درست کہا، آپ کو دوسروں کی ٹوہ میں نہیں رہنا چاہیے۔ آپ کوئی مثبت مصروفیت ڈھونڈیں یا کوئی مشغلہ تلاش کریں۔ دوسروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔

ل۔ خان

میں اور میرا بھائی جڑواں پیدا ہوئے تھے۔ ہم دونوں ہی شکل و صورت اور رنگت کے حوالے سے خاصے بدقسمت ہیں، ہماری اور بھی بہنیں ہیں لیکن ہم دونوں سب سے چھوٹے ہیں۔

میری سب بہنیں اپنے گھر کی ہیں۔ میری عمر چھبیس برس کی ہو رہی ہے گھر میں صورت حال یہ ہے کہ ہم دونوں کم صورت بہن بھائی میں سے بھائی کو فوقیت دی جاتی ہے کیونکہ وہ اکلوتا ہے۔ بہنیں بھی اس پر صدقے واری جاتی ہیں۔ جب کہ میرے گھر والوں کا رویہ امی کو چھوڑ کر میرے ساتھ بالکل اچھا نہیں ہے۔

حالانکہ میں نے ایم اے کیا ہے اور جاب بھی کر رہی ہوں لیکن کیونکہ بھائی ابو کی دکان سنبھال رہا ہے تو وہ جیسے بہت بڑا کام کر رہا ہے۔ بمشکل انٹر کیا ہے بھائی نے۔

آج کل بھائی کے لیے لڑکیاں پسند کی جارہی ہیں اور میری شادی کا کسی کو خیال تک نہیں۔ بہنیں کہتی ہیں کہ اسے کون پوچھے گا، اس میں تو کوئی گن ہی نہیں۔ مجھے کھانا پکانے اور صفائی ستھرائی میں دلچسپی نہیں ہے، اس کام کے لیے ماسی ہے ناں پھر میں جاب پر جاتی ہوں، امی ہی سارا کھانا پکاتی ہیں لیکن میری بہنوں کے گلے ختم نہیں ہوتے خود تو مزے سے اپنی سسرال پر حکمرانی کر رہی ہیں اور میری جان مصیبت میں ڈال رکھی ہے۔

سب جانتی ہیں کہ میری شادی کی عمر نکلی جارہی ہے۔ میرا کسی کو خیال ہی نہیں۔

ج: عزیز بہن! آپ کو اپنے گھر والوں سے شکوہ ہے لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ کیا آپ کے رشتے آتے ہیں اور گھر والے انکار کر دیتے ہیں؟ ہمارے معاشرے میں رشتہ لڑکے والے ہی دیتے ہیں۔ بھائی کی شادی کے لیے وہ کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کے لیے بھی فکر مند ہوں گے لیکن فکرمندی کا اظہار نہیں کرسکتے۔ چھبیس سال عمر زیادہ نہیں ہے۔ ویسے بھی آج کل بڑی عمر میں شادیاں عام ہیں۔ کم عمری کی شادیاں لڑکیاں خود بھی پسند نہیں کرتیں۔ ☆☆

امت الصبور

بیوٹی بکس

مریم ذوالفقار......خوشاب

س: "کولاجن کیا ہے۔ کیا اس سے رنگ کے گورا یا کالا ہونے کا کوئی تعلق ہے؟ آپ اس کے بارے میں بتادیں؟"

ج: "کولاجن اس پروٹین کو کہتے ہیں جو جلد کو لچک فراہم کرتا ہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ جلد ڈھلنے لگتی ہے تو اس میں موجود قدرتی کولاجن کمزور ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں جلد پر لکیریں یا جھریاں نمودار ہونا شروع ہو جایا کرتی ہیں۔ آپ چاہیں تو جلد میں کولاجن کا اضافہ کر سکتے ہیں۔

وٹامن اے والی پروڈکٹس میں جلد کے خلیات میں کولاجن کی افزائش و نشوونما میں اضافہ کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ جلد کی خراب ہوتی رنگت کو بھی بہتر بناتی ہے۔ وٹامن اے انڈا، مچھلی اور دودھ دہی اور ہرے پتوں والی سبزیوں میں پایا جاتا ہے۔ اسے اپنی خوراک میں ضرور شامل کریں۔ اس سے آپ کی جلد پر بڑھتی عمر کے اثرات نمایاں نہیں ہوں گے۔

رمشا فضل......ایبٹ آباد

س: "میرے بال اچھے ہیں مگر اب دو شاخہ ہونے لگے ہیں میں چاہتی ہوں کہ میرے بالوں کی صحت پہلے جیسی ہو جائے میری عمر ستائیس سال ہے؟"

ج: "سب سے پہلے تو آپ اپنی ڈائٹ کا خیال رکھیں۔ متوازن غذا کھائیں۔

ایک تیل بنانے کا طریقہ دے رہے ہیں آپ لگائیں فائدہ ہوگا۔

ایک کپ سرسوں کے تیل کو گرم کریں۔ اس میں دو کھانے کے چمچے میتھی دانے ڈال کر جلالیں، اس کے بعد تیل کو ٹھنڈا ہونے دیں۔ اس میں آدھا کپ دھنیے کا تیل، آدھا کپ آملے کا تیل، چار کھانے کے چمچے نیم کا تیل، چار کھانے کے چمچے بادام کا تیل اور دو کھانے کے چمچے تارہ میرا کا تیل ملا کر مکس کرلیں اور ایک ڈھکن والی بوتل میں بھر کر رکھ دیں۔"

ہفتہ میں دو دن رات سونے سے پہلے دس منٹ مالش کریں۔ صبح شیمپو کرلیں۔

صفیہ خان کراچی

س: "ایسٹرینجنٹ لوشن کس کام آتا ہے اور اسے کیسے لگاتے ہیں؟"

ج: "یہ محلول کی شکل میں ہوتا ہے یہ بھی جلد کے مسامات کو بند کرنے کا کام کرتا ہے۔ اسے میک اپ سے پہلے لگایا جاتا ہے۔ ابتدائی طور پر اس کے لگانے سے ہلکی سی جلن محسوس ہوتی ہے۔ یہ جلد سے سیاہ دھبوں کا خاتمہ کرتا ہے اور روغنی جلد کے لیے موزوں خیال کیا جاتا ہے اس کو روئی کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔"

سحر ناز......لاہور

س: میں کالج میں پڑھتی ہوں اپنے بالوں کو ڈائی کرنا چاہتی ہوں لیکن امی سخت مخالف ہیں کیمکلز کے استعمال سے کوئی گھریلو نسخہ بتائیں کہ میرے بال خوب صورت لگیں۔

ج: بالوں کو سیدھے طریقے سے رنگنے کا طریقہ بہت آسان اور محفوظ ہے۔ اس سے آپ کے بال گہرے براؤن ہو سکتے ہیں۔

دو کپ پانی میں ایک چمچہ چائے کی پتی اور آدھ چمچہ کلونجی ڈال کر پانی کو اتنا پکائیں کہ پانی سوا کپ رہ جائے۔ پھر ایک کپ سوکھی مہندی میں ایک چمچہ کتھا، ایک چمچہ ناریل یا سرسوں کا تیل، ایک انڈہ اور ہو سکے تو املی کا گودا اچھی طرح مکس کرلیں اور پتی کے پانی کو بھی شامل کر کے تین سے چار گھنٹے رکھنے کے بعد لگائیں اور اتنے ہی وقت جب سر خشک ہو جائے تو سادہ پانی سے دھولیں۔

☆☆